ماہنامہ
حنا
جون 2014

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انشاء نامہ

مکمل ناول

افسانے

☆☆☆

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

کچھ باتیں ہماری

قارئین کرام! حنا کا شمارہ جون 2014ء پیش خدمت ہے۔

پولیو کا مرض ہمارے ملک کے لئے بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ علاقے کے دوسرے ممالک یعنی بھارت اور بنگلہ دیش کو عالمی ادارہ صحت کی جانب سے پولیو سے پاک قرار دیا جا چکا ہے، جبکہ پولیو کے خاتمے کے لئے پاکستان کی کوششوں پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اب کئی ممالک نے پاکستان سے اپنے ملک جانے والے مسافروں کی روانگی کو پولیو کے قطرات پینے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے مشروط کر دیا ہے۔

اگر یہی حال رہا تو مستقبل میں پاکستانیوں کے بیرون ملک سفر پر کئی پابندیاں لگ سکتی ہیں۔ اس حوالے سے حکومت وقت کی نااہلی تشویشناک ہے۔ اگر پولیو کے خاتمے کے لئے بروقت اقدام کر لئے جاتے اور حکومتی رٹ کے تحت ہر بچے کو پولیو کے قطرے پلائے جاتے تو شاید اس وقت پاکستان بھی بھارت اور بنگلہ دیش کی طرح پولیو فری ملک ہوتا۔ اگرچہ اس وقت کافی دیر ہو چکی ہے مگر پھر بھی پولیو کے خاتمے کے لئے جاری مہم کو جنگی بنیادوں پر پایہ تکمیل تک پہنچا کر مطلوبہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وزیراعظم کو چاہیے کہ وہ اس مہم کی ذاتی طور پر نگرانی کریں کہ اگر پاکستان کو جلد ہی پولیو فری ملک نہ بنایا گیا تو ہمارے شہریوں کی دوسرے ممالک کے سفر پہ پابندی لگ سکتی ہے جس سے عالمی سطح پر پاکستان کی بدنامی تو ہوگی ہی ساتھ ہی ملک کی معاشی ترقی کے لئے مقرر کردہ اہداف کا حصول بھی مشکل ہو جائے گا۔ بحیثیت قوم ہمیں اس معاملے میں سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس شمارے میں:۔ شگفتہ شاہ کے شب وروز روبینہ سعید اور رافعہ اعجاز کے مکمل ناول، عالی ناز، مہک فاطمہ اور سندس جبیں کے ناولٹ، قرۃ العین خرم ہاشمی، مصباح نوشین، نسیم سکینہ صدف اور سباس گل کے افسانے، اُم مریم اور سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

حلقہ مہر میں بھی پردہ مہتاب میں بھی
کیا عجب حسن ہے جو گم ہے میرے خواب میں بھی

جب سفینہ کوئی ہوتا ہے رواں اس کی طرف
لہر اٹھتی ہے اچانک مرے اعصاب میں بھی

وہ کہ رکھتا ہی نہیں کوئی خدوخال اپنے
میں نے اوروں میں دیکھا اسے احباب میں بھی

میں خریدار ہوا بھی تو بھلا کس کا ہوا
وہ جو ارزاں میں بھی موجود ہے نایاب میں بھی

رنگ افسردہ کشکول بھی وہ دست بدست
طوق در طوق دمکتا ہے زرناب میں بھی

سننے والوں نے سنا ہے اسے عاصم اکثر
شور منبر میں بھی خاموشی محراب میں بھی

لیاقت علی عاصم

نعت رسول مقبولﷺ

نام در نام مٹی جاتی ہے امت مددے
اے قریشی لقب و ہاشمی نسبت مددے

دھوپ ہے اور بہت بے سرو سامانی ہے
آیہ حق مدد دے، سایہ رحمت مددے

آسمانوں سے مسلسل ہے بلاؤں کا نزول
کوئی نیکی مدد دے، کوئی عبادت مدد دے

چشم و مژگاں بھی دھواں سینہ و دل بھی تاریک
مطلع نور خدا، مہر نبوت مدد دے

اپنے ہی رنگ سے بے عکس ہے چہروں کا ہجوم
مرجع خوش نظراں آئینہ صورت مدد دے

اب کوئی غیر نہیں اپنے مقابل ہم ہیں
اے صف آرائے احد حسن قیادت مدد دے

لیاقت علی عاصم

www.paksociety.com

سید اختر ناز

اللہ کی محبت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس تو بھی اس سے کر، پھر جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمان والے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں کے دلوں میں وہ مقبول ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی سے دشمنی رکھتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں کا دشمن ہوں تو بھی اس کا دشمن ہو تو پھر وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں پھر آسمان والوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے دشمنی رکھتا ہے، تم بھی اس کو دشمن رکھو، وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں میں اس کی دشمنی جم جاتی ہے۔'' (یعنی زمین میں بھی اللہ کے جو نیک بندے یا فرشتے ہیں، وہ اس کے دشمن رہتے ہیں۔) (مسلم)

بھائی چارہ

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''مومن (دوسرے) مومن کے لئے ایسا ہے جیسے عمارت میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے (اسی طرح ایک مومن کو لازم ہے کہ دوسرے مومن کا مددگار رہے۔''

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''مومنوں کی مثال ان کی دوستی، اتحاد اور شفقت میں ایسی ہے جیسے ایک بدن کی، (یعنی سب مومن مل کر ایک قالب کی طرح ہیں) بدن میں سے جب کوئی عضو درد کرتا ہے تو سارا بدن اس (تکلیف) میں شریک ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی اور بخار آ جاتا ہے۔'' (اسی طرح ایک مومن پر آفت آئے خصوصاً وہ آفت جو کافروں کی طرف سے پہنچے تو سب مومنوں کو بے چین ہونا چاہیے اور اس کا علاج کرنا چاہیے۔) (مسلم)

پردہ پوشی کے بیان میں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''جب کسی بندے پر اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ ڈال دیتا ہے تو آخرت میں بھی پردہ ڈالے گا۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''جو کوئی شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کا عیب چھپائے گا۔'' (مسلم)

نرمی کے بارے میں

سیدنا جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے، ''جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔''

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''جب کسی میں نرمی ہو تو اس کی زینت ہو جاتی ہے اور جب نرمی نکل جائے تو عیب ہو جاتا ہے۔'' (مسلم)

تکبر کرنے والے کے بارے میں

سیدنا ابوسعید خدری اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''عزت اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اور بڑائی اس کی چادر ہے (یعنی یہ دونوں اس کی صفتیں ہیں) پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جو کوئی یہ دونوں صفتیں اختیار کرے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،
''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے بات تک نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، نہ ان کی طرف (رحمت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کو دکھ کا عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زنا کرنے والا، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے مغرور محتاج۔'' (مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھانے والے کے متعلق

سیدنا جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا۔
''ایک شخص بولا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔''
''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کون ہے جو قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کو نہ بخشوں گا، میں نے اس کو بخش دیا اور اس کے (جس نے قسم کھائی تھی) سارے اعمال لغو (بیکار) کر دیئے۔'' (مسلم)

برے شخص کا بیان

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''اس کو اجازت دو یہ اپنے کنبے میں ایک برا شخص ہے۔''
جب وہ اندر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نرمی سے باتیں کیں تو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔
''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس کو ایسا فرمایا تھا پھر اس سے نرمی سے باتیں کیں۔''
تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''اے عائشہ! برا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت میں، وہ ہوگا جس کو لوگ اس کی بدگمانی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔'' (مسلم شریف)

درگزر کرنے کے بیان میں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''صدقہ دینے سے کوئی مال نہیں گھٹتا اور جو بندہ معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔'' (مسلم)

غصہ کے وقت پناہ مانگنے کا بیان

سیدنا سلیمان بن صرد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گالی گلوچ کی، ایک کی آنکھیں لال ہو گئیں اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مجھے ایک کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے، وہ کلمہ یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔'' (مسلم شریف)

راستہ صاف کرنے کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک شخص نے راہ میں کانٹوں کی ڈالی دیکھی تو کہا کہ اللہ کی قسم میں اس کو مسلمانوں کے آنے جانے کی راہ سے ہٹا دوں گا تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کیا۔''

سیدنا ابوبرزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ ''یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی ایسی بات بتلایئے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

''مسلمانوں کی راہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دے۔''

مومن کی مصیبت کا بیان

اسود کہتے ہیں کہ قریش کے چند جوان لوگ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور وہ منیٰ میں تھیں وہ لوگ ہنس رہے تھے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔

''تم کیوں ہنستے ہو؟''

انہوں نے کہا کہ ''فلاں شخص خیمہ کی طناب پر گرا اور اس کی گردن یا آنکھ جاتے جاتے بچی۔''

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا ''مت ہنسو اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسلمان کو ایک کانٹا لگے یا اس سے زیادہ کوئی دکھ پہنچے تو اس کے لئے ایک درجہ بڑھے گا اور ایک گناہ اس کا مٹ جائے گا۔'' (مسلم شریف)

مومن کی تکلیف

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

''مومن کو جب کوئی تکلیف یا ایذا یا بیماری یا رنج ہو یہاں تک کہ فکر جو اس کو ہوتی ہے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ۔

''وکوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا۔ تو مسلمانوں پر بہت سخت گزرا (کہ ہر گناہ کے بدلے ضرور عذاب ہوگا۔'')

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

''میانہ روی اختیار کرو اور ٹھیک راستہ کو ڈھونڈو اور مسلمان کو (پیش آنے والی) ہر ایک مصیبت (اس کے لئے) گناہوں کا کفارہ ہے، یہاں تک کہ ٹھوکر اور کانٹا بھی۔'' (لگے تو بہت سے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں ہو جائے گا اور امید ہے کہ آخرت میں مواخذہ نہ ہو) (مسلم شریف)

دوسرے مسلمان سے برتاؤ

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک دوسرے سے بغض مت رکھو اور

ایک دوسرے سے حسد مت رکھو اور ایک دوسرے سے دشمنی مت رکھو اور اللہ کے بندو بھائیوں کی طرح رہو اور کسی مسلمان کو حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک (بغض کی وجہ سے) بولنا چھوڑ دے۔'' (مسلم شریف)

سلام میں پہل

سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''کسی مسلمان کو یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تک (بولنا) چھوڑ دے، اس طرح کہ وہ دونوں ملیں اور ایک اپنا منہ ادھر اور دوسرا اپنا منہ ادھر پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہوگا جو سلام میں پہل کرے گا۔''

کینہ رکھنا اور آپس میں قطع کلامی

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں، پھر ہر ایک بندے کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا لیکن وہ شخص جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو دیکھتے رہو جب تک کہ صلح کر لیں۔'' (جب صلح کر لیں گے تو ان کی مغفرت ہو گی)۔

بدگمانی سے بچنے کا حکم

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے اور کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ اور جاسوسی نہ کرو اور (دنیا میں) رشک مت کرو (لیکن دین میں درست ہے) اور حسد نہ کرو اور بغض مت رکھو اور دشمنی مت کرو اور اللہ کے بندے اور (آپس میں) بھائی بھائی بن جاؤ۔'' (مسلم)

گلہ کرنے کی ممانعت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟''

لوگوں نے کہا۔

''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوب جانتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح پر کرے کہ (اگر وہ سامنے ہو تو) اس کو ناگوار گزرے۔''

لوگوں نے کہا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر ہمارے بھائی میں وہ عیب موجود ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جب ہی تو یہ غیبت ہوگی نہ تو بہتان ہے۔'' (مسلم شریف)۔

چغل خوری کی ممانعت

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''کیا میں تمہیں یہ نہ بتلاؤں کہ بہتان فیچ کیا چیز ہے؟ وہ چغلی ہے جو لوگوں میں عداوت ڈالے'' اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک سچا لکھا جاتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' (مسلم

شریف)۔

چغل خور آدمی جنت میں نہ جائے گا

ہمام بن حارث کہتے ہیں کہ ہم سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا تو لوگوں نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔

''بادشاہ تک بات پہنچاتا ہے۔'' سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو سنانے کی نیت سے کہا کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ چغل خور جنت میں نہ جائے گا۔'' (مسلم شریف)

سچ اور جھوٹ کے بارے میں

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تم سچ کو لازم کر لو کیونکہ سچ نیکی کی طرف راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچا لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ برائی کی طرف راہ دکھاتا ہے اور برائی جہنم کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' (مسلم شریف)

جہاں جھوٹ بولنا جائز ہے اس کا بیان

سیدہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور وہ مہاجرات اول میں سے تھیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے۔

''جھوٹا وہ نہیں جو لوگوں میں صلح کرا دے اور بہتر بات کہے یا لگائے۔'' ابن شہاب نے کہا۔

''میں نے نہیں سنا کہ کسی جھوٹ میں رخصت دی گئی ہو مگر تین موقعوں پر ایک تو لڑائی میں، دوسرے لوگوں میں صلح کرانے کے لئے، تیسرے خاوند کو بیوی سے اور بیوی کو خاوند سے، (مذاق اور خوش طبعی میں عورت مرد سے اور مرد عورت سے جھوٹ بول سکتا ہے) (مسلم شریف)

گالی دینے کی ممانعت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''دو شخص جب گالی گلوچ کریں تو دونوں کا گناہ اسی پر ہوگا جو ابتدا کرے گا جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔''

زمانہ کو گالی دینے کی ممانعت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ عزوجل فرماتا ہے ''مجھے آدمی تکلیف دیتا ہے کہتا ہے کہ ہائے کمبختی زمانے کی تو کوئی تم میں سے یوں نہ کہے کہ ہائے کمبختی، زمانے کی، اس لئے کہ زمانہ میں ہوں، دن اور رات میں لاتا ہوں جب میں چاہوں گا تو رات اور دن ختم کر دوں گا۔'' (جب رات دن کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو رات اور دن کو یعنی زمانہ کو گالیاں دینا دراصل اللہ کو گالی دینا ہوگا) (مسلم شریف)

شاعری کی قدر نہیں

ابن انشا

ایک اخبار کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی پوتی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں، ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھتیجے بابر میاں سے آزردہ تھے جس کا رویہ ہماری نظم ونثر کے بارے میں کچھ اسی قسم کا ہے، ہم نے اس عزیز مکرم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں، افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا، علم عروض اور زمافات کے نکات سمجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دور رس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا، لیکن اس نے ہمیشہ جماہی لے کر ٹالا اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا، حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں، اگلے ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔

لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ عزیز مذکور کو ادب عالیہ اور دقیق معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں، نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفتگی کا اظہار کرتا، ایسے نکتہ چینوں سے کسی کو پناہ نہیں، کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ نعت ہائے حجازی سے زبان کو اتنا گراں مایہ نہ بناتے اور سیدھے زبان میں شعر کہتے اور اک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے تو آج آپ کی پوتی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستار لے بیٹھتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستار بجانا کوئی بری بات نہیں ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع وخشوع سے بیٹھ کر پوتی کا الاپ سنتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لائق بھتیجا ڈنڈے سے مزے کا ٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم

موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی واہ واہ کرتے ہیں اور جب میچ ہوتے ہیں تو اتنے لوگ اسپورٹس دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو بھی نصیب نہیں ہو سکتے، اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے، لیکن لوگوں کا کیا ہے، وہ تو بیر کو بھی پھل نہیں گنتے۔

ان مثالوں سے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فضلاء کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیوں بنتے ہیں اور بڑے بڑے نغز گو شعرا یعنی تلامیذ الرحمن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابن، کٹ پیس بیچتے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون در کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل لکھی رکھی ہے، لیکن کوئی مشاعرہ ہونے کی خبر نہیں تو وہ گھر سے خیرات شرو کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں، بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے، علم کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا متحمل ہو سکے، ہمارے ایک بزرگ دیوانہ ناگپوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داد طلب کیا کرتے تھے، وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا، دیوانہ صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے چکے ہیں کہ "عزیزم واپس آ جاؤ، اب تمہیں کوئی غزل نہ سنائی جائے گی۔" لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اس کا راز حال میں کھلا، صاحبزادے کراچی کے ایک مشہور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابا میاں کی غزل نہ چھپی ہو۔

ہماری نثر تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے، لیکن اگر ادارہ حنا ہماری غزلیں چھاپنے سے صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے، یہ قدر ناشناسی حنا والوں تک محدود نہیں، کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا، اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکنا بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔

ہمیں اس صورت حال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا، لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو، ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے سب ہی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے، بیجنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات بھی تھیں، ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی، کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی، تھوتھا سا منہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے، عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی، اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی، اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا، غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے، لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر لی کہ اب کچھ یاد نہیں، کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا، البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔

"غزلیں جو آپ نے پڑھیں، کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں، آپ شاعر ہیں کیا؟"

ہمارا خیال ہے ہم کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا شکیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے، بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سنانے پڑتے۔ ☆☆☆

فوزیہ شفیق صاحبہ نے حسب سابق بڑے اپنائیت والے انداز میں مجھ سے اس سلسلے میں لکھنے کے لئے کہا اور آج جب میں اس کے لئے لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ آپ مجھے کتنا جانتی ہیں کہ میرے دن کے گزرنے کی روداد پڑھنا چاہیں گی کیونکہ مجھے حنا کی محفل میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جبکہ باقی رائٹرز تو عرصے سے آپ کے لئے جانی پہچانی ہیں، تو سوچ رہی ہوں کہ پہلے اپنا مختصر سا تعارف آپ سے کرواؤں۔

میرا پورا نام سیدہ شگفتہ شاہ ہے، میں سندھی میں کئی سالوں سے لکھ رہی ہوں اور یقیناً میری تحریروں سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں نئی لکھنے والی نہیں ہوں البتہ اردو میں اور خاص طور پر "حنا" میں لانے کا سہرا سدرۃ المنتہیٰ کو جاتا ہے اور فوزیہ جی سے واسطہ پڑا تو لگا ہی نہیں کہ وہ میرے لئے اجنبی ہیں، اس قدر اپنائیت ہے ان میں، سندھی میں میرا ایک ناول چھپا ہے اور کچھ ناولٹ بھی لکھے ہیں، افسانوں کا مجموعہ اور شاعری کا مجموعہ بھی زیر طباعت ہیں۔

بنیادی طور پر میں مصورہ ہوں اور سندھ میں مصوری کے حوالے سے ایک مقام رکھتی ہوں گو کہ بڑی آرٹسٹ نہیں مگر تین سولو اور بارہ گروپ نمائشیں کروا چکی ہوں، کسی زمانے میں ریڈیو حیدر آباد سے وابستہ رہی اور تین سال تک کامیاب لائیو شو کیے اور ڈرامے اور فیچر لکھے۔

پروفیشن کے لحاظ سے میں استاد ہوں اور پبلک اسکول حیدر آباد کے گرلز سیکشن میں سندھی شعبے اور آرٹس اینڈ کرافٹس کی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ہوں اور لائبریری کی انچارج آفیسر ہونے کے علاوہ کئی اہم زمہ داریاں نبھاتی ہوں اور پچھلے سال اسکول کے میگزین کی ایڈیٹر ان چیف بھی رہی۔

لیں جی تعارف تو ہو گیا، اب جہاں تک دن کے روٹین کی بات ہے تو میں دنوں کو تین حصوں میں تقسیم کروں گی، جاب کرنے والی خواتین کے ورکنگ ڈیز اور آف ڈے کے روٹین مختلف ہوتے ہیں اور ٹیچنگ کے شعبے میں کام کرنے والی خواتین Vacations کے فائدے میں رہتی ہیں اس لئے اس دوران کا شیڈول بھی ذرا مختلف ہوتا ہے، کم از کم میرے لئے۔

میں ایک میچور خاتون ہوں مگر شادی شدہ نہیں، گھر کا سسٹم کچھ یوں ہے کہ نچلی منزل میں سب سے چھوٹی بھابھی رہتی ہے اور دوسری منزل پر منجھلی بھابھی ہوتی ہیں، جب کہ بالکل ساتھ والے گھر میں بڑی بھابھی اس طرح سے ہم سب الگ پورشن میں ہوتے ہوئے بھی ساتھ ہی ہوتے ہیں، مجھ سے بڑی دو بہنیں اور ایک چھوٹی بہن شادی شدہ ہیں اور میں بھابھیوں کی ساتھ میں رہنے والی اکلوتی نند ہوں اس لئے انہوں نے مجھے گھر کے کام کاج سے آزاد رکھا ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ میری جاب بہت ٹف ہے اور اکثر گھر آ کر بھی اسکول کا ہی کام کرنا پڑتا ہے۔

میں صبح فجر کے وقت اٹھتی ہوں اور سب سے پہلے فجر کی نماز ادا کرتی ہوں، میرا بیڈ روم دوسری منزل پر ہے، وہاں سے اتر کر نیچے کچن میں آتی ہوں، سارے گھر میں خاموشی ہوتی ہے اس وقت اور سب سو رہے ہوتے ہیں، ہمارا پرانا خاندانی ملازم، جس نے ہمیں گودوں میں کھلایا ہے، وہ بھی فجر کے ٹائم اٹھتا ہے اور جب میں کچن میں آتی ہوں تو چائے تیار ملتی ہے، میں اپنے لئے ناشتہ بناتی ہوں جو اکثر انڈے کا آملیٹ ہوتا ہے پھر چائے نکال کر ڈائننگ روم میں بیٹھ کر ناشتہ کرتی ہوں پھر اسکول جانے کی تیاری میں لگ جاتی ہوں۔

اسکول پہنچ کر جیسے اپنا آپ بھول جاتی ہوں، کالج سائیڈ پر بھی کلاسز ہوتی ہیں اور اسکول سائیڈ پر بھی، اور جیسا کہ اوپر بتا چکی ہوں کہ اس قدر زمہ داریاں اور کام ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا البتہ چھٹی کے وقت تھکن سے برا حال ہوتا ہے۔

واپسی پر بھتیجیوں کو ایک بڑے پرائیویٹ اسکول سے پک کرنا ہوتا ہے سو کبھی ٹریفک جام میں پھنس کر اس قدر دیر ہو جاتی ہے کہ گھر پہنچتے پہنچتے ڈھائی سے تین بج جاتے ہیں، مجھے بھی شاپنگ یا اور کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو واپسی کے ٹائم ہی کرتی جاتی ہوں۔

گھر آ کر چینج کر کے پہلے نماز پڑھتی ہوں پھر بھابھیوں کی طرف سے آئے ہوئے پکوانوں سے لنچ کرتی ہوں، اخبار کھانے کے بعد ضروری ہے، گو لائبریری کی انچارج آفیسر ہوں اور وہاں انگریزی، اردو اور سندھی اخبارات آتے ہیں مگر ایسے نصیب کہاں کہ اخبار یا کتابوں کا مطالعہ وہاں ہو سکے کہ اتنی فرصت ہی نہیں ملتی سو گھر آ کر اخبار ضرور پڑھتی ہوں، دن کو سونا میرے لئے لازمی ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں اور کلاس کھڑے کھڑے لینے سے جسمانی طور پر بھی۔

شام کو فریش ہو کر اٹھتی ہوں، چائے اور نماز سے فارغ ہو کر دوسرے دن کے لئے کپڑے پریس کرنے کے لئے نچلی منزل پر اپنے دوسرے کمرے میں جاتی ہوں جو میرا اسٹڈی روم بھی ہے جہاں دو الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی اور ایک آرٹ کی چیزوں اور تصویروں سے بھری ہوتی ہے، وہاں میں سال میں کبھی کبھار انگلش اور آرٹ کی کلاسز بھی لیتی ہوں۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، کہ مجھ پر اتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ گھر پر بھی کام اسکول کا ہی ہوتا ہے، کبھی منتھلی ٹیسٹ کے پیپرز کی چیکنگ تو کبھی لیکچرز کی تیاری، اسی طرح رات دیر ہو جاتی ہے، پھر اوپر آ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈنر بھی کرتی ہوں اپنے روم میں۔

اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ ٹی وی پر کوئی پوری فلم وغیرہ دیکھی جائے لہٰذا اکثر ادھوری موویز ہی دیکھتی ہوں وہ بھی زیادہ تر انگریزی، اسی روٹین میں سے کچھ ٹائم لکھنے کے لئے بھی نکالتی رہتی ہوں مگر ناولٹ اور آرٹ کا کام ویکیشن کے لئے سنبھالے رکھتی ہوں کہ ان کے لئے ذہنی یکسوئی چاہیے اور زیادہ ٹائم بھی۔

ویک اینڈ پر فیس بک پر اپنی تحریروں والا پیج اور دوسرا آرٹ کا پیج اپ ڈیٹ کرتی ہوں باقی عام دنوں میں بھی نیٹ پر پیج میں رہتی ہوں۔

سنڈے عام دنوں سے مختلف ہوتا ہے اور اس میں سب سے بڑا چارم ایک ہی ہے کہ صبح اپنی نیند پوری کر کے اٹھتی ہوں اور حسب روایت اپنا ناشتہ خود بناتی ہوں اور ناشتے کے ساتھ اور بعد بھی اخبار ضرور پڑھتی ہوں، پھر اتنا ڈھیر سارا

کام میرا منتظر ہوتا ہے، گھر میں ایک پرانا ملازم، کام کر کے چلی جانے والی میڈ اور ایک ڈرائیور کم ملازم لڑکا ہے جو ہمارے اپنے گاؤں کا ہے اور بچپن سے ہمارے گھر میں ہی پلا بڑا ہے، سارے کام کے لئے ہوتے ہیں مگر اپنا ذاتی کام میں خود کرتی ہوں، جاب کی وجہ سے اپنے کمروں کی صفائی میں نہیں کرتی ملازمہ کرتی ہے جو کہ ظاہر ہے کہ جان چھڑانے والا ہوتا ہے اس لئے سنڈے کو خود نگرانی کرتی ہوں اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوتی تو خود ہی جالے صاف کرنے یا صفائی کرنے لگ جاتی ہوں، پھر کپڑے دھوتی ہوں اپنے پھر وہی اسکول کا کوئی کام یا لکھنے کا یوں دن آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتا ہے۔

ویکیشن میں مجھے لگتا ہے کہ میں جیسے اپنے آپ میں آ جاتی ہوں، پھر جاب کی ہر بات کو بھول کر میں صرف مصورہ اور رائٹر بن جاتی ہوں، چلتے پھرتے عام دنوں میں مصوری اور لکھنے کے پتا نہیں کتنے آئیڈیاز ذہن میں آتے ہیں جو محفوظ ہوتے ہیں، وہ سب ویکشن میں ہی ہو پاتے ہیں، کتابیں پڑھنے کا ٹائم بھی اسی دوران ہی ملتا ہے، ویکشن سے ایک دن پہلے اسکول کی بڑی لائبریری سے اردو، انگریزی اور سندھی کے ناول، افسانوں کے مجموعے یا آپ بیتیاں اشو کروا کر لاتی ہوں اور ویکشن کے دوران پڑھتی ہوں، اسی دوران رات کو دیر تک جاگ کر (زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ تک، میرے لئے یہی دیر ہوتی ہے) اچھی موویز ان دنوں پوری دیکھتی ہوں۔

آپ سوچتی ہوں گی کہ کہیں بھی کچن سنبھالنے اور گھرداری کا ذکر نہیں آیا تو بتاتی چلوں کہ میں نے انٹر کے فوراً بعد ہی جاب کر لی تھی ایک پرائیویٹ اسکول میں ساتھ میں تعلیم بھی جاری رکھی اور گھرداری بھی۔

میں نے جاب کے ساتھ بی اے، ایم اے، بی ایڈ اور ایم ایڈ کیا، پھر پاکستان امریکن سینٹر سے چھ ماہ کا ڈپلومہ کورس کیا تب مجھے پبلک اسکول میں جاب مل گئی، میں تب تک گھر کا کام اور کچن سنبھالتی تھی کہ بہنوں کی شادی ہو گئی تھی مگر بعد میں بھابھیوں نے خود گھر کو سنبھالا کہ سب کی سب ہاؤس میکرز ہیں کوئی بھی جاب نہیں کرتی اس لئے وہ مجھے ہر طرح کا آرام دیتی ہیں، یوں آہستہ آہستہ میری عادت بھی ختم ہوتی گئی اور گھرداری کا شوق بھی کہ میں جاب کی زمیداریوں میں بہت مصروف رہتی ہوں۔

جن کی وجہ سے M.Phil بھی مکمل نہ کر سکی، میگزین کے لئے پروف ریڈنگ ہو یا بچوں کے آرٹ کے کام کی نمائش کا کام، مجھے پورا دن اسکول میں لگ جاتا ہے اور مغرب تک وہیں رہنا پڑتا ہے پھر اگر Parent-teacher meeting ہو یا سالانہ open day یا کوئی اور آفیشل پروگرام، ہم ٹیچرز کو دوبارہ شام کو بھی جانا پڑتا ہے اور ہاں بورڈنگ ہاؤس میں بھی ہماری شام کو Prep-duties ہوتی ہیں، بس یوں سمجھ لیں کہ روٹین میں کسی روبوٹ کی طرح ہی کام کرنا پڑتا ہے اور اپنے Creative کام کے لئے ترستی ہی رہتی ہوں پھر بھی اندر کا فنکار اور رائٹر جاگتا ہی رہتا ہے، لیجئے یہ ہے میرے شب و روز کی روداد آپ کو میں نے بور تو نہیں کیا؟ اجازت لوں اب؟ خدا حافظ۔

☆☆☆

◇◇◇ اُم مریم ◇◇◇

بتیسویں قسط کا خلاصہ

تیمور صاحب کو نا چاہتے ہوئے بھی حویلی تو لے آتا ہے مگر اس کا رویہ اپنی بیٹی اور زینب کے ساتھ مزید ہتک آمیز اور شدید ہو چکا ہے، وہ اپنی سابقہ منگیتر سے بیٹے کی خواہش میں شادی کرتا ہے تو زینب گم صم ہو کر رہ جاتی ہے، مگر اصل افتاد اس پہ اس وقت ٹوٹتی ہے جب نشے میں تیمور زینب کو طلاق دیتا ہے۔

پرنیاں کو معاذ ناراضگی کے اظہار کے طور پہ اس کی حویلی چھوڑ آیا ہے مگر پھر مما کی زبردست ڈانٹ کے بعد واپس بھی لانا پڑتا ہے۔

زینب کی طلاق کے باعث شاہ ہاؤس کے مکین شدید صدمے سے دوچار ہیں، ایسے میں تیمور اپنی بد فطرت کو ظاہر کرتے ہوئے یہ ٹینشن مزید بڑھاتا ہے اور زینب سے ملنے کی کوشش کر کے معاملے کو گمبھیر تر بنا دیتا ہے، ایسے میں پپا جان حالات کی نزاکت کے پیش نظر اک فیصلہ کرتے ہیں، جہان سے زینب کے نکاح کا فیصلہ۔

جہان ژالے کی بیماری کے متعلق جان کر خود کو فضا میں معلق محسوس کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیتیسویں قسط

ژالے سراسیمہ سی اسے دیکھتی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''چائے لائی ہوں آپ کے لئے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پا کر جیسے وہاں سے راہ فرار ڈھونڈلی تھی، جہان نے ایکدم سے اس کی کلائی تھام کر اپنے مقابل کرلیا۔

''تم کہہ دو ژالے ابھی جو تم نے کہا وہ جھوٹ تھا، سراسر جھوٹ۔'' اس کی آواز میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی ایک وحشت سی سمٹ آئی تھی، کتنا پریشان نظر آرہا تھا وہ، ژالے اسے دیکھے گئی، ایک عجب سی ٹھنڈک انوکھا سکون اس کے اندر اتر گیا۔

''وہ سب جھوٹ تھا شاہ! سراسر جھوٹ۔'' اس کے چوڑے سینے سے سر ٹکتے ہوئے وہ سرگوشی سے مشابہہ آواز میں بولی تو جہان نے بے اختیار اسے بانہوں میں بھرلیا تھا۔

''مجھ سے جھوٹ مت بولو ژالے پلیز۔'' وہ جیسے رو پڑا تھا، زندگی کے اس مقام پہ آکر کیسا عجب انکشاف ہوا تھا، وہ اسے کھودینے کے خیال سے ہی پاگل ہونے لگا تھا۔

''کینسر لاعلاج مرض تو نہیں ہے نا شاہ۔'' ژالے نے بہت محبت سے کہتے اس کے سینے سے سر اٹھایا اور اس کے بالوں کو سہلا کر گویا اسے تسلی دینا چاہی جہان اسے دکھ سے بھری خوف سے چھلکتی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا، پھر کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لے آیا تھا، از سرے نو سارے ٹیسٹ مرض کی تشخیص، ژالے تھک سی گئی۔

''میرے پاس وقت بہت کم ہے شاہ!'' اس نے بالآخر اس کے سامنے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر لیا، جہان کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔

''تم نے چھپایا کیوں مجھ سے؟'' جہان کو اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی تمام بدسلوکی کے احساس نے بے چینی اور بے قراری میں مبتلا کیا تھا۔

''میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی شاہ۔'' اس کے رسان سے کہنے پہ جہان کے اندر اذیت کا احساس گہرا ہوگیا۔

''اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟'' اس کے سوال نے ژالے کے ہونٹوں پر تھکی ماندی مسکان سجادی تھی۔

''یہ سوال نہ کریں پلیز شاہ۔''

''کیوں؟'' جہان کی نگاہوں میں ہزاروں سوال مچل اٹھے تھے۔

''میرے پاس الفاظ نہیں کہ بتا سکوں مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔'' اس کے جواب نے جہان کو گنگ کردیا تھا، اس نے جانے کس جذبے کے تحت ژالے کو اپنے بازؤں میں بھر کے بھینچ لیا۔

(میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا ژالے، میں نے آج تک اپنے لئے اپنے اللہ سے کچھ نہیں مانگ، زینب کو بھی نہیں اس کے باوجود کہ وہ میری شدید خواہش تھی، اس دعا کے راستے میں حائل اس کی مرضی ہوگئی تھی جو میں نہیں تھا، مگر میں اب تمہیں اپنے لئے اللہ سے مانگوں گا، تمہیں کچھ نہیں ہوگا ژالے اس کے باوجود کہ تمہاری بیماری آخری اسٹیج پہ ہے مگر میں اس سے مانگوں گا جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔)

☆☆☆

وہ رات گئے لوٹا تو بہت تھکا ہوا تھا، اسے ہرگز امید نہیں تھی کوئی اس کے انتظار میں جاگ بھی رہا ہو

گا، آج اس کی شوٹنگ لیٹ نائٹ تک جاری رہی تھی، وہ کبھی بھی رات کو شوٹ کرانے کے قائل نہیں تھا، مگر آج مجبوری تھی، ایک تو سین ہی رات کے تھے، دوسرا لاسٹ ایپی سوڈ تھا سیریل کا اس کے ایک ہفتہ بعد آن آئیر ہو جانا تھا، پچھلے کئی مہینوں سے وہ اسی کام کے سلسلے میں مصروف تھا اور وہ رانیہ اس کی ہیروین ہی تھی جس کے ساتھ اس روز پرنیاں نے ہوٹل میں اسے دیکھا تھا، بیچاری پلے میں ہی نہیں سچ مچ بھی اس پہ فدا ہوگئی تھی، جتنی حسین تھی اس سے بڑھ کر چھچھوری، معاذ ایک پلے کرکے ہی اس کام سے اکتا گیا تھا، حالانکہ جب اسے یہ آفر ہوئی تو وہ بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھا مگر پھر پرنیاں کو جلانے کے لئے اس نے یہ آفر قبول کرلی تھی، پرنیاں جو اپنی تمام تر بے اعتنائی ہٹ دھرمی اور تیکھے ترشے پرنخوت انداز واطوار کے ساتھ اس کے دل پہ حکمرانی کرتی تھی، کتنا چاہا تھا وہ بھی اس کی طرح سے اسے اگنور کردے غافل ہو جائے اس سے مگر یہ جو دل تھا ہمیشہ آڑے آجاتا تھا، یہ اس کی توجہ اور محبت کی ہی طلب کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس کو زچ کرنے کو ہر وہ حربہ استعمال کرچکا تھا جس سے وہ پگھل جائے اس کی طرف جھک آئے مگر وہ بہت ضدی تھی، یا شاید ضدی نہیں تھی، بس اسے معاذ سے محبت نہیں تھی، یہ خیال اتنا زور آور تھا اتنا پختہ کہ وہ ٹوٹ کر بکھرتا چلا گیا، اس نے ہر ہر زاویے سے پرنیاں کو پرکھا تھا، شاید وہ اس کے سامنے اعتراف کرلیتی مگر اسے ہر طرح سے شکست کا سامنا کرنا پڑا، وہ صرف ایک بار اس کی سمت جھکی تھی ایک بار رجوع کیا تھا وہ بھی مما کے کہنے پہ، اس نے جانا تو اس کے اندر آگ سلگ اٹھی، اسے یہ کمپرومائز نہیں چاہیے تھا، وہ اتنا گیا گزرا تھا کہ وہ اس کے ساتھ سمجھوتے کی بنا پہ زندگی گزارتی، پھر جہاں لڑائی ہوتی وہاں وہ پھر سے بار بار اس کی سمت متوجہ ہوتا رہا تو اس خوش فہمی میں کہ شاید پرنیاں کو اس سے محبت ہو جائے، مگر وہ گوشت پوست سے بنی بے حد حسین لڑکی تو کوئی پتھر تھی، سنگلاخ چٹان جس سے سر ٹکراتا وہ خود پاش پاش ہو رہا تھا، جبھی اس نے یہ کوشش ترک کی اور اسے پاش پاش کرنے کو اس پر ضربیں لگانا شروع کردیں مگر وہ پتہ نہیں کس مٹی سے بنی تھی، اثر ہی نہ ہوتا، معاذ جیسے ہار گیا تھا تو خود ٹوٹ گیا، اس پہ مما کا اس دن کا انتہائی شدید ردعمل، ایک لمحے کو تو اس کا جی چاہا تھا اس شدید ذلت کے بعد خودکشی کرکے، پرنیاں نے اس سے مما کو چھین کر اس کا دوسرا بڑا نقصان کیا تھا، وہ کہاں تک برداشت کرتا، مگر پھر اس نے خود کو کمپوزڈ کرلیا تھا، اب وہ میچور مرد تھا، وہ جذباتی سا نوعمر لڑکا نہیں تھا کہ ان باتوں پہ ڈس ہارٹ ہو کر ایسے قدم اٹھالیتا، جبھی اس نے گھر چھوڑ جانے کی شدید سوچ کو بھی جھٹک دیا البتہ وہ پہلے کی طرح ہنس بول کر بات نہیں کرسکا تھا، اس کے اندر عجیب سے سناٹے اتر آئے تھے، مما کوشش کرتی تھیں پرنیاں سے اس کا سامنا کم سے کم ہو شاید یہ پرنیاں کی اپنی بھی خواہش تھی، معاذ کو اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا، اس نے محسوس کرنا چھوڑ دیا کہ پرنیاں اس کی موجودگی میں کمرے میں آتی ہے یا نہیں، اسی وقت بھی وہ گاڑی پورٹیکو میں روک کے سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی حصے کی جانب آیا تو شاہ ہاؤس کے در و دیوار پہ سناٹا طاری تھا، وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھتا مما کی آواز پہ بے ساختہ ٹھٹک کر تھم گیا تھا۔

''معاذ! بیٹے اتنی دیر کیوں کردی آنے میں آپ نے؟'' مما اسے ساکن کھڑے دیکھ کر خود اس کے قریب آگئی تھیں، لہجے کی نرمی وحلاوت میں شرمندگی کے ساتھ ازالے کے احساس کا رنگ بھی غالب تھا۔

''کام تھا مجھے۔'' وہ انہیں دیکھے بغیر آہستگی سے بولا تھا۔

”جلدی آجایا کرو بیٹا، شہر کے حالات کا تو آپ کو پتہ ہی ہے۔“

”میں تو خود خواہش مند ہوں کسی روز کسی ایسے حادثے کا شکار ہو جاؤں جن سے اخبار بھرے ہوتے ہیں۔“ وہ ہرگز ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا، جو مما کو جھنجھوڑنے کا باعث بنتی مگر زبان سے پھسل گئی تھی شاید وہ اتنی ہی زرد رنج ہو رہا تھا۔

”معاذ......!“ مما منہ پہ ہاتھ رکھ کر یوں نیچے بیٹھ گئیں جیسے یکلخت کھڑے ہونے کی ہمت نے جواب دے دیا ہو، معاذ نے گردن موڑ کر انہیں روتے ہوئے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔

”ان تمام آنسوؤں کو کسی ایسے ہی وقت کے لئے بچا کر رکھ لیں مما!“ وہ سفا کی کی انتہا کو چھونے لگا، مما کی سسکیاں تیز ہچکیوں میں ڈھلیں اگلے لمحے وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھیں۔

”خدا ایسا وقت دکھانے سے پہلے مجھے موت دے دے، اگر آپ کو ماں کو دکھ دینا ہے تو اس کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں بیٹے۔“ وہ یونہی بلکتے ہوئے بولی تھیں، معاذ کے چہرے پہ زہر خند پھیلا۔

”وہ طریقہ جو آپ نے مجھے دکھ دینے کو اختیار کیا؟ وہ آپ کو اپنے بیٹے سے عزیز ہو گئی ہے؟“ وہ دبے ہوئے لہجے میں چیخا، مما نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا اور بے تحاشا چومتے ہوئے بولی تھیں۔

”مجھے معاف کر دو بیٹے، مجھے شاید اس دن ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”نہیں آپ کو پورا حق حاصل ہے مگر اس عورت کے لئے نہیں۔“ وہ اسی شدید انداز میں پھر چیخا۔

”آئی ایم سوری بیٹے ایگین سوری۔“ مما نے پھر کہا تو وہ سخت عاجز ہو گیا تھا۔

”مجھے گنہ گار مت کریں مما۔“

”میں اس روز پریشان تھی۔“ انہوں نے جیسے وضاحت دی تھی۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ معاذ نے ٹھنڈا سانس کھینچا۔

”کھانا نہیں کھاؤ گے؟“ انہوں نے کہا پھر اس کا ہاتھ تھام کر کچن میں لے آئیں۔

”پرنیاں کو معاف کر دو بیٹے، بس تم اسے انڈر اسٹینڈ نہیں کر پائے۔“ مما نے اس کے آگے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے عاجزی سے کہا تھا، معاذ کے چہرے پہ زہر خند پھیل گیا۔

”میں اسے بہت اچھی طرح انڈر اسٹینڈ کر چکا ہوں مما ڈونٹ یو وری۔“ اس نے گہرا سانس بھرا پھر انہیں دیکھ کر آہستگی سے بولا تھا۔

”میرا ایک دوست ہے مما! بہت قابل ہے، خوبصورت بھی اور پڑھا لکھا بھی، بس ذرا فیملی بیک گراؤنڈ اتنا مضبوط نہیں ہے۔“

”تو پھر۔“ مما حیران نظر آئیں۔

”میں چاہتا ہوں زینب کے لئے، مما ہم اسے فنانشلی سپورٹ......“

”بیٹے آپ پچھلے دنوں گھر پہ نہیں رہے ہو ورنہ آپ کو بتا دیتی، آپ کے پپا جان نے زینب کا نکاح جہان سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ مما کے جواب نے معاذ کو بھونچکا کر ڈالا تھا، وہ اگلے کئی لمحے کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکا۔

”جے کو پتہ ہے؟“ خاصی تاخیر سے وہ بولا تو حیرت اس کے لہجے سے ہنوز ظاہر تھی۔

”نہیں، فی الحال یہ بات بزرگوں کے بیچ ہوتی ہے، یا پھر جنید تھے وہاں۔“

”جے سے بات کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے مما، اس سلسلے کو یہیں ختم کر دیں۔“ اس کا لہجہ دوٹوک اور قطعی تھا، مما نے مضطرب اور حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی تھی۔

”مگر کیوں؟ آپ جانتے ہو معاذ یہ میری شدید خواہش تھی۔“ ان کے لہجے میں احتجاج اور بے بسی بیک وقت در آئی تھی۔

”مگر یہ زینب کی خواہش نہیں تھی مما! اور میں دوسری بار، جے کی تذلیل نہیں ہونے دے سکتا، آپ بھول گئی ہوں گی جو کچھ ہوا مگر جے......“

”جہان ایسا بچہ نہیں ہے۔“

”اس کا یہ مطلب ہے اس سے قربانی مانگی جائے۔“ معاذ نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا، مما نے کرب انگیز نظروں سے اسے دیکھا پھر ہونٹ بھینچ لئے۔

”یہ قربانی نہیں شاہ ہاؤس کی بھلائی کو اٹھایا گیا ایک قدم ہے، ہم ایک بار پھر کوئی اور رسک نہیں لے سکتے، آپ کا دوست بہت اچھا ہو گا بیٹے مگر ہم اب کسی غیر پہ بھروسہ نہیں کرنا چاہتے۔“ مما نے تیمور والی بات پر رسان انداز میں اس کے سامنے رکھ کر کہا تو معاذ گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا، مما نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

”کیا آپ اپنے دوست کو یہ مجبوری بھی بتا دو گے؟ کیا وہ اتنا اعلیٰ ظرف ہو گا کہ پھر بھی زینب کو قبول کر لے اور تیمور جیسے برے انسان کا سامنا کرنے کی ہمت بھی پیدا کرے اپنے اندر۔“ معاذ نے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے انہیں دیکھا تھا پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔

”آپ کی بات مان لی مما جے اعلیٰ ظرف بھی ہے اور یہ کہ یہ خاندان کی بھلائی کو اٹھایا گیا ایک قدم ہے مگر کیا اس صورت تیمور جیسے انسان کے انتقام کے نشانے پہ جے کو لا کھڑا کرنا ہمیں زیب دیتا ہے۔“ معاذ نے ایک بہت اہم مگر تلخ سوال ان کے سامنے رکھا۔

”تیمور خان بہرحال خدا نہیں ہے معاذ حسن کہ کسی کی زندگی موت کا فیصلہ کرنے لگے۔“ مما کی بجائے یہ جواب پاپا جان نے دیا تھا جو اسی وقت شاید وہاں آئے تھے، مما کے ساتھ معاذ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا، مما جلدی سے اٹھی تھیں۔

”بھائی جان آپ اس وقت؟ بھابھی بیگم کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں، ڈونٹ وری، میں معاذ کو ہی دیکھنے آیا تھا، آج بہت تاخیر سے آئے بیٹے؟“

”جی پاپا جان کام کے سلسلے میں دیر ہو گئی تھی۔“

”اس وقت کون سا کام کرتے ہو؟“ پاپا جان نے الجھ کر اسے دیکھا، معاذ نے مسکراہٹ دبائی، اگر وہ کام کی نوعیت انہیں بتا دیتا تو انہوں نے اسی وقت اس کی طبیعت صاف کر دینی تھی۔

”میں کئی دنوں سے آپ کا منتظر تھا بیٹے۔“

”سوری پاپا جان، کہیے کیا بات تھی؟“ وہ اٹھ کر ان کے نزدیک چلا آیا۔

”آپ جہان کے دوست ہو نا، جہان کو اس بات پہ آمادہ کرو۔“ پپا جان کی بات پہ بلکہ اس کڑی ذمہ داری نے معاذ کی پیشانی عرق ریز کر دی، وہ ایک دم سے ہونٹ بھینچ گیا تھا۔

(تو آپ بھی جانتے ہیں پاپا جان یہ کس درجہ دشوار امر ہے) اس کے ہونٹوں پر شکستہ مسکان بکھری۔

”آپ بات کو سمجھو بیٹے، میں اگر جہان سے یہ بات کروں گا تو وہ اسے حکم کا درجہ دے گا، کچھ نہیں بولے گا مگر تم دوست ہو اس کے، اسے کریدو ذرا۔“ پپا جان نے گویا اپنی بات کی وضاحت کی تھی، معاذ نے محض سر ہلا دیا تھا، انا خودداری کی بات نہیں تھی کہ اسلام میں اس کی ممانعت نہیں تھی، حضرت بی بی آمنہؓ کا رشتہ ان کے والد گرامی خود لے کر حضرت عبداللہؓ کے والد محترم کے پاس حاضر ہوئے تھے، معاذ نے پہلی بار جہان کو فورس تک کیا تھا وہ اس میں قباحت نہیں سمجھتا تھا، مگر اب کے معاملہ کچھ اور تھا، وہ جہان کے سامنے اس بات کو کرتا ہوا شرمسار تھا تو وجہ زینب کا اس سے روا رکھا جانے والا سلوک تھا۔

”آپ کرو گے نا بات بیٹے! میں چاہتا ہوں یہ کام جتنی جلدی ہو جائے مناسب ہے۔“

”اوکے پاپا جان، میں بات کر لوں گا، ڈونٹ وری۔“ اس نے رسان سے کہا تو پاپا جان ایکدم مطمئن نظر آنے لگے تھے مگر معاذ کا اضمحلال بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

میرے چہرے پہ ان گنت تحریریں ہیں
ہر سطر میں ہزاروں مضمحل خواب
ان خوابوں کی ٹہنیوں سے لپٹے
خار گلاب ایسے
بہت ہی ستم رسیدہ کسی بے حد بوڑھے فقیر کے جیسے
حسن کا کاسہ بہت سی دعاؤں سے ویران ہے
سراب ہونے کا منتظر
زوردار بارش کا طلبگار
آئینہ جب بھی دیکھوں تو
میرے چہرے پر ان گنت جھریاں
بے شمار سلوٹیں دکھائی دیتی ہیں
تھکی ہوئی بیمار آنکھیں
کسی شفایاب لمحے کی منتظر میں بھی
بوڑھے فقیر کے جیسی ہوں
تم نے میرے قدموں تلے گرم ریت بچھا دی ہے

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی، اس کی نگاہیں زینب کے خزاں رسیدہ وجود پہ جم کر رہ گئی تھیں، کتنی حسین تھی وہ جب ژالے نے اسے پہلی بار دیکھا تھا، تروتازہ مہکتی ہوئی گلاب کی کلی کی طرح سے دلکش اور حسین، مگر اب...... اسے دیکھ کر کسی کھنڈر اور ویران عمارت کا خیال آتا تھا، اسے دیکھتے ہی ژالے کے ذہن میں اس نظم کے مصرعے بازگشت کی طرح گونجتے چلے گئے تھے، معاً کسی سمت سے نکل کر جہان اس طرف آ گیا، وہ زینب کی بانہوں میں ہمکتی فاطمہ کو پیار کر رہا تھا، پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر زینب سے فاطمہ کو لے لیا تھا، پل دو پل کی بات تھی پھر زینب آگے بڑھ گئی تھی، مگر ژالے نے دیکھا تھا وہ دونوں ساتھ کھڑے تھے تو مما کی نظریں ان کی جانب ہی اٹھی ہوئی تھیں، ایک خواہش تھی جو ان کی نگاہ کو کور میں ہمکتی تھی، وہ خواہش

ژالے انجانے میں سہی مگر جان گئی تھی، اس رات جب وہ پانی لینے کچن میں آئی تھی اور معاذ پاپا جان اور مما کی باتیں نا چاہتے ہوئے بھی اس کی سماعتوں میں اترتی چلی گئی تھیں، کتنی وحشت اتری تھی تب اس کے اندر، کیسی تشنگی جس کے آگے حلق میں کانٹے ڈالتی پیاس بھی اپنی حیثیت کھو بیٹھی تھی، جہان کو شیئر کرنے کا خیال بھی سوہان روح تھا، وہ اس ساری رات تڑپی تھی جب کسی طور قرار نہیں آیا تو جائے نماز پہ کھڑی ہو کر اپنے رب کے حضور اپنی گزارش پیش کرنے لگی کہ یہاں شاہ ہاؤس کے باسیوں نے تو اس سے رائے لینا بھی گوارا نہیں کیا تھا، پھر کیا کہتی وہ ان سے، جھگڑتی کیسے کہ آج تک وہ کبھی اپنے حق کے لئے ڈٹ ہی نہ سکی تھی، اسے یہ سلیقہ ہی نہ آیا تھا، کچھ نہ سوجھا تو اللہ کے دربار میں چلی آئی اپنی گزارش لے کر، ہچکیاں آنسو آہیں، وہ کتنی بے چین تھی، کس درجہ مضطرب، ایک ہی التجا ایک ہی دعا کسی طریقے یہ نہ ہو، وہ جہان کو بانٹ نہیں سکتی تھی مگر پھر ٹھٹک گئی، آگاہی کرب بن کر اس کی رگوں میں سرائیت کر گئی تھی، وہ تو ایک گرتی ہوئی عمارت تھی، جو ہر لحہ مسمار ہو رہی تھی، وہ بھلا کب تک جہان پہ اجارہ داری جما سکتی تھی، پھر کیا مضائقہ تھا اگر وہ خود سے یہ نیک کام کرے۔

”اللہ مجھ میں حوصلہ نہیں، میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ اس نے یہ دعا مانگتے اپنے الفاظ پہ دھیان دیا تھا اور کانپ گئی تھی، وہ کیا کہہ رہی تھی۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو اس کی برداشت سے بڑھ کر دکھ نہیں دیتا، اگر عورت برداشت نہیں کر سکتی تھی تو پھر اللہ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت کیونکر دی؟ سوال اٹھا تھا، ”اور اللہ ہرگز ظالم نہیں ہے“ جواب بھی مل گیا تھا، وہ مضمحل سی آنسو پونچھ کر مسکرا دی۔

”میرے اللہ مجھے حوصلہ دینا، میں یہ کام زینب کے لئے نہیں کروں گی، میں یہ کام شاہ کے لئے بھی نہیں کروں گی، کہ وہ زینب کو پسند کرتے ہیں میں جانتی ہوں، میں یہ کام تیرے لئے کروں گی اور اگر ہم تیرے لئے کوئی کام کریں تو تو ہی بہترین اجر عطا فرمانے والا ہے۔“

ایک لحہ تھا آگاہی کا، ایک لحہ ہی ہوتا ہے ہدایت کا جو اسے عطا ہوا تھا، وہ خوش بخت ٹھہرائی گئی تھی یہ اس نے جان لیا تھا۔

”ژالے تم تیار نہیں ہوئی ہو؟“ جہان اندر آیا تو اسے ہنوز اسی حلیے میں دیکھ کر زچ ہوا تھا، ابھی کچھ دیر قبل وہ اسے ہاسپٹل چیک اپ کے لئے لے جانے کا کہہ کر تیار ہونے کا کہہ گیا تھا۔

”آپ ابھی زینب کے پاس کھڑے تھے نا شاہ، آپ کو پتہ ہے آپ اور زینب ساتھ ساتھ کھڑے کتنے اچھے لگتے ہیں۔“ وہ اس کے نزدیک آئی تھی اور اس کے کوٹ کے بٹن سے کھیلتی ہوئی بولی تو جہان جیسے سناٹے میں گھر گیا تھا، اسے حقیقتاً ژالے کی دماغی حالت پہ شبہ ہوا تھا۔

”آپ کو کبھی کسی نے یہ بات اس سے پہلے بتائی نہیں کیا؟“ ژالے نے اس کا کوٹ مٹھی میں دبوچ کر ہلکے سے جھٹکا دیتے ہوئے گویا اسے بولنے پہ اکسایا، جہان ایکدم سے بھڑک اٹھا۔

”واٹ نان سنس ژالے؟ تمہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ تم......“

”مجھے اندازہ ہے، میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے، آپ یہ بتائیں میری اک بات مانیں گے؟“ ژالے کی سنجیدگی میں فرق آیا تھا نہ اطمینان میں جبکہ جہان صحیح معنوں میں سرتاپا ہل کر رہ گیا تھا۔

”کون سی بات؟“ وہ جیسے خود پہ بہت ضبط کر کے بولا تھا۔

"پہلے وعدہ کریں مانیں گے۔" ژالے کے اصرار پہ جہان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"ایسی کون سی بات ہے؟" اس نے محتاط انداز کو اپنایا۔

"پرامس تو کریں۔" ژالے نے مسکرا کر کہتے اپنا نازک سا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا، جسے جہان نے بہت جذب سے تھاما پھر اسے نرمی و آہستگی سے چوم لیا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میں ساری زندگی تمہارا ساتھ نبھاؤں گا، تمہاری بے وقوفانہ باتوں کے باوجود۔" جہان نے جیسے کچھ دیر قبل زینب والی بات کا حوالہ دیا تو ژالے نے ناراضگی سے اسے دیکھ کر منہ پھلا لیا تھا۔

"آپ کے خیال میں میں بے وقوف ہوں؟" وہ نروٹھے پن سے بولی، جہان نے مسکراہٹ دبائی۔

"پہلے نہیں تھا یہ خیال، ابھی ابھی یقین ہوا ہے۔" وہ پھر اسی بات کا حوالہ دے رہا تھا ژالے نے زچ ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا اور سیریس بھی نہیں ہیں، جبکہ میں بے حد اہم بات کرنے والی تھی، خیر جب آپ سیریس ہوں تو بتا دیجئے گا۔" ژالے نے بے اعتنائی کی حد کر دی، جہان تو بوکھلا اٹھا تھا۔

"افوہ...... اتنا غصہ؟ چلو خیر آئی ایم سیریس ناؤ، بولو کیا بات ہے؟" جہان نے خود پہ دانستہ سنجیدگی کا خول چڑھا کر مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا، ژالے کچھ دیر اسے جھانچتی نظروں سے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس بھرا۔

"آپ زینب سے شادی کر لیں۔" جہان کا دل ہی نہیں وہ خود بھی دھک سے رہ گیا تھا، پہلے اس کا چہرا متغیر ہوا تھا پھر بے تحاشا سرخ ہو کر دہک گیا۔

"یہ کیسا فضول مذاق ہے ہانی؟" وہ جو سنجیدہ نہیں ہو پا رہا تھا خطرناک قسم کی سنجیدگی سمیت بولا تھا۔

"یہ مذاق نہیں ہے شاہ! آپ کو اندازہ تو ہو گا کہ گھر میں اس وجہ سے کس درجہ ٹینشن پھیلی ہوئی ہے، تیمور کی وجہ سے سب کس قدر اپ سیٹ ہیں اور......"

"تمہیں اس متعلق کسی نے کچھ کہا ہے ژالے؟" جہان بری طرح سے چونک اٹھا تھا، ژالے نے تیزی سے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے شاہ! مجھے خود سے احساس ہے۔"

"میری بات دھیان سے سنو ژالے اور اچھی طرح ذہن نشین کر لینا، آج کے بعد میں تمہارے منہ سے یہ بات نہ سنوں۔" وہ جس خوفناک سنجیدگی کے حصار میں تھا ژالے اسی قدر عاجز ہو اٹھی تھی۔

"دس از ناٹ فیئر شاہ! آپ ایسے نہیں ہیں۔" اس نے جیسے سخت احتجاج کیا تھا، جواباً جہان نے اسے سخت اور تادیبی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں نے کہا نا تم یہ بات نہیں کرو گی، دوسری اہم بات یہ کہ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔"

"میں یہ بات بار بار کروں گی شاہ، اس وقت تک کروں گی جب تک آپ مان نہیں جاتے اور یہ خیال اپنے دل سے نکال دیں کہ میں کچھ نہیں جانتی۔" سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے آخر میں جیسے ژالے نے اپنی بات پہ زور دے کر اسے کچھ جتلایا تھا، مگر جہان نے قطعی اہمیت نہیں دی تھی۔

"مجھے نہیں پتہ ہانی تم مجھ سے یہ اصرار کیوں کر رہی ہو، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کوئی عورت خوشی سے اپنا شوہر کبھی تقسیم نہیں کرتی، کیا میں سمجھوں وہ تمہارا مجھ سے محبت کا دعوا نام نہاد تھا۔" اس کا لہجہ زہر آلود نہیں تھا نہ طنزیہ البتہ عجیب سا اضطراب لئے ہوئے تھا۔

"یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے شاہ! اور عورت بہرحال کم ظرف نہیں ہے، اسلام کی تاریخ گواہ رہی ہے اس بات کی کہ ایک عورت نے ایک سے زائد مرتبہ اپنے شوہر کو تقسیم کیا ہے اور میں محبت کرتی ہوں جبھی محبت میں نارسائی اور تشنگی کے احساس سے آشنا ہوں، شاہ میں چاہتی ہوں میری طرح سے آپ بھی اپنی محبت حاصل کر لیں، بلیو می مجھے دکھ نہیں خوشی حاصل ہو گی۔" وہ عاجزی سے کہہ رہی تھی جبکہ جہان شاکڈ رہ گیا تھا، اس کی بات کا آخری حصہ گویا اس کے وجود کے پرخچے اڑا کر رکھ گیا تھا، اسے اپنی سماعتوں پہ شبے کا گمان ہوا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ حق دق سا اسے دیکھنے لگا، ژالے رواداری سے مسکرا دی۔

"آپ زینب سے محبت کرتے ہیں شاہ میں جانتی ہوں، اب سے نہیں تب سے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا جب میں نے خود آپ سے محبت کی، تب مجھے اندازہ ہو گیا تھا آپ کسی اور سے محبت کرتے ہیں، مجھ سے کبھی نہیں کریں گے، پھر جب میں یہاں آئی تو زینب سے مل کر یہ معمہ بھی حل ہو گیا تھا۔" جہان متحیر سا بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا، کیا اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا جسے ہر کسی نے پڑھ لیا تھا، وہ تو لاکھ پردوں میں چھپا کر رکھتا رہا تھا، اس ایک جذبے کو پھر بھی اس کی اتنی تشہیر ہو گئی تھی، نہیں جان سکی تھی تو بس ایک وہ جسے جاننا چاہیے تھا، وہ پر ملال سا سوچ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں شاہ؟" اس نے نرمی سے کہہ کر جہان کے شانے کو چھوا وہ جیسے گہری نیند سے جاگا۔

"تمہیں بہت شدید قسم کی غلط فہمی......"

"شاہ پلیز...... کم از کم مجھ سے جھوٹ نہ بولیں، آئی ایم ساری مگر مجھے اچھا نہیں لگتا آپ کا اس طرح خود کو چھپانا۔" وہ ٹوکتے ہوئے انتہائی نرمی سے بولی تھی، جہان کس قدر کھسیا گیا پھر گہرا سانس بھر کے خود کو کمپوزڈ کیا تھا اور رسان بھرے انداز میں گویا ہوا۔

"چلو ٹھیک ہے، اگر تم یہ ساری باتیں جان گئی ہو تو بعد کی صورتحال بھی تم سے ہرگز مخفی نہیں رہی ہو گی، میرے انکار کی وجہ بھی یہی ہے، میں اتنا بے مایا بھی نہیں ہوں کہ......"

"آپ بے مایا نہیں خاص ہیں شاہ، اعلیٰ ظرف اور درگزر سے کام لینے والے، اپنوں کے عیب دیکھ کر انہیں عیاں نہیں کیا جاتا شاہ بلکہ ان کو ڈھانپا جاتا ہے، آپ نے ایک بار پہلے بھی اپنی محبت کی قربانی دی تھی اب تھوڑی سی انا کی قربانی دے دیں، کیا حرج ہے؟"

"بہت حرج ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا، تم مجھے کم ظرف سمجھو یا کینہ پرور، یہ تمہاری مرضی ہے۔" جہان نے اس کی بات کاٹ کر بے حد تلخی سے کہا اور اٹھ کر چلا گیا، ژالے ہونٹ بھینچ کر بیٹھی رہ گئی تھی، شاید یہ کام اتنا بھی آسان نہیں تھا جتنا اس نے اسے سمجھا تھا۔

☆☆☆

ہتھیلی سامنے رکھنا کہ سب آنسو گریں اس میں

جو رک جائے گا ہونٹوں پر سمجھ لینا کہ وہ میں ہوں
کبھی جو چاند کو دیکھو تو تم یوں مسکرا دینا
جو چل جائے ہوا ٹھنڈی تو آنکھیں بند کر لینا
جو جھونکا تیز ہو سب سے سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں
جو زیادہ یاد آؤں تو تم رو لینا جی بھر کے
اگر ہچکی کوئی آئے سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں
اگر تم بھولنا چاہو مجھے شاید بھلا دو تم
مگر جب سانس لینا تم سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں

مما کی ہدایت کے مطابق وہ ہاسپٹل ساتھ لے جانے والا بیگ تیار کر رہی تھی، اس کی ڈلیوری کی ڈیٹ نزدیک تھی مگر مما کا خیال تھا ڈاکٹرز کی ڈیٹ پہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، یہ اللہ کے کام ہیں اور اللہ کو ہی غیب کا علم ہے، وہ اپنی ساری تیاری مکمل کر رکھے، اسے جس وقت بھی جو یاد آتا وہ اٹھا کر بیگ میں رکھ دیتی، اس وقت بھی بچے کے کپڑے جو ابھی ماریہ ننھے ننھے سفید کرتے سلائی کر کے دے کر گئی تھی جن پہ بڑے شوق سے اس نے خود کڑھائی بھی کی تھی، زینب نے انہی کو پریس کرنے کے بعد بیگ میں رکھ رہی تھی جب ماریہ جوش و خروش سے بھری اس کے پاس بھاگی آئی تھی۔

”بھابھی بھابھی نیچے آیئے، اک سرپرائز ہے آپ کے لئے۔“

”کون سا سرپرائز؟ رکو تو مجھے آرام سے چلنے دو۔“ وہ ہانپ کر رہ گئی تھی، مگر ماریہ نے کہا سنا تھا، ٹی وی لاؤنج میں لا کر چھوڑا جہاں گویا پورا گھر امڈا ہوا تھا، ٹی وی آن تھا اور سب حیران ششدر اور کس حد تک متجسس سے اسکرین کی سمت متوجہ تھے، جہاں وہ تھا دشمن جاں اپنی تمام تر سحر انگیزی، دلکشی، وجاہت اور خوبروئی سمیت وہ پلے میں وہ رومینٹک شوہر کا کردار ادا کر رہا تھا، بیڈ روم سین تھا، صرف معاذ ہی نہیں اس کی ساتھی لڑکی بھی ایک دوسرے کے بے حد نزدیک تھے اور جو ڈائیلاگ تھے، پرنیاں کے کانوں سے گویا دھواں نکلنے لگا، وہ سرخ چہرے کے ساتھ مڑی تو اسی پل وہاں آنے والے معاذ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا، پرنیاں نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر سرعت سے سائیڈ سے نکل گئی، معاذ کی نگاہ پہلے اس پر پھر ٹی وی اسکرین پہ جا رکی اور دل میں جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی، اسے لگا تھا اس کا مقصد حل ہو گیا تھا، اس نے کاندھے جھٹکے اور مسکراتا ہوا وہیں سے پلٹ گیا، اس کا رخ جہان کے کمرے کی جانب تھا، ژالے سب کے ساتھ یہاں ٹی وی لاؤنج میں تھی، معاذ نے مناسب سمجھا تھا اسی وقت جہان سے بات کر لے، پاپا جان کی نظریں ہر بار ہونے والے سامنے یہ سوال کرتی تھیں اور اسے شرمندگی سے نگاہیں چرانا پڑ جاتیں، اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ جہان سے بات کرنے کو اسے بہت سارا حوصلہ چاہیے تھا جو مجتمع نہیں کر پا رہا تھا وہ۔

”بزی تو نہیں ہو جے؟“ دستک دے کر معاذ نے اندر جھانکا تو اس کا انداز بے حد فارمل سا تھا، جہان نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”اگر ہوں گا بھی تو کیا تمہارے لئے وقت نہیں نکالوں گا؟ آ جاؤ یار۔“ جہان نے اپنے آگے کھلی فائل بند کر دی تھی، معاذ ڈھیلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا تھا، ایک وقت تھا جب اس نے مما سے بحث

کرتے ہوئے طعنہ دینے کے انداز میں عبدالوہاب (پرنیاں کے ددا) کے متعلق گوہر افشانی کی تھی کہ انہوں نے زبردستی اپنی بیٹی اس کے سر منڈھ دی تھی، آج وقت کی گردش نے اسے کسی اور کے آگے جھکانے کا فیصلہ کر لیا تھا، یہ مکافات عمل کا سلسلہ قدرتی عمل ہے، بہت سارے اس سے عبرت اور عقل پکڑتے ہیں اور کچھ مہر زدہ دل والے اس لمحے بھی خدا سے بدگمان ہو کر شکوہ شکایت کا دفتر کھول بیٹھتے ہیں۔

”خیریت معاذ؟ طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ جہان نے اس کی گم صم کیفیت اور خاموش انداز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا تھا، اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس بات پہ وہ کل بہت سختی سے ژالے کو جھڑک چکا ہے یہ ہی مطالبہ لے کر معاذ اس کے پاس آیا ہو گا۔

”ہاں...... کچھ نہیں......“ معاذ نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا تھا پھر خائف سے انداز میں ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

”تم کچھ کہنا چاہتے ہو معاذ؟“ جہان ایک دم سے جیسے محتاط ہوا تھا، اس نے پرکھتی نظروں سے معاذ کو دیکھا تھا۔

”تم نے شوبز جوائن کر لیا اور کسی کو بتایا تک نہیں، دس از ناٹ فیئر یار۔“ جہان نے دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا، معاذ اسے دیکھے گیا، شاید وہ اس کے گریز کے پہلو کو پا گیا تھا۔

”پرنیاں بہت ہرٹ ہوئی ہے، تم نے اسے تنہا بھی بہت کر دیا ہے، یار کیوں اس کی شکایتوں میں اضافہ کرتے ہو؟“ جہان نے جیسے اس کی برین واشنگ کا آغاز کر ڈالا تھا۔

”لڑکیاں نازک تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں معاذ، رویوں کی سختی سے ان کے خوبصورت رنگ بہت تیزی سے ماند پڑنے لگتے ہیں، پھر لاکھ کوشش کرو مگر......“

”جے مجھے تم سے کچھ اور بات کرنی ہے۔“ معاذ نے یکلخت اس کی بات کاٹ دی، جہان جو اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا رک کر اسے دیکھنے لگا پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس آنے کا کہا تھا۔

”وہ بہت اکیلی نظر آتی ہے معاذ، مجھے ہر لمحہ اس کی آنکھوں میں تمہارا انتظار نظر آتا ہے، اس وقت وہ جس حالت میں ہے نا معاذ، یو نو اس پریگننسی پریڈ میں عورت بہت سی اپنی کیفیات سوائے اپنے ساتھی کے اور کسی سے شیئر نہیں کرنا چاہتی جن سے وہ گزر رہی ہوتی ہے، تم نے اسے اس مرحلے پہ آ کر بھی تنہا چھوڑ دیا ہے۔“ جہان کا انداز ناصحانہ تھا اور نظریں نیچے لان میں چہل قدمی کرتی پرنیاں پہ جمی تھیں اس کے ہر اٹھتے قدم سے تھکن لپٹی تھی، وہ واقعی تنہا اور اداس نظر آتی تھی، کسی حد تک خود سے بھی بے زار، ڈاکٹر نے اسے کئی کئی گھنٹے چہل قدمی کی ہدایت کر رکھی تھی، وہ تھک جاتی پیروں میں سوئلنگ اتر آتی مگر اسے پھر بھی ٹہلنا پڑتا کیوں، اس کے بچے کی خاطر، ماں بننا اتنا آسان نہیں تھا، اس کٹھن منزل کے کتنے ہی کڑے مراحل پرنیاں نے اس کے سامنے طے کیے تھے، پہلے مرحلے کی نقاہت اور بے تحاشا وومیٹنگ پھر میڈیسن اور چیک اپ اور ان دنوں تو اس کی وہ حالت تھی کہ وہ نہ سکون سے بیٹھ پاتی تھی نہ لیٹ، کل ہی کی بات تھی جب اس نے اسے مما کو اپنی کیفیت کتنی بے چارگی سے کہتے ہوئے سنا تھا۔

”مجھے کسی بھی پل سکون نہیں ہے مما! رات کو اکثر تو نیند نہیں آتی، آ جاتے تو وقفے وقفے سے آنکھ

کھلتی رہتی ہے، سانس رکتا ہے۔" جواب میں مما نے اسے گلے لگا کر ماتھا چوما تھا۔

"آخری دن ہیں نا بیٹے، ان دنوں ایسا ہی ہوتا ہے، ماں کے لئے اللہ نے ایسے ہی امتحان رکھے ہیں، ایویں تو اس کے درجات میں اتنی بلندی نہیں رکھی گئی، پھر تمہارا تو یہ پہلا تجربہ ہے جبھی زیادہ گھبرا رہی ہو، معاذ کی مرتبہ میں بھی یونہی پریشان تھی، بار بار گھبرا کر رو پڑا کرتی، مگر احسان بہت خیال رکھتے تھے۔" مما بے اختیاری میں کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئی تھیں۔

"معاذ یہ مرحلے کتنے ہی کٹھن سہی اگر عورت کے ساتھ اس کا ساتھی ہر قدم پہ ساتھ نبھائے تو یہ دشواریاں آسان لگنے لگتی ہیں، جاؤ وہ اس وقت بھی تمہاری منتظر ہے۔" جہان کی اس نصیحت پہ معاذ نے اسے ناگواریت سے دیکھا تھا۔

"میں تم سے اس موضوع پہ لیکچر سننے نہیں آیا۔" اس بات کے جواب میں جہان محض تاسف سے اسے دیکھ سکا تھا۔

"ہم زینب کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں جے، آف کورس اسے عمر بھر کو یوں نہیں بٹھایا جا سکتا۔" معاذ نے اپنی بات کہہ کر اسے دیکھا، جہان نے دانستہ اس سے نگاہ نہیں ملائی تھی، جبکہ معاذ اس کی کسی بھی بات کا منتظر تھا، دونوں کے بیچ بولتی معنی خیز خاموشی آ کے ٹھہر گئی، جہان خائف جبکہ معاذ مضطرب تھا۔

"بہت اچھا فیصلہ ہے، ہے کوئی مناسب رشتہ نظر میں؟" بالآخر جہان کو کہنا پڑا تھا، یہ طے تھا کہ اسے زینب سے شادی نہیں کرنی تھی، ژالے کے بعد وہ معاذ کو بھی صاف جواب دے سکتا تھا، معاذ نے جہان کے اس سوال کے جواب میں گردن موڑ کر اسے کچھ دیر تک دھیان سے دیکھا تھا، پھر کاندھے جھٹک دیئے۔

"ہاں ہے، پوچھو گے نہیں وہ کون ہے؟"

"کون ہے؟" جہان ہنوز پرسکون تھا، مگر وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم! پہلے ہو یا بعد میں ہمارا زینب کے لئے ہمیشہ انتخاب تم ہی رہو گے جے۔" الفاظ تھے یا بارود کے گولے، جہان نے اپنا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھرتا محسوس کیا، معاذ نے اس کے دھواں ہوتے چہرے کو اور سختی سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو ایک نظر دیکھا تھا، جو ایک سکتے کی کیفیت کے زیر اثر دکھائی دیتا تھا، شاید اسے معاذ سے کم از کم اس بات کی توقع نہیں تھی، معاً وہ سنبھلا تھا اور ایک لفظ کہے بغیر جھٹکے سے پلٹا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا، معاذ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا، اس کے چہرے پہ اضمحلال تھا، گہری تھکن تھی۔

(تم انکار بھی کر دو گے جے تو مجھے بالکل تکلیف نہیں ہو گی، لیکن میں جانتا ہوں تم ایسا کرو گے نہیں، یہی تو فرق ہے تم میں اور ہم میں، ہم بدلہ لینے والے ہیں اور تم معاف کرنے والوں کی فہرست میں شامل)

☆☆☆

اگر وہ پوچھ لے ہم سے تمہیں کس بات کا غم ہے
تو پھر کس بات کا غم ہے اگر وہ پوچھ لے ہم سے

اس کی آنکھیں ایک تسلسل سے برس رہی تھیں، صبح سے اسے درد ہو رہی تھی، جواب تک ناقابل

برداشت ہوئی تو آنکھیں چھلک پڑیں، آنسوؤں کا یوں بہنا صرف اس تکلیف کے باعث ہی تو نہیں تھا، معاذ کی بے اعتنائی اور سرد رویہ اسے ہر لحہ کچوکے لگانے کو کافی تھا، آج صبح ہی جب راہداری میں موجود نمی سے اس کا پیر سلپ ہوا تو وہ اس بری طرح پھسلی تھی کہ خود اس کی اپنی جان بھی ہوا ہو گئی تھی، بروقت کسی کے مضبوط بازوؤں نے سہارا دے کر سنبھال لیا تھا، حواسوں میں آتے ہی اس نے بے اختیار گردن موڑی تھی اور اپنے بے حد نزدیک معاذ حسن کو پا کر اس کے اندر جیسے ایک دم سے تپش اتر آئی تھی، اگر اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ فاصلے پہ ہونے کو بے قرار ہوئی تھی تو وجہ معاذ کا ہر قدم پہ اس کے لئے اختیار کیا ہوا ہتک آمیز سلوک ہی تھا مگر معاذ نے اس کی اس ناگواری کے احساس کو بھی سراسر اپنی توہین سے تعبیر کیا تھا۔

"اگر تم اس خوش فہمی کا شکار ہو کہ تمہیں چھونے یا تمہارے نزدیک آنے کی خواہش میں بے تاب ہوا ہوں تو تمہاری عقل پہ ماتم ہی کیا جا سکتا ہے، تم میرے سامنے تڑپ تڑپ کر بھی مر جاؤ تو مجھے ہرگز پرواہ نہیں ہو گی، یہ اگر میں تمہاری کیئر کرتا ہوں تو اس کی وجہ بھی تم نہیں میرا بچہ ہے، جس کی وجہ سے میں تمہیں برداشت کرنے پہ مجبور ہوں۔"

اسے ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر کے فاصلے پہ کھڑا کرتے ہوئے معاذ نے اس کی سماعتوں میں اپنی نفرت کا سیسہ پگھلایا تھا، خود تو وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا جبکہ پرنیاں اس درجہ نفرت و حقارت اور بے زاری کے مظاہرے پہ وحشت زدہ سی وہیں کھڑی رہ گئی تھی، پھر جانے کیا ہوا تھا اس کے پہلو میں درد کی ٹیسیں اٹھتی چلی گئی تھیں، اس کی طبیعت کی خرابی خبر بھابھی کے ذریعے دو گھنٹے بعد مما تک پہنچی تھی۔

"میں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں آپ کو، آپ تیار ہو جاؤ بیٹے۔" مما ان دنوں اتنے جھمیلوں میں الجھی ہوئی تھیں کہ پہلے کی طرح اس کی کیئر کر پاتی تھیں نہ وقت دے پاتیں، ویسے بھی پرنیاں نے ان کے سامنے خود کو کسی قدر سنبھال لیا تھا، پھر بھی وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خود اسے کپڑے نکال کر دیئے تھے۔

"میں رجو کو بھیجتی ہوں وہ آپ کی چادر پریس کر دے گی، تب تک میں خود تیار ہو لوں۔" انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا، پرنیاں نے اٹھ کر بس کپڑے ہی تبدیل کئے تھے، اس کی تکلیف شدت اختیار کرتی جا رہی تھی، وہ بے دم سے انداز میں وہیں بیٹھ گئی، رجو اس دوران آ کر اس کی چادر استری کر کے رکھ گئی تھی، اسے جاتے دیکھ پرنیاں نے مما کو جلدی بھیجنے کی تاکید کی تھی۔

"مما پلیز مجھے چادر اٹھا کر دے دیں، اٹھا نہیں جا رہا مجھ سے، ٹانگیں بے جان ہو رہی ہیں۔" دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے گردن موڑے بغیر بوجھل آواز میں کہا تھا، جواب میں خاموشی چھائی رہی تھی، پرنیاں نے کچھ حیرانی کی کیفیت میں پلٹ کر دیکھا، کوٹ بازو پہ ڈالے ماتھے پہ بکھرے بالوں کے ساتھ معاذ وارڈروب کے پاس کھڑا اس کی سمت متوجہ تھا، پرنیاں کا چہرا ایکدم سے سرخ پڑ گیا، اس نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا، معاذ بھی جیسے ہوش میں آیا تھا، وارڈروب کا دراز کھول کر اپنی مطلوبہ فائل لی اور الٹے قدموں پلٹ گیا، سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا مما سے سامنا ہوا تھا جو اوپر ہی جا رہی تھیں اسے دیکھ کر قدموں کو روک لیا۔

”آپ اس وقت...... خیر اچھی بات ہے، پرنیاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، چیک اپ کے لئے لے جا رہی ہوں، عین ممکن ہے ڈاکٹر ایڈمٹ ہی کر لیں، آپ ہمارے ساتھ چلے بیٹے۔“ معاذ کی صبیح پیشانی پہ اُمڈتی ناگوار لکیروں کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے اپنی بات کی تھی۔

”میں بے حد ضروری کام سے جا رہا ہوں مما! آپ ہیں نا، لے جائیں اسے، اگر میری ضرورت پڑی تب کال کر لیجئے گا، آنے کی کوشش کروں گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گیا تھا، مما حیرانی اور غیر یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھتیں رہ گئیں۔

☆☆☆

اک برس کے عرصے میں
چار چھ ملاقاتیں
شام کی حویلی میں صبح کے مہکنے کی
بے یقین سی باتیں
کچھ عذاب ماضی کے
گفتگو کا موضوع تھے
کچھ سوال خوابوں کے اور وہ ملاقاتیں
چار چھ ملاقاتیں
جن میں تیری باتوں کی بارشوں کے موسم نے
جتنے جھوٹ بولے تھے
شام کی حویلی میں جتنے زہر گھولے تھے
تیرا بے وفا لہجہ دھیان میں جب آتا ہے
تب سوال کرتی ہیں میری عمر کی راہیں
اک برس کے عرصے میں
چار چھ ملاقاتیں

اس نے سرسری انداز میں اس نظم کو پڑھا تھا پھر بار بار پڑھا اور کسی طرح بھی آنکھیں چھلکنے سے نہیں روک پائی، یاسیت کا احساس تو تھا ہی ایک وحشت بھی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی، ایسے میں تیمور کا فون آ گیا تھا، وہ اس پہ پھٹ پڑی تھی۔

”اتنے ڈھیٹ کیوں ہو تم خبیث کمینے آدمی، تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ میں تم سے بات کرنا تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی، لعنت بھیج چکی ہوں تم پہ، جان کیوں نہیں چھوڑتے تم۔“ وہ اتنے غصے میں تھی کہ بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے زینب یا پھر میں کر دوں آ کر، تیمور خان ہے میرا نام اور کسی کو آج تک جرأت نہیں ہو سکی کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کر سکے۔“ زینب کے تلخ و تند لہجے نے تیمور خان کو آپے سے باہر کر دیا تھا، اس کے لہجے میں بادلوں کی سی گھن گرج محسوس ہوئی تھی، مگر زینب اب اس سے کیوں ڈرتی۔

”اپنی بکواس بند کرو، یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا سمجھے؟“ وہ جواباً اس کی حیثیت اور مرتبے کو خاطر میں لائے بغیر پھنکاری تو تیمور کو جیسے آگ لگ گئی تھی۔

”میں اس وقت تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر ریسٹورنٹ میں تمہارا منتظر ہوں، دس منٹ ہیں تمہارے پاس، اگر تم نہ آئیں تو میں خود آ جاؤں گا۔“

”تم میرے سامنے ایڑیاں رگڑ کر بھی مر جاؤ تو میں اب تمہاری کسی بات کو نہیں مانوں گی مجبوری کیا ہے آخر؟“ تیمور کے دھونس بھرے لب و لہجے نے زینب کو پیخ پا کر دیا تھا تبھی وہ بغیر لحاظ کے کہہ گئی اور اس کی مزید کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا تھا، اس کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے دہک اٹھا تھا۔

تیمور اس کے بعد بھی کال کرتا رہا مگر زینب نے جیسے کانوں میں تیل ڈال لیا بہری بن گئی، دس منٹ کے وقفے سے اس کے سیل فون کی اسکرین تیمور کے نام کے ٹیکسٹ کے نشان سے روشن ہوئی تھی، زینب نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ٹیکسٹ پڑھا تھا اگلے لمحے اس کی پیشانی پہ پسینہ نمودار ہو گیا، اس نے خوف کے عالم میں پھر سے اسکرین پہ نگاہ دوڑائی۔

(میں تمہارے گھر کے سامنے آ گیا ہوں، باہر آؤ میری بات سنو، ورنہ گھر میں گھسنے سے تمہارے سورما بھائی مجھے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔) زینب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، وہ ایک دم سے بستر سے اتری تھی اور لپک کر کھڑکی تک آئی، دبیز پردہ ہٹا کر اس نے ڈارک گلاس کے پار نگاہ کی تو اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا تھا، گرے چمچماتی ہوئی پراڈو کے کھلے دروازے سے کمر ٹکائے وہ اپنے لمبے تڑنگے وجود کے ساتھ واقعی وہاں بہت دھڑلے سے موجود تھا، زینب یوں نیچے بیٹھتی چلی گئی جیسے اس کی ٹانگوں نے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہو۔

ژالے سوئی ہوئی فاطمہ کو اس کے حوالے کرنے آئی تو زینب کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا ژالے کی نگاہ اس پہ ٹھہری تو اس نے تشویش زدہ انداز میں اسے پکارا تھا، جواباً زینب کی وحشت بھری نگاہوں میں اتنی اجنبیت تھی گویا وہ اسے پہچاننے سے بھی قاصر رہی ہو۔

”کیا ہوا ہے زینی آپی؟ آپ اس طرح نیچے کیوں بیٹھی ہیں، طبیعت ٹھیک ہے نا آپ کی؟“ فاطمہ کو بستر پہ لٹا کر وہ سرعت سے قریب آئی تھی اور زینب کے سرد پڑتے ہاتھ تھام لئے اس دوران سیل فون پہ ایک بار پھر زور و شور سے بیل بجتی چلی گئی، زینب اپنی جگہ پہ زور سے اچھلی تھی اور خوفزدہ نظروں سے سیل فون کو دیکھنے لگی۔

”کس کا فون ہے؟“ ژالے کو تحیر زینب کی اس درجہ غیر ہوتی حالت پہ اضطراب میں ڈھلنے لگا۔

”آپ ادھر بیٹھیں، میں مما کو بلاتی ہوں۔“ اس نے سہارا دے کر دھیرے دھیرے کانپتی زینب کو اٹھایا تو وہ ایک دم سے اس سے لپٹ گئی تھی۔

”مجھے کہیں چھپا لو ژالے، وہ آ گیا ہے وہ...... وہ مار دے گا مجھے، میری بیٹی کو بھی...... دشمن ہو گیا ہے وہ ہماری جانوں کا۔“ وہ ایکدم سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی، ژالے تو حق دق رہ گئی تھی۔

”کس کی بات کر رہی ہیں زینی آپا؟“ اس نے زینب کو ساتھ لگا کر تھپکا تھا۔

”تیمور...... وہ باہر کھڑا ہے، تم واچ مین کو الرٹ کر دو، پپا کو بتاؤ وہ گھر آ جائیں، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ آنسو سسکیاں اور سراسیمگی، وہ اس پل گویا ایک چھوٹی اور بے حد خوفزدہ بچی تھی، ژالے کو تو ایسا

ہی لگا مگر اس کے الفاظ کی سنگینی نے خود ژالے کو بھی گھبراہٹ سے دوچار کر دیا تھا۔
''تیمور خان؟ مائی گاڈ، میں مما کو بتاتی ہوں۔'' وہ باہر دوڑی تو زینب نے ایکدم سے اسے دبوچ لیا۔
''نہیں مجھے تنہا مت چھوڑو، وہ نیچے ہے کسی وقت بھی یہاں آ سکتا ہے۔'' وہ سراسیمگی اور دہشت زدگی کے حصار میں تھی، ژالے واپس صوفے پہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔
''او کے میں نہیں جاتی، مگر مما کو تو بتانے دیں، ایک منٹ میں، میں انٹر کام پہ مما کو آگاہ کرتی ہوں۔'' اسے تسلی سے نواز کر ژالے نے انٹر کام پہ مما سے رابطہ کیا تھا اور زینب کے کمرے میں آنے کا کہا۔
''خیریت ہے نا بیٹے، زینب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ عادت کے مطابق جلدی پریشان ہو اٹھی تھیں۔
''جی طبیعت تو ٹھیک ہے، کچھ اہم بات ہے، ہو سکے تو اپنے ساتھ مما جان اور بھابھی کو بھی لے آیئے گا۔'' ژالے نے رسان سے کہا تھا، اگلے چند منٹ میں تینوں خواتین زینب کے کمرے میں موجود تھیں اور سب سے پہلے کھڑکی سے بیرونی منظر کا جائزہ لیا گیا تھا، مما نے انٹر کام پہ واچ مین کو ضروری ہدایت سے نوازا تھا، تیمور خان گو کہ اپنی پجارو سمیت دفعان ہو چکا تھا، مگر اب اس کی جانب سے دھڑکا تو لگ گیا تھا نا، تشویش اور پریشانی کا ایک نیا باب کھل گیا۔
''اس مسئلے کا فوری حل نکلنا چاہیے، ہم اس طرح ڈر کر تو زندگی نہیں گزار سکتے، ویسے بھی یہ اس کا علاقہ نہیں ہے جہاں وہ جو مرضی آئے کرتا پھرے اور اسے کوئی پوچھے نا۔'' بھابھی کو بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔
''ہمیں پولیس کو انفارم کرنا چاہیے، بھابھی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ژالے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی، مما سر جھکائے بیٹھی رہیں، ژالے پرنیاں سے پوچھ کر زینب کو سکون آور دوا کھلا کر لوٹا آئی تھی اب تینوں خواتین ژالے اور پرنیاں کے ساتھ لاؤنج میں تھیں۔
''آپ اتنی خاموش کیوں ہیں مما، پپا جان سے بات کریں، یہ معمولی مسئلہ نہیں ہے، وہ بدقماش انسان کچھ بھی غلط کر سکتا ہے خدانخواستہ۔'' پرنیاں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔
''انہوں نے جو مسئلے کا حل نکالا ہے، وہ اتنا آسان بھی نہیں ہے، میں بہت اپ سیٹ ہوں بیٹے اتنے دنوں سے ژالے سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر دیکھو خود میں حوصلہ نہیں پاتی۔'' مما بے حد رنجیدہ سے بولیں، تو بھابھی کے سوا وہ دونوں چونک اٹھی تھیں۔
''آپ کی بات ہو چکی ہے مما، کیا کہا ہے پپا نے؟'' پرنیاں ہی بولی تھی اس کے لہجے میں بہت واضح حیرت تھی، یہاں شاہ ہاؤس میں بات چھپانے کا رواج نہیں تھا، اس کی حیرت کی اصل وجہ بھی یہی تھی، مما جان کا موقف تھا، باتیں وہاں چھپائی جاتی ہیں جہاں اک دوسرے کے خلاف سازشیں تیار کی جاتی ہوں، یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔
''یہ بھائی جان کا فیصلہ ہے ان کا خیال ہے، زینب کا نکاح ہی بہترین سیفٹی دے سکتا ہے۔''
''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں پپا جان، کیا آپ کو ان پہ اعتراض ہے؟'' پرنیاں نے حیرت زدہ انداز میں انہیں دیکھا تھا، مما نے یاسیت بھرے انداز میں سر کو نفی میں جنبش دی تھی، پھر ژالے کو دیکھا جو سا

بیٹھی تھی، یوں جیسے پھانسی کی سزا کا منتظر قیدی، انہیں اس پہ ایکدم سے بہت رحم آیا، وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھیں، خود ان کا اپنا دل بھاری ہو رہا تھا۔
''ہم زینب کا نکاح جہان سے کرنا چاہتے ہیں اور ژالے بیٹے آپ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ آپ ہمیں اس کی اجازت......'' دیورانی کو مشکل میں پا کر مما جان نے خود دست سوال بہو کے آگے دراز کر دیا تھا، جہاں پرنیاں کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا، وہاں ژالے جیسے ایک دم سے تڑپ اٹھی، اس نے بے حد عاجزی سے روتی ہوئی مما جان کو سنبھالنے کی سعی کی تھی۔
''پلیز مما جان پلیز، مجھے گنہ گار مت کریں، میری کیا مجال کہ آپ کو اجازت دوں، آپ کے بیٹے ہیں شاہ، آپ کو پورا اختیار ہے ان کے لئے ہر فیصلہ کرنے کا۔'' وہ ان کے آنسو پونچھتے ہوئے جانے کس جذبے کے تحت خود بھی رو پڑی تھی، مما نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔
''ایسے مت کہو میری بچی بیوی ہو تم اس کی، ہماری مجبوری ہی ایسی ہے، حالات جس نہج پہ ہیں وہاں ہم دوسری بار بچی کو بیگانے ہاتھوں میں نہیں دے سکتے۔'' مما جان نے یونہی آنسو بہاتے ہوئے گویا وضاحت کی تھی۔
''جی میں سمجھ سکتی ہوں مما جان، بلکہ میں خود آپ سے اس سلسلے میں بات کرنے والی تھی، ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ کام کر لینا چاہیے، آپ شاہ سے بات کر لیجئے گا۔'' اس کے الفاظ نے مما اور مما جان کے ساتھ بھابھی کو بھی گنگ کر دیا تھا، مما جان اور مما کی طرح سے انہیں بھی یہ ہی توقع تھی کہ سب سے کٹھن مرحلہ ژالے کو قائل کرنے اور منانے کا ہی ہو گا، یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔
''تم سچ کہہ رہی ہو میری بچی؟'' مما جان کسی طرح بھی اپنی حیرت پہ قابو نہ رکھ سکی تھیں، ژالے زخمی سے انداز میں مسکرا دی۔
''مما جان کیا میں اس گھر کی فرد نہیں ہوں؟ کیا یہاں کی پریشانی سے میرا تعلق نہیں ہے؟ میں بھی جانتی ہوں یہاں شاہ کے علاوہ زینب کا نکاح کسی سے نہیں ہو سکتا، ایک جنید بھائی ہی ہیں نا، وہ تو بہت بڑے ہیں زینب آپی سے، زینب کے جوڑ کے تو شاہ ہی ہیں، پھر اپنے ہی اپنوں کو مشکل وقت میں سہارا دیتے ہیں۔'' اس کے جواب نے مما جان کی آنکھوں سے نیر بہا دیئے تھے، انہوں نے حیرت غیر یقینی عقیدت اور محبت سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی چومی تھی اور پھر گلے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔
''مجھے جہان کی خوش قسمتی پہ آج کوئی شبہ نہیں رہ گیا، تم نے ثابت کیا ہے بیٹا کہ تم جہان کی ہی بیوی بننے کے قابل تھیں، جیسا وہ خود ہے ایثار وفا محبت کا شاہکار ویسی ہی تم، عظیم اور بہترین عورت جو قربانی دینا جانتی ہے، تمہاری اس قربانی نے ہمارے دل جیت لئے بے مول خرید لیا ہے۔'' وہ بے اختیار رونے لگی تھیں، ماحول اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ مما اور بھابھی کے ساتھ پرنیاں کے بھی آنسو بہنے لگے، ژالے آہستگی سے ان سے الگ ہوئی پھر ان سب پہ ایک نگاہ ڈال کر دانستہ مسکرائی تھی۔
''سب سے پہلے تو آپ یہ خیال دل سے نکال دیں مما جان کہ میں نے کوئی قربانی دی ہے، ایسا نہیں ہے، خدانخواستہ میں شاہ کو چھوڑ کر نہیں جا رہی، محض انہیں شادی کی اجازت دے رہی ہوں اور

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جب ضرورت پڑنے پہ ایک مرد کو ایک سے زائد خواتین کا نکاح میں لینا پڑا۔" وہ رواداری سے بولی تھی، پرنیاں کی نگاہوں میں واضح حیرت اتر آئی، وہ چھوٹی سی نازک سی لڑکی کتنے بڑے حوصلے کی مالک تھی، بظاہر جتنی نازک لگتی تھی اس کی ہمتیں اس قدر بلند اور عزم اتنا پختہ تھا، یہ اس کی انکساری ہی تھی کہ وہ پھر بھی عجز کا مظاہرہ کر رہی تھی، شاید اس کی جگہ وہ خود ہوتی تو یا خود مر جاتی یا معاذ کی جان لے لیتی مگر کبھی اسے دوسری شادی نہ کرنے دیتی، اس نے تو ایک معمولی بات پہ اتنا طوفان اٹھایا تھا کہ اب تک ان کے تعلقات میں سرد مہری چل رہی تھی، حالانکہ دیکھا جاتا تو معاذ نے اپنا حق استعمال کیا تھا شوہر تھا وہ اس کا، کوئی جرم نہیں کیا تھا مگر پرنیاں نے اتنا واویلا کیا تھا کہ اسے مجرم بنا کر رکھ دیا تھا، اگر غلطی پہ معاذ تھا تو درست وہ بھی نہیں تھی، نیک بیویاں اس جیسی نہیں یقیناً ژالے جیسی ہوتی ہیں، خدا اور شوہر دونوں کی رضا میں راضی رہنے والی، اسے نے پہلے شوہر کو خفا کیا پھر خدا کو بھی...... کتنی بار اس عرصے میں معاذ نے پیش رفت کی تھی اس کی طرف مگر وہ ہر بار اس کو جھٹک چکی تھی، حالانکہ وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکی تھی، "شوہر کے بلاوے پہ انکار کرنے والی عورت پہ فرشتے لعنت بھیجا کرتے ہیں۔"

جبکہ وہ خود کو ہر لمحہ مظلوم سمجھتی رہی تھی، اسے معاذ سے جو بھی شکایت ہوئی تھی اس نے کبھی اس سے وضاحت نہیں مانگی تھی، ہمیشہ بدگمانی سے سوچا اور بس اس سے جھگڑا کیا تھا، کسی سیانے نے کہا ہے مرد کو جب گھر پہ توجہ اور محبت نہیں ملے گی وہ باہر کا رخ کرے گا، اگر معاذ بھٹک بھی تھا تو اس کی وجہ وہ خود تھی۔

عجیب سی شرمندگی اور ندامت نے اس کا حصار کر لیا، وہ اپنی سوچوں میں کچھ اس طرح کھوئی تھی گویا ماحول سے کٹ گئی، ژالے کے فیصلے نے اس کو گویا خواب غفلت سے جگا دیا تھا۔

☆☆☆

"کل تم تیار رہنا میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہے، وہ تمہیں ٹریٹمنٹ دیں گے۔" جہان نماز پڑھ کر آیا تو بستر کی چادر بچھاتی ژالے کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"آپ خوامخواہ تردد کرتے ہیں شاہ۔" اس نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا تھا پھر کسی قدر اکتا کر بولی تھی۔

"کیا مطلب ہے تردد؟" جہان نے تیوری چڑھائی۔

"مطلب یہ کہ زندگی تو اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اللہ نے لکھ دی، یہ ٹریٹمنٹ یہ علاج زندگی نہیں بڑھا سکتے۔" وہ پتہ نہیں اتنی ہی صبر و استقامت کی تصویر تھی یا پھر بے حس ہو گئی تھی کہ اتنے نارمل انداز میں اپنی موت کے موضوع کو ڈسکس کر لیا کرتی، جہان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"دعا تقدیر بدل سکتی ہے ژالے، میں اللہ سے ہر صورت تمہاری زندگی مانگ رہا ہوں گا۔" اس کے لہجے میں آخر میں آ کر ضدی بچوں کی سی دھونس آ گئی تھی، جس نے ژالے کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"میں خود یہ چاہتی ہوں شاہ کہ بہت لمبی زندگی آپ کے ساتھ جیئوں، آپ سے دوری مجھے اتنی گراں گزرتی ہے کہ مما کے گھر بھی جانے کو دل نہیں کرتا، یہ دیکھیں آج میں نے ساڑھی پہنی ہے آپ کو دکھانے کو۔" اس نے اپنی ساڑھی کا پہلو لہرایا، جہان کی آنکھیں ایکدم سے لو دینے لگیں۔

"یہ خصوصی اہتمام خصوصی تقاضا بھی رکھتا ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے کہتا اس کے

نزدیک آ گیا، ژالے کی پلکیں حیا بار انداز میں لرز کر عارضوں پہ جھک گئیں۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا جب عورت کو اپنے شوہر سے بات منوانی ہو تب بھی وہ اس طرح کا اہتمام کرتی ہے۔" ژالے کے جواب نے جہان کو ایک دم سے سنجیدگی کے حصار میں مقید کر ڈالا تھا۔

"کون سی بات منوانا چاہتی ہو؟" اس نے رکھائی سے کہا تو ژالے عاجز ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ جانتے تو ہیں شاہ۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو ژالے، اک طرف کہتی ہو مجھ سے دوری گراں گزرتی ہے دوسری جانب مجھے کسی اور کے حوالے کرنے پہ بضد ہو، تمہیں نہیں لگتا تمہارے قول و فعل میں کس حد تک تضاد ہے۔" وہ بھڑک اٹھا تھا، اسے ژالے سے بہت شدت سے یہ شکایت پیدا ہوئی تھی کہ وہ اب اکثر یہ موضوع چھیڑ کر اس کا موڈ خراب کیے رکھتی تھی۔

"زینب آپا کوئی اور نہیں ہیں، آپ کی محبت ہیں۔"

"شٹ اپ ژالے جسٹ شٹ اپ، آج کے بعد میں یہ بات نہ سنوں تمہارے منہ سے۔" جہان نے ساری زندگی کا غصہ جیسے اسی ایک لمحے میں آیا تھا، اس کا لہجہ و انداز اتنا شدید تھا کہ ژالے بری طرح سے سہم کر رہ گئی، وہ سارا اعتماد وہ سارا مان جو اس پہ حاصل ہوا تھا ژالے کو جیسے اس ایک لمحے میں ہوا ہو کر رہ گیا، اب وہ پھر جیسے وہی کنفیوژڈ سی ژالے تھی جو اس سے کوئی تعلق بندھنے سے پہلے تھی، جہان کو اپنے رویے کی سختی کا احساس ہوا تو ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا، ژالے کی چھلکتی آنکھیں، خوف سے پیلی پڑی رنگت اسے شرمسار کر کے رکھ گئی تھی۔

"آئی ایم ساری ژالے، بٹ تمہیں خود بھی خیال کرنا چاہیے نا، اک بات جو تمہیں پتہ چل گئی کسی بھی طرح اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دو۔" جہان نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے حد مدھم لہجے میں کہنا شروع کیا تھا۔

"میں آپ کو بلیک میل کیوں کروں گی شاہ؟ مجھے یہ بات کتنے عرصے سے معلوم تھی مگر کبھی آپ سے تذکرہ بھی نہیں کیا، اب اگر میں کہہ رہی ہوں تو کیوں؟ یہ وقت کی ضرورت ہے شاہ آپ بھی تو سمجھیں۔" ژالے اس کے سینے میں منہ چھپا کر بے حد تلخی سے کہہ رہی تھی، جہان نے ہونٹ بھینچ لئے، پھر بہت دیر کے بعد جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں سنجیدگی اور گمبھیرتا تھی۔

"تم مجھے پتہ نہیں کیا سمجھ رہی ہو ژالے، مگر میں تمہیں لازماً بتانا چاہوں گا کہ میں انسان ہوں نہ کہ فرشتہ، انسان بھی بے حد عام سا ہوں، دوسری شادی مذاق نہیں ہوتی، کسوٹی ہوتی ہے مرد کے لئے، پل صراط ہے یہ، ایک سے زائد شادیاں مرد کے لئے ڈھیل نہیں پکڑ ہیں، اس میں مرد کی آزادی نہیں مرد کی آزمائش ہے، بہت بڑی آزمائش، ہمیں یہ تو یاد رہتا ہے کہ ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے مگر ایسا کہتا یا کرنے والے کہ یہ بھول جاتا ہے بیویوں کے بیچ انصاف بھی رکھنا ہے اور یہ بہت مشکل کام ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پہ پورا اترنا ہرگز آسان نہیں، اگر ہم یہ جان لیں تاکہ یہ کتنا مشکل کام ہے، تو دوسری شادی کا نہ سوچیں، میں جانتا ہوں مجھ جیسا عام سا انسان دو بیویوں کے درمیان انصاف اور توازن نہیں رکھ سکے گا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ یوں چپ ہو گیا جیسے بہت تھک گیا ہو، وہ ژالے کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس

میں اور زینب میں کیا فرق ہے، ژالے وہ تھی جو زبردستی اس کی زندگی میں داخل کی گئی تھی، پھر اس نے اپنی فطرت کی نیکی اچھائی اور محبت سے اسے اسیر کرلیا تھا جبکہ زینب اپنی تمام تر بے نیازی بدتمیزی اور بے رغبتی کے باوجود اس کی رگ جاں میں بستی تھی، اسے زینب سے صرف محبت نہیں تھی وہ اس کے لئے لحہ لحہ ترسا اور تڑپا تھا۔

دیوانگی کی حدوں کو چھوا تھا اس کی چاہ میں اس نے، پھر یہ ممکن تھا کہ وہ اسے ملتی اور جہان اس کے آگے ژالے کو فراموش نہ کر دیتا، وہ اس چیز سے خائف تھا، وہ ایک بار پھر اپنی آزمائش نہیں چاہتا تھا، جبکہ ژالے اور دیگر لوگ اس کے پس وپیش کو اس کی انا سے تعبیر کر رہے تھے۔

''جب کوئی کام خدا کی رضا کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے تو اللہ اس کام میں خود مددگار ہو جایا کرتا ہے شاہ، آپ پریشان نہ ہوں، ہم سب کو دعائیں اور تعاون آپ کے ساتھ ہے، مما جان نے خود میرے آگے ہاتھ پھیلایا ہے، آپ کو مانگا ہے مجھ سے، مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔'' وہ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر اسے کہنا پڑا تھا، جہان بری طرح سے چونکا کچھ دیر غیر یقینی سے اسے دیکھتا رہا پھر نگاہ کا زاویہ بدلتے ہوئے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

☆☆☆

وہ ہمسفر تھا مگر اس سے ہمنوائی نہ تھی
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا جدائی نہ تھی
عداوتیں تھیں تغافل تھا رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا بے وفائی نہ تھی
بچھڑتے لمحے ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل
غزل بھی وہ جو کسی کو کبھی سنائی نہ تھی
کبھی یہ حال کہ دونوں میں یک دلی تھی بہت
کبھی یہ مرحلہ جیسے کہ آشنائی نہ تھی
جنوں کا سفر کچھ اس طرح بھی گزرا ہے
شکستہ دل تھے مسافر شکست پائی نہ تھی

ریوالنگ چیئر پہ جھولتا وہ سگریٹ کے دھویں کے مرغولے بنا رہا تھا، بیک سائیڈ ٹیبل پہ دھیمے سروں میں عینی کی آواز گونج رہی تھی جب معاذ نے اندر قدم رکھا۔

''امیزنگ، بڑے ٹھاٹ ہیں، پپا کو پتہ چلے صاحب بہادر کام کی بجائے یہ شغل فرما رہے ہیں تو نہال ہو کر تمہاری سیلری میں اضافہ کر دیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہہ کر جہان کے کاندھے پہ ہاتھ مارا تھا۔

''چائے پیوؤ گے یا کافی منگواؤں؟'' جہان نے پہلے ٹیپ بند کیا تھا، پھر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر فرصت سے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں میں صرف تمہارے پاس تم سے ملنے آیا تھا، مگر یہ تو نظر ہی نہیں آتے، یار ہم نے صرف اک آپشن رکھا تھا تمہارے سامنے، تمہیں فورس تو نہیں کیا تھا، کیوں بھاگ رہے ہو بھلا؟'' وہ نا چاہتے

ہوئے بھی شکوہ کر گیا، جہان کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزرا تھا۔

''ایسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے۔''

''گڈ ہونی بھی نہیں چاہیے، تم ٹینشن مت لو یار، سمجھنا ہم نے تم سے کبھی ایسی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔'' معاذ کے رسان سے کہنے پر جہان زور سے چونکا تھا، اس سے پہلے کہ کچھ کہتا اس کا سیل فون گنگنا اٹھا، جہان نے کوٹ کی جیب سے سیل فون برآمد کیا، ژالے کا میسج تھا، اس نے دھیان سے پڑھنا شروع کیا شاید معاذ کے سامنے سے اس کے سوال کے جواب سے بچنے کی یہ لاشعوری کوشش تھی مگر ژالے کی بھیجی نظم کو پڑھ کر وہ مزید بے بسی محسوس کرنے لگا تھا۔

آج کے دن میں ہوں تمہاری محفل میں
آج کا دن نہ یوں برباد کرو
پھر کسے فرصت ہے کہ یوں
تمہیں پانے تمہیں چھونے کا سفر اختیار کرے
بچھڑنے کے لحات کو یوں بے ثمر نہ گزرنے دو کہ
میرے مرنے کے بعد تمہیں اک تشنگی کا احساس رہے
اور اس دوسرے جہاں میں میرا یہ کم مایہ دل
تمہاری آنکھوں کی طرح سے ناشاد رہے

جہان کی آنکھیں ایک دم سے جل اٹھیں، وہ سمجھ سکتا تھا وہ اسے کیا کہنا چاہتی ہے۔

''واٹ ہیپنڈ؟ آر یو او کے؟'' معاذ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو قطعی نہیں سمجھ پایا تھا جبھی پریشانی کی کیفیت میں بولا، جہان نے چونک کر اسے دیکھا تھا، اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

''تمہیں پپا جان نے جو ذمہ داری سونپی تھی، معاذ اگر تم اس میں سرخرو ہو جاؤ تو تمہیں بھی بہت اچھا لگے گا نا؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا تھا، معاذ حیران سا اسے دیکھنے لگا۔

''انہیں آج میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دینا کہ جہان آج بھی ان کی کسی توقع اور امید کو مایوسی کی نذر نہیں ہونے دے سکتا، مجھے آج بھی ان کے حکم پہ سر جھکانا اچھا لگے گا، اس کے باوجود کہ زینب کو آج بھی شاید اس اقدام پہ اعتراض ہوگا۔'' اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بھی ایک عجیب سی سرد مہری اور بیگانگی تھی، جسے معاذ نے اپنی حیرت بھری خوشی میں محسوس ہی نہیں کیا، وہ ایکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر جہان سے لپٹ گیا تھا۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو جے، یو آر گریٹ سویٹ ہارٹ۔'' شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی، گو کہ وہ دل سے خود جہان کے ساتھ تھا مگر جہان کی طویل خاموشی پہ وہ بھی اس سے شاکی ہو گیا تھا مگر جہان کے فیصلے نے صحیح معنوں میں اسے ممنون کرنے کے ساتھ اسے اس کی اچھائی کا معترف کر دیا تھا، جبکہ اس کی بات کے جواب میں جہان کے ہونٹوں پہ زخمی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

(اچھے ہونے اور اچھا بننے میں بہت فرق ہے معاذ، مجھے آج تک اپنی اچھائی کا احساس تھا نہ اندازہ، مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں چل سکا تھا میری عادات کی وجہ سے میں اپنوں کی کتنی امیدوں کا مرکز بن گیا

ہوں، کچھ کام ہم دوسروں کے لئے کرتے ہیں کچھ محض اپنی خوشی کی خاطر، مجھے نہیں پتہ یہ میں نے کیوں کیا، ہاں شاید میں ایک بار پھر اپنوں کی امیدوں کو جو مجھ سے وابستہ تھی توڑ نہیں سکا)۔

☆☆☆

وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا، کاٹن کے سفید کلف شدہ سوٹ میں اس کے دراز غضب کی مضبوط کسرتی وجود پہ بے انتہا جچ رہا تھا، آج شام کو اس کا زینب سے نکاح تھا اور ژالے کل ہی لاہور چلی گئی تھی، حالانکہ جہان ہرگز بھی آمادہ نہیں تھا۔

''مما مجھے کتنے عرصے سے بلا رہی تھیں شاہ جانتے تو ہیں آپ، اچھا ہے میں کچھ دن وہاں گزار لوں گی۔'' وہ کتنے حوصلے سے مسکرائی تھی، حالانکہ جہان کو بارہا مرتبہ لگا تھا اس کی نم پلکوں سے کہ وہ جیسے بہت سارا روئی ہو، جب اس نے ژالے پہ گرفت کی تھی تو وہ کتنی معصومیت سے بولی تھی۔

''آپ نے ازواجات مطہرات پہ مبنی واقعات کی بک پڑھی ہے شاہ؟ میں نے پڑھی ہے ایک بار نہیں کئی مرتبہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواجات مطہرات بھی آپس میں ایک دوسرے سے رقابت محسوس کرتی تھیں، حالانکہ بلاشبہ وہ سب ہی تمام خواتین سے افضل ہیں اور درجات میں اعلیٰ مقام پہ، پہلے میں بہت حیران ہوئی تھی مگر پھر...... مجھے سمجھ آگئی، پتہ ہے کیا شاہ؟ رقابت کی وجہ اور وہ تھے ان کے اعلیٰ وافضل شوہر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بھلا اتنے بے مثال اور بہترین انسان کو کون چاہے گا کہ اپنے ساتھ اور سے شیئر کرے، مگر یہ حکم خداوندی تھا، جس پہ سر جھکانا لازم، جبکہ وہ ان بی بیوں کی محبت تھی جو شراکت پہ دل کو تنگ کرتی تھی تو اس جذبے کو جنم دیتی تھی، اس میں انسانی فطرت کا بھی گہرا عمل دخل نظر آتا ہے، میرے یہ آنسو میری فطرت کا تقاضا ہیں جبکہ آپ کو اجازت دینا اور اس امر پہ رضا مند کرانا حکم خداوندی کی تعمیل۔'' اتنا مفصل اور جامع جواب جہان نے تو اس کی فہم وفراست پہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''تم خاص ہو نی اور بلاشبہ مجھے تم پہ فخر ہے۔'' جہان نے بے اختیار بہت جذب سے اسے اپنے ساتھ لگا کر بھینچا تھا۔

''زینب آپی بہت سخت اور تلخ تجربے سے گزری ہیں شاہ، اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ نے نہ صرف ان کے زخموں پہ مرہم رکھنے ہیں بلکہ ان کی سوچ کو بھی بدلنا ہے جو مردوں کے متعلق ان کے دل ودماغ میں گھر کر گئی ہے۔'' اس نصیحت نے جہان کو چپ لگا دی تھی۔

''میں تمہیں بہت مس کروں گا، جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا، بلکہ میں خود آ جاؤں گا لینے۔'' اس نے دانستہ اس کی بات سے تجاہل برتا تھا، ژالے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں بہت عرصے بعد ممی کے پاس جا رہی ہوں شاہ، وعدہ کریں مجھے میری مرضی کے مطابق رہنے دیں گے۔'' وہ کتنی عاجزی سے کہہ رہی تھی، مگر جہان جانتا تھا اس وقت وہ کتنے کرب سے گزر رہی تھی، اس کے دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔

''سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہو رہا ہے ژالے، یہ بھی سہی۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گیا تھا، ژالے جبراً مسکرائی تھی۔

''میں جانتی ہوں آپ بہت بہادر ہیں، بہت انصاف پسند، مجھے اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔''

جہان نے اب کے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے ہونٹوں کو باہم بھینچ لیا تھا۔

''جہان بھائی آ جائیں، وہاں ڈرائینگ روم میں سب آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔'' دروازہ تھپتھپا کر زیاد نے اندر جھانک کر پیغام دیا، جہان اپنی سوچوں سے چونک کر باہر آیا تھا اور ایک سرد آہ کھینچی، کچھ کہے بغیر اس نے زیاد کی تقلید میں قدموں کو اٹھایا تھا، مختلف راہداریاں اور سیڑھیاں عبور کر کے وہ ڈرائینگ روم میں آ گیا، جہاں پپا نے اٹھ کر اسے اپنے بازو کے حصار میں لے کر نہایت شفقت بھرے انداز میں پیشانی چومی تھی، وہ یونہی لب بستہ ان کے پہلو میں بیٹھ گیا، مولانا صاحب کی آمد ہو چکی تھی اگلے چند لمحوں میں نکاح کی سنت کی ادائیگی کا آغاز ہوا اور کاروائی شروع کی گئی، جہان کے احساسات عجیب سے ہونے لگے، بہت پرانی بات نہیں تھی جب یہ اس قسم کی بات کے متعلق سوچ کر ہی اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جایا کرتی تھیں، زینب کے حوالے سے ہر سوچ اور خواہش دل موہ لیتی اور دلربائی رکھتی تھی، مگر اب ایک عجیب سی بے حسی اس پہ طاری ہو چکی تھی، نکاح ہوا اس کے بعد وہاں سب اس سمیت ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے، اس کے ساکن ومنجمد ذہن میں ایک نظم کے مصرعے گونجنے لگے۔

میرے چھوٹے سے آنگن میں تمہیں وحشت سی ہوتی تھی
مجھے تم نے بتایا تھا کسی کی قید میں رہنا
تمہیں اچھا نہیں لگتا
میں اک آزاد پنچھی ہوں
پھر جس کو تم نے چاہا تھا
وفا کے نام سے اس کو بہت وحشت سی ہوتی تھی
وہ اک آزاد پنچھی تھا
کسی کی قید میں رہنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا
سنا ہے تم پشیماں ہو
چلو پھر ایسا کرتے ہیں
نیا آغاز کرتے ہیں
محبت پھر سے کرتے ہیں

''میری دعا ہے اللہ تمہاری زندگی کا یہ نیا سفر مبارک کرے، آمین۔'' پپا اور پپا جان کے بعد معاذ نے اسے گلے لگایا تو بے حد خلوص سے کہا تھا، جہان نے جواباً گہرا سانس بھرا تھا اور سر جھکا لیا تھا، اس کی تسلی کی خاطر کچھ بھی عہد وپیاں کیسے بنتا۔

☆☆☆

''تھوڑا سا کھانا تو کھا لو زینب۔'' نوریہ اس کے سامنے بیٹھی بے حد اصرار بھری عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' اس نے مخصوص قسم کے روٹھے پن سے جواب دیا تھا، اس کا موڈ بری طرح سے بگڑا ہوا تھا، ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ اس کے اعصاب پہ حملہ آور ہو چکی تھی، جب مما نے آج بالکل اچانک اس پہ اس فیصلے کو مسلط کیا تو صحیح معنوں میں وہ ہکا بکا سی ان کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

''جو بھی بیچ کے مرحلے میں ہوا اس کو بھول کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا ہے آپ کو زینب، وقت نے ثابت کر دیا کہ آپ کے لئے جہان ہی بہترین انتخاب تھا مگر خیر......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وقتی طور اس کی تمام صلاحیتیں ہی سلب ہو گئی تھیں گویا۔

''کیسے بھول جاؤں ممی، اس فیصلے میں مزید تین افراد انوالو ہو چکے ہیں، ژالے، تیمور اور فاطمہ اور میں...... مجھے یہ شادی نہیں کرنی ہے سے تو بالکل نہیں۔''

وہ پتہ نہیں کس جذبے کے تحت رو پڑی تھی مگر مما کو اس پہ بے تحاشا غصہ آ گیا تھا۔

''اپنی زبان کے انکار کو یہیں روک لو زینب، اب اگر اس سے کوئی نازیبا بات نکلی تو یاد رکھنا اس مرتبہ میں اس ذلت کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی، مر جاؤں گی کچھ کھا کر۔'' ان کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے، ان کے لہجے میں قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی، زینب نے کبھی انہیں چیختے نہیں سنا تھا مگر اب پتہ نہیں کس طرح ان کا ضبط جواب دے گیا تھا کہ وہ چیخ پڑی تھیں۔

''ذلت اور دکھ کی گہرائیوں میں تو اتار چکی تم اور کتنا نقصان کرانا چاہتی ہو؟ اس لفنگے بدمعاش کو عذاب بنا کر ہمارے سروں پہ مسلط کر دیا، ہم اس معاملے کو خوش اسلوبی سے نپٹانا چاہتے ہیں مگر تمہیں شاید ہمیں قبر میں اتار کر سکون ملے گا۔''

زینب نے ایک لفظ نہیں نکالا تھا پھر منہ سے، ممانے نکاح کے لئے اس کے لئے پنک جوڑا منتخب کیا تھا جس پہ جھلملاتی چوڑی پٹی چہار اطراف لگی تھی جس کا رنگ کاہی مائل تھا، گلابی چوڑی پاجامے اور لمبی قمیض پہ بھی کاہی مائل سبز دامن تھا جس پہ کامدار کا کام تھا، نوریہ اور پرنیاں نے مل کر اسے گھر پہ ہی تیار کیا تھا، ذرا سی توجہ نے ہی اس کا روپ نکھار دیا تھا، اس کے ہاتھوں پہ مہندی بھی لگائی تھی، وہ اگر پتھر کی مورتی میں ڈھل گئی تھی تو نوریہ اور پرنیاں بھی بے حد گم صم اور خاموش تھیں، لگتا ہی نہ تھا یہ شادی یا نکاح کی تقریب ہے، نہ خوشی نہ ہنسی مذاق نہ ڈھولک جیسے ایک فرض نبھایا گیا تھا، بہت خاموشی اور راز داری کے ساتھ، بھوک کے باوجود اس نے کھانا نہ کھا کر اپنا غصہ ظاہر کیا تھا مگر ممانے پرواہ نہیں کی تھی، ان کی ڈھیل نے اب تک اسے بگاڑا ہی تھا۔

''فاطمہ کو مجھے دے جاؤ۔'' نوریہ مما کی ہدایت پہ اسے جہان کے کمرے میں چھوڑ کر واپس جانے لگی تب زینب نے اسے مخاطب کیا تھا، نوریہ مخمصے میں پڑ گئی۔

''فاطمہ ممانی کے پاس ہے، انہوں نے سلا دیا ہے اس کو، تم بے فکر رہو، اس کی طرف سے۔''

''میں نے تم سے وضاحت نہیں مانگی ہے نوریہ، فاطمہ کو اگر تم مجھ تک نہیں لا سکتیں تو بتا دو، میں خود لے آؤں گی۔'' زینب اس کی بات کاٹ کر پھنکاری تھی، نوریہ نے ایک دم سے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

(جاری ہے)

زویا کو بے بی سیٹ پہ بٹھا کر، شفق اپنی پلیٹ میں موجود چاول کے چھوٹے چھوٹے نوالے اسے چمچ کے ذریعے کھلا رہی تھی، مگر چار سالہ زویا کی پوری کوشش تھی کہ وہ چمچ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر خود سے چاول کھائے اسی کوشش میں وہ مسلسل ہاتھ چلا رہی تھی، دوسرے ہاتھ میں اس نے کھیرے کا ٹکڑا پکڑا ہوا تھا، جس کی بمشکل اس نے دو سے تین بائٹس لی تھیں۔

شفق نے ایک نظر بھرے ہوئے ہال پہ ڈالی، ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے ''ریسورنٹ'' میں بوفے ڈنر کے لئے آنے والوں کا کافی رش تھا۔

لوگوں کے ہنستے مسکراتے، خوش باش چہروں کو دیکھتی، شفق نے بے اختیار سوچا۔

''کیا زندگی سچ میں اتنی خوش خوبصورت اور بے فکری سے بھری ہوئی بھی ہوتی ہے؟''

''ایکسکیوزمی مس......؟'' اسی وقت کسی نے شفق کو متوجہ کیا۔

''اگر میں غلط نہیں تو آپ مشہور رائٹر ''شفق مرتضٰی'' ہیں۔''

ایک بہت ہی وجیہہ اور سوبر نظر آنے والے شخص نے اس کی میز کے پاس آ کر کہا۔

شفق نے چونک کر نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، سامنے کھڑے شخص کی عمر ساٹھ کے قریب تھی، ان کا انداز بہت مہذب اور شائستہ تھا، ان کے حلیے سے، ان کی امارت کا پتا چلتا تھا۔

''جی سر! مگر آپ، سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟'' شفق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا، بہ حیثیت رائٹر کے اسے بہت کم لوگ چہرے سے پہچانتے تھے، اس لئے اس شخص کا اسے پہچان جانا، اس کی الجھن کا باعث بن رہا تھا۔

''آپ مجھے نہیں جانتیں، مگر میں آپ کو جانتا ہوں، آپ کی تحریروں سے تو بہت پہلے کا واقف تھا، مگر بائے فیس آپ کو، کچھ دن پہلے پی سی میں منعقد ہونے والی ایک ادبی کانفرنس میں دیکھا تھا، آئی ایم سرپرائزڈ کہ اپنی تحریروں کی پختگی اور میچور پن کے برعکس، آپ کافی کم عمر ہیں۔'' سامنے کھڑے شخص نے وضاحت سے بتاتے ہوئے، آخر میں مسکراتے ہوئے، شفق سے کہا تو اپنی تعریف پہ شفق جھینپ گئی اور مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کرنے لگی، اس کی یہ الجھن دور ہو گئی تھی کہ ان صاحب نے، بہ حیثیت رائٹر کے کس طرح اسے پہچان لیا تھا۔

''شفق کیا ہوا؟ یہ صاحب......'' اسی وقت موحد اسماء اور عمیر کے ساتھ کھانا ڈال کر واپس آیا تو شفق کے پاس کسی انجان شخص کو کھڑا دیکھ کر بے اختیار پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں بھائی دراصل یہ......'' شفق نے کچھ کہنا چاہا کہ اس شخص نے آگے بڑھ کر موحد سے ہاتھ ملاتے ہوئے، اپنا تعارف کروانے لگا۔

''میرا نام میر زمان بیگ ہے ''زمان انڈسٹریز'' کا اونر ہوں۔'' زمان انڈسٹریز کے نام پہ چونک کر موحد نے ان کی طرف دیکھا۔

''او اچھا اسی لئے میں سوچ رہا تھا کہ آپ کا فیس اتنا دیکھا دیکھا سا کیوں لگ رہا ہے، آپ تو کافی مشہور معروف شخصیت ہیں، بیٹھیے پلیز۔'' موحد نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ شکریہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے۔

''آئی ایم ساری! آئی نو کہ یہ آپ لوگوں کا فیملی ڈنر ہے، مگر میں آپ لوگوں کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔'' میر زمان بیگ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور شفق کی طرف متوجہ ہو گئے، جو خاموش بیٹھی ان کی اگلی بات کی منتظر تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ بہ حیثیت رائٹر کے لوگ

آپ کو بہت پسند کرتے ہیں، آپ کی تحریروں کے دیوانے ہیں، آپ بلاشبہ بہت اچھی رائٹر ہیں مگر......؟'' میر زمان بیگ نے توقف کیا، شفق نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''مگر میرے لئے آپ صرف ایک رائٹر نہیں ہیں، بلکہ میری زندگی کے اندھیروں میں چمکنے والی امید کی وہ پہلی و آخری کرن ہیں جس نے میرے گھر کے اندھیروں کو بہت حد تک کم کر دیا ہے۔'' میر زمان بیگ نے جذب کے عالم میں کہا تو شفق نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''سوری سر! میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' شفق نے سنجیدگی سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا، موحد اور اسماء بھی الجھن بھرے انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے۔

''ایک منٹ، اس سے پہلے کہ آپ لوگ کچھ غلط سمجھیں میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔'' میر زمان بیگ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا اور بولے۔

''میرے دو بیٹے ہیں، اپنی شریک حیات کی موت کے بعد میں نے انہیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی پوری کوشش کی، کیونکہ بہت چھوٹی عمر میں ہی وہ ماں جیسی ہستی سے محروم ہو گئے تھے، میرا بڑا بیٹا صغرام، ماشاءاللہ اپنی زندگی میں بہت سیٹ اور خوش ہے، وہ اور اس کی بیوی حرا اور دو پیارے پیارے بچے، میرے گھر کی رونق ہیں مگر......'' میر زمان بیگ نے گہری سانس لی۔

''میرا چھوٹا بیٹا کچھ سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں، اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھا تھا، میرا بیٹا زندگی اور امیدوں سے بھرپور جان محفل، دوستوں کا دوست، جس کے دم سے ان کی محفلیں آباد ہوتی تھیں، اس حادثے کے باعث بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا تھا، اس نے سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، مایوسی اور تلخی اس کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔'' میر زمان بیگ نے اپنی نم آنکھوں کو ٹشو سے صاف کیا، اپنی چہتی اور لاڈلی اولاد کو ایسی حالت میں دیکھنا، ہر ماں باپ کے لئے بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے، وہ اولاد جس کے لئے والدین نے کئی خواب دیکھے ہوتے ہیں۔

''سو سیڈ سر!'' موحد نے افسردگی سے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا، جبکہ شفق ساکت نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''میرے بیٹے نے اپنی زندگی کے تین سال اسی مایوسی اور اندھیرے کے ساتھ گزار دیئے، یہ وہ وقت تھا جس کے لئے ہم باپ بیٹے نے بہت کچھ سوچا ہوا تھا، بہت خواب دیکھے ہوئے تھے مگر سب خاک میں مل گئے اور ان اندھیروں نے میرے بیٹے کی ہر امید، ہر خواب کو نگل لیا حتیٰ کہ اس نے باہر جا کر، نقلی ٹانگ لگوانے سے انکار کر دیا، ڈاکٹرز نے بہت امید دلائی تھی کہ ٹانگ لگوانے کے بعد وہ نارمل لائف گزارنے کے قابل ہو جائے گا مگر اس نے انکار کر دیا، نجانے وہ خود سے اتنا مایوس کیوں ہو گیا تھا اور شاید وہ ایسے ہی رہتا مگر آپ کی تحریریں پڑھ کر وہ آہستہ آہستہ کر کے زندگی کی طرف لوٹنے لگا ہے، آپ جانتی ہیں شفق کہ......'' میر زمان بیگ نے نم آنکھوں کے ساتھ پرجوش لہجے میں گم صم بیٹھی شفق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اس نے آپ کی ہر تحریر چاہے کسی میگزین میں چھپی ہو یا کتابی شکل میں، ہر تحریر اس نے محفوظ کر کے رکھی ہوئی ہے، وہ آپ کی ہر تحریر کو بار بار پڑھتا ہے، اس وقت اس کے چہرے پہ بہت خوبصورت مسکراہٹ ہوتی ہے، جیسے ساری دنیا اس کے پاس ہو، آپ کے لفظوں میں وہ جادو

وہ اثر ہے جس نے اس کے مردہ تن میں زندگی کی حرارت بھر دی ہے، اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی آپ کی تحریروں کو پڑھا اور آپ جانتی ہیں کہ میں بہت بار حیران رہ گیا، آپ کی اور میرے بیٹے کی سوچ، خیالات، خواہشات، امیدیں سب ایک جیسی نظر آتی ہیں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں حادثے سے پہلے کا اپنے بیٹے سے باتیں کر رہا ہوں، بلیوی، وہ بھی بالکل ایسے ہی سوچتا تھا، زندگی کے لئے، جیسے آپ اکثر اپنی تحریروں میں بیان کرتی ہیں، میں نہیں جانتا کہ یہ کیسا اتفاق ہے، مگر اس اتفاق نے مجھے میرا بیٹا لوٹا دیا ہے اب ہم دونوں اکثر اکٹھے بیٹھ کر، آپ کی تحریروں پر تبصرے کرتے ہیں، اس وقت میں خاموش ہو جاتا ہوں اور میرا بیٹا بے تکان بولتا ہے، خوش ہوتا ہے اس کے اندر کی تلخی اور مایوسی کہیں چھپ گئی ہو جیسے، وہ آپ کے لفظوں میں جیتا ہے اسی لئے میرے لئے آپ صرف ''رائٹر'' نہیں ہیں بلکہ میرے رب کا وہ ذریعہ ثابت ہوئیں ہیں جس نے مجھے میرا بیٹا لوٹا دیا ہے۔'' میر زمان بیگ نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔

تو اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو دھیرے سے صاف کرتی شفق اداسی سے مسکرا دی۔

زندگی بھی کبھی کبھی کیسے کیسے اتفاقات پیدا کر دیتی ہے ہم جہاں اپنا سب کچھ ہار کر نا امید ہو کر بیٹھ جاتے ہیں وہاں ہی سے امید کی کرن نمودار ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ۔

''ابھی میں ہوں، زندگی کی نئی ابتداء کرنے کے لئے، اسے نمو دینے کے لئے۔''

''بیٹا! میں کافی عرصے سے آپ کی تلاش میں تھا، مگر ناکام رہا کیونکہ آپ کسی سے نہیں ملتی تھی، مگر اس دن ادبی کانفرنس میں آپ کو دیکھا، آپ سے ملنے کی کوشش کی، مگر تب تک آپ جا چکیں تھیں، سو آج آپ کو یہاں دیکھا تو خود کو روک نہیں پایا، پلیز آپ میرا ایک کام کر دیں، اسے ایک مجبور باپ کی استدعا سمجھ لیں۔'' میر زمان بیگ نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔

''جی آپ فرمایئے مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں آپ کی مدد ضرور کروں گی۔'' شفق نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو بیٹا، میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''میرا بیٹا آپ کی وجہ سے زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اس آپریشن کے لئے راضی کر دیں جس کے بعد وہ کسی حد تک نارمل لوگوں کی طرح زندگی گزار سکے گا، مجھے امید ہے کہ وہ کبھی بھی آپ کے کہے کو نہیں ٹالے گا، میرا دل کہتا ہے کہ آپ کے پاس لفظوں کا وہ منتر ہے جو میرے بیٹے کو زندگی کی طرف واپس لے کر آ سکتا ہے، پلیز آپ میری آخری امید ہیں میرے بیٹے کے لئے ''آٹو گراف'' میں کچھ ایسا لکھ دیں کہ وہ ان لفظوں کے تابع ہو کر، زندگی کی گہما گہمی میں واپس لوٹ آئے میں جانتا ہوں کہ وہ کم ہمت نہیں ہے بس وہ مایوس ہو کر اپنا سب کچھ ہار بیٹھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ہی اسے اس مایوسی سے باہر لا سکتی ہیں، کیونکہ آپ کے پاس وہ روشن لفظ ہیں جو زندگی کی نوید دیتے ہیں۔'' میر زمان بیگ نے امید بھری نظروں سے شفق کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شفق نے سر ہلا کر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے گلابی رنگ کا پیڈ نکالا، وہ شروع سے ہی اسی رنگ کا لکھنے کے لئے استعمال کرتی تھی جس سے ہر کوئی بہت اچھی طرح واقف تھا۔

شفق نے کچھ لائنیں اس پہ لکھیں اور پھر اس

کو تہہ کر کے میر زمان بیگ کی طرف بڑھا دیا۔

''تھینک یو سوچ، ماشاءاللہ بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی۔'' میر زمان نے شفق کی گود میں زویا کو دیکھ کر بے ساختہ کہا وہ لوگ کھانا ختم کر کے اٹھ گئے تھے اور اب جانے لگے تھے، تبھی شفق نے زویا کو گود میں اٹھا لیا تو میر زمان بے ساختہ تعریف کر کے بولے۔

''شفق کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، یہ میری بیٹی ہے، شفق کی بھتیجی۔'' اسماء نے مسکرا کر وضاحت کی۔

''اوہو، سوری میں سمجھا کہ......'' میر زمان نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، موحد نے آگے بڑھ کر میر زمان سے ہاتھ ملایا، میر زمان نے اپنا وزٹنگ کارڈ اسے دیا، جسے شکریہ کے ساتھ موحد نے قبول کر لیا۔

میر زمان بیگ نے خوشی اور تشکر بھرے جذبات کے ساتھ انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے گلابی لفافے کو دھیرے سے کھولا بہت خوبصورت لکھائی میں عبارت رقم تھی۔

ایک عام ادھوری خواہش ہے
میری روشن روشن صبحوں کو
تیری چاہت کی
ہر شام ملے
میرے نام کو
تیرا نام ملے

''شہریار مجھے آج اپنے اس سوال کا جواب مل گیا ہے، جو پچھلے پانچ سال سے میرے اندر طوفان مچائے ہوئے تھا، تم مجھے اچانک بغیر بتائے کیوں چھوڑ گئے تھے؟ وعدہ کے مطابق کیوں لوٹ کر نہیں آئے تھے، مجھے زندگی کے خواب دیکھا کر، خود اسی سے مایوس ہو گئے، آج جب انکل نے اپنی فیملی کے بارے میں بتانا شروع کیا تو میں چونک گئی، یہ سب تو تمہاری بتائیں ہوئیں باتیں تھیں، جو تم مجھ سے شیئر کیا کرتے تھے، تم کچھ بھی کہو، کچھ بھی سمجھو، میں نے اپنی خواہش تمہیں بتا دی ہے، میرے لئے تم پہلے بھی میری زندگی تھے اور آج بھی، شہریار میر، مجھے میری زندگی چاہیے، میرے سچ کی گواہی، میرے یہ لفظ ہیں جن کی تکریم سارا زمانہ کرتا ہے، مگر میرے یہ لفظ صرف تمہاری وجہ سے ہیں ان میں ''اثر'' تم ہو۔

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں

''تمہارے آنے کی منتظر شفق مرتضیٰ''

میر زمان بیگ نے حیرانی اور خوشی کے ساتھ ایک ایک لفظ کو پڑھا، انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے شہریار کا نام نہیں بتایا تھا۔

اب انہیں یہ رمز سمجھ آئی تھی کہ شہریار کیوں اس حد تک شفق کی تحریروں کا دیوانہ تھا کیوں شفق کے لفظ لفظ سے شہریار کا وجود جھلکتا تھا۔

میر زمان بیگ نے گلابی لفافے کو احتیاط کے ساتھ تہہ کیا وہ جانتے تھے کہ اس گلابی لفافے میں وہ اسم اعظم ہے جو ان کے بیٹے کو زندگی دینے والا تھا اور شفق کا انتظار جلد ختم ہونے والا تھا، زندگی کے اس اتفاق نے شفق کو باور کروا دیا تھا کہ۔

''زندگی سچ میں اتنی خوش خوبصورت اور بے فکری سے بھری ہوتی ہے اگر محبت ساتھ ہو تو......!!!'' اور شفق کو اس کی کھوئی ہوئی محبت مل گئی تھی، اب ملن دور نہیں تھا۔

☆☆☆

قفسِ محبت

رافعہ اعجاز

مکمل ناول

اس وقت وہ مکان کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا، مکان بہت بڑا نہ سہی لیکن چھوٹا بھی نہیں تھا، اس کے اور شہر بانو کے رہنے کے لئے کافی تھا، اب اسے یہیں سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنی تھی، اس مکان کو خوشیوں سے بھرپور گھر بنانا تھا، اپنے لئے ایک جنت بنانی تھی، اپنی گاڑی بیچ کر اور کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں موجود تھی سب ملا کر اس نے یہ مکان خریدا تھا، اس بنگلے سے آئے ہوئے وہ چند کپڑوں اور اپنے ضروری کاغذات کے علاوہ کچھ بھی نہیں لایا تھا، اب اسے یہیں اپنی زندگی گزارنی تھی جو پہلے کی طرح ادھوری نہیں ہونی تھی، شاہ زین نے ایک نظر بیرونی عمارت کو دیکھا اور ایک لمبی تھکی ہوئی سانس خارج کی تھی، ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس نیچے رکھا اور گیٹ پر لگا بڑا سا قفل کھولا اور اندر آ گیا، گھر کا چھوٹا سا لان بہت بری حالت میں تھا، پودے بے ڈھنگے انداز میں بڑے ہوئے تھے کچھ پودے پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گئے تھے، لان کے ایک کونے میں انار کا درخت تھا جس کی شاخیں دیوار کے پار دوسرے گھر تک پھیلی ہوئی تھیں، اس نے لان کا جائزہ لیا جو لان سے زیادہ اجڑا ہوا کوئی باغ لگ رہا تھا، وہ لان کے ساتھ راہ داری پر چلتا ہوا گیراج تک آیا اور مکان کا اندرونی دروازہ کھولا، دروازہ چرچراہٹ کی مخصوص آواز سے کھل گیا، فرنیچر سفید کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا، ڈرائنگ روم کے دروازے کے ساتھ کچن کا دروازہ تھا، سامنے دو بیڈ رومز تھے ایک باتھ روم کا دروازہ مرکزی ہال میں کھلتا، شاہ زین نے اندرونی حصے پر نگاہیں دوڑائیں، سامنے لگا دروازہ پچھلے صحن میں کھلتا تھا، شاہ زین نے دروازہ کھول کر صحن میں جھانکا دروازے کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے آگے چھوٹا سا.

صحن تھا، گملوں میں لگے پودے سوکھ چکے تھے، سوکھے پتوں اور گرد مٹی سے صحن کا فرش ڈھکا ہوا تھا، شاہ زین واپس ہال میں آ گیا، دیواروں پہ جالے لٹک رہے تھے مکان اتنی خستہ حالت میں بھی نہیں تھا کہ وہاں پر رہا نہ جاسکے، بس کسی مکین کی غیر موجودگی میں مکان کی حالت قابل رحم تھی، اس نے صوفے سے کپڑا اٹھایا تو دھول مٹی کا ایک بادل اڑا اور پھر ختم ہو گیا، وہ صوفے پہ بیٹھ گیا، جیب سے موبائل نکالا اور شہر بانو کے لئے پیغام لکھا۔

”شہر بانو میری محبت پر اعتماد رکھنا اور میرا انتظار کرنا میں جلد ہی تمہارے پاس لوٹوں گا۔“ شہر بانو کے نمبر پر میسج سینڈ کرنے کے بعد اس نے موبائل سوئچ آف کر دیا، وہ جانتا تھا کہ حیدر پہلے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا، اسے بہت ڈھونڈے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ شہر بانو سے بھی رابطہ کرے اسی وجہ سے اس نے دوبارہ شہر بانو سے بھی رابطہ نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا صرف اسے اتنا ہی میسج کیا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے وہ ضرور لوٹے گا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صرف حیدر اور شہر بانو ہی ہیں جو اس کی پرواہ کرتے ہیں اس کی خوشی میں خوش اور پریشانی میں پریشان ہوتے ہیں لیکن وہ گھر چھوڑتے ہوئے اس نے حیدر اور شہر بانو کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا، حیدر کو اس لئے نہیں بتایا تھا کہ وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ہی گھر چھوڑ دیتا تھا اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ حیدر اس کے ساتھ آئے اور اپنا کیریئر خراب کرے، جبکہ مزید اس گھر میں رہنا بھی مشکل ہو گیا تھا اور شہر بانو کو نہ بتانے کی وجہ بھی حیدر ہی تھا کیونکہ حیدر اسے ڈھونڈنے کے لئے شہر بانو سے رابطہ کرے گا اور حیدر کے سامنے شہر بانو کا جھوٹ بولنا ناممکن تھا، کچھ عرصے بعد حیدر نے ہائر اسٹڈیز کے لئے امریکا چلے جانا تھا اور اس عرصے میں وہ حیدر سے بالکل بھی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی اس کے سامنے جانا چاہتا تھا ورنہ شاید نہیں یقیناً حیدر امریکہ جانے سے انکار کر دیتا۔

اس نے دیوار پر لگی رکی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پہ ٹائم دیکھا دن کے گیارہ بج رہے تھے، ساری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، وہ گھر چھوڑنا اس کے آسان نہیں تھا، اس کی مما کی یادیں تھیں وہاں، زندگی کے چوبیس برس گزارے تھے وہاں، بہت تھوڑی لیکن کچھ اچھی یادیں بھی وابستہ تھیں اس گھر سے، لیکن اب وہاں رہنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا، وہیں صوفے پہ بیٹھے وہ اپنی اچھی یادوں کو یاد کرنے لگا، انہی یادوں میں کھوئے کب اس کی آنکھ لگی اسے خبر یہ نہ ہوئی اور جب اس کی آنکھ کھلی شام کے چار بج رہے تھے، اس نے جمائی روکتے ہوئے انگڑائی لی اور آنکھیں ملتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، کچھ دیر یونہی سوئی جاگی حالت میں بیٹھا رہا، دماغ کے بیدار ہوتے ہی پہلا خیال حیدر اور شہر بانو کا ہی آیا تھا اور دوسرا خیال بھوک کا آیا تھا، کل صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، پچھلے ایک ہفتے سے وہ اس مکان کو خریدنے کے چکروں میں تھا، جبھی بھوک کا احساس ہوا تو کچھ کھا لیا، اس مکان کے کاغذات اپنے نام ہوتے ہی اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

شاہ زین نے اٹھ کر واش روم میں جھانکا سینٹری کا سامان گرد سے اٹا ہوا تھا، اس نے واش بیسن کی ٹونٹی چلائی لیکن پانی غائب تھا، موٹر کا بٹن ڈھونڈنے کے لئے اس نے سارے گھر کی لائٹس

آن آف کی تھیں، آخر کار اسے موٹر کا سوئچ مل ہی گیا تھا، موٹر چلا کر پانی کا بندوبست کیا تو نہانے کے لئے کوئی سوپ کوئی شیمپو موجود نہیں تھا، لیکن گرمی اور پسینے کی وجہ سے اس کا برا حال تھا، اس نے کچھ لمحے سوچنے میں لگائے کہ اب کیا کرے اور پھر سوپ اور شیمپو کے بغیر ہی نہانے کا ارادہ کیا فریش ہونے کے بعد اس نے کچن میں جھانکا، خالی کیبن اس کا منہ چڑھا رہے تھے، بھوک کی وجہ سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں تھا، وہاں تو اسے صرف حکم دینا ہوتا تھا ملازم اس کے کمرے میں کھانا لے آتا تھا، بہت کم وہ ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ کھانا کھاتا تھا، اگر کبھی اکیلا ہوتا یا حیدر کے ساتھ ہوتا تو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا لیتا ورنہ تو کبھی پاپا کے ساتھ بھی کھانا نہیں کھاتا تھا اور پھر رخشندہ ناز کے ساتھ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو اتنا ہی ناپسند کرتے تھے جتنا کوئی پاکستانی کسی انڈین کو اور کوئی انڈین کسی پاکستانی کو کرتا ہے، شاہ زین نے مایوسی سے آخری خالی کیبن بند کیا اور گھر سے باہر کھانا کھانے کا سوچا اور گھر کو لاک لگا کر باہر آ گیا، کچھ رقم جیب میں جبکہ کچھ اکاؤنٹ میں بھی موجود تھی، لیکن کہیں بھی جانے کے لئے سواری کی ضرورت تھی اور وہ اپنی گاڑی بیچ چکا تھا، اس نے ارد گرد ٹیکسی کے لئے نظریں دوڑائیں لیکن اس محلے میں ٹیکسی تو دور چھوٹا رکشہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، گھر کے بالکل سامنے گلی کی دوسری جانب چھوٹی سی چار دیواری کے اندر کھلے احاطے کو سٹیڈیم کی شکل دی گئی تھی، کچھ لڑکے وہاں کرکٹ کھیل رہے تھے احاطے میں ایک طرف نیم کا درخت لگا ہوا تھا جس کے نیچے اینٹوں کو جوڑ کر بیٹھنے کے لئے بینچ بنانے کی کوشش کی گئی تھی، شاہ زین نے ایک نظر سامنے کرکٹ کھیلتے لڑکوں پر ڈالی، یہاں اکثریت اس کی طرف بھی متوجہ تھی اس نے سب کو بیزاری سے دیکھا اور واپس گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

بھوک شدید قسم کی لگی ہوئی تھی اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ مین روڈ سے جا کر ٹیکسی ہی لے لے، زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے بھوک لگی ہوئی تھی اور اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا، ورنہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا تھا کہ کھانا اس کے پاس آتا تھا کہ کبھی پاپا سے لڑائی ہو جاتی تو کھانے کا بائیکاٹ کر دیتا تو کبھی رخشندہ ناز کی باتوں سے تنگ آ کر کھانے سے انکار کر دیتا اور جب حیدر کو پتہ چلتا کہ شاہ زین نے کچھ نہیں کھایا تو وہ خود ہی کھانا لے کر اسے کمرے میں آ جاتا، حیدر کے کھانا لانے پر وہ کھانا تو کھا لیتا تھا لیکن نخرے دکھانے کے بعد، حیدر ہی تو وہ واحد شخص تھا جس کو نخرے دکھانا اسے اچھا لگتا تھا کیونکہ حیدر ہی تھا جو اس نخرے اٹھاتا تھا اس کی گالیاں اس کی لڑائیاں ہنستے ہوئے برداشت کرتا تھا اور پھر لڑنے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو گلے لگاتے اور پھر مل کر کھانا کھاتے، کہنے کو حیدر شاہ زین سے چھوٹا تھا لیکن اس کا Maturity لیول شاہ زین سے کہیں زیادہ تھا، وہ شاہ زین کی طرح جلد باز نہیں تھا۔

بھوک کی وجہ سے پیٹ سے گڑ گڑ کی آوازیں آ رہی تھیں، اسے حیدر بہت یاد آیا، اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ بھوک کیا ہے اور بھوکا رہنا کسے کہتے ہیں؟

اس پر آسائش بنگلے سے لے کر اس نو مرلے کے مکان میں آنے تک اس نے زندگی کا

جو پہلا تجربہ کیا تھا وہ بھوک کا تھا، اسے پہلی بار بھوک کا اصل مطلب سمجھ میں آیا تھا، وہ یونہی بے وجہ میں اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا جب گیٹ پر بیل ہوئی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" وہ چلتا ہوا باہر گیٹ تک آیا اور گیٹ کھولا، سامنے چودہ پندرہ سال کے دو لڑکے کھڑے تھے، ایک نے سفید لانگ نیکر پر کالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ دوسرے نے نیلی جینز پر ٹی پنک کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"جی!" شاہ زین سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں عادل اور میں کامران۔" دونوں لڑکوں کو اپنا تعارف کروایا۔

"آپ یہاں نئے آئے ہیں؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"ہاں......تو؟" شاہ زین دروازے میں کھڑا بولا، اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے ان لڑکوں کے تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں کچھ بھوک کی وجہ سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"تو یہ پلاؤ خالہ امی نے آپ کے لئے بھجوایا ہے۔" کالی ٹی شرٹ والے نے ڈھکی ہوئی پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، پلاؤ کا نام سنتے ہی شاہ زین کی آنکھوں میں چمک آ گئی، اس نے شکریہ کے ساتھ پلیٹ پکڑ لی۔

"آؤ اندر آؤ۔" شاہ زین نے مروتاً کہا۔

"نہیں ابھی تو۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" کامران نے انکار کرنا چاہا، لیکن عادل نے کامران کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور قدم اندر کی جانب بڑھا دیے، کامران نے کندھے اچکا کر دروازے میں کھڑے شاہ زین کی طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔

"ویسے تو ہم نے یہ گھر پہلے بھی دیکھا ہوا ہے لیکن ایک بار پھر دیکھ لیتے ہیں، جو پہلے کرائے دار تھے وہ بھی آپ کی طرح کے ہی تھے۔" عادل گھر کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے کا بھی اظہار کر رہا تھا، شاہ زین ناگواری سے دونوں کو دیکھا، نہ کوئی جان پہچان تھی اور وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔

"بڑے بدتمیز ہیں۔" شاہ زین نے سوچا، وہ اس سے آگے چلتے ہوئے اس کے ساتھ گپیں ہانکنے میں مصروف تھے اور وہ صرف ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہا تھا، وہ شاہ زین سے بہت کم کچھ پوچھ رہے تھے زیادہ تر وہ اسے بتا ہی رہے تھے، محلے کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیلی روشنی ڈال رہے تھے، محلے کے مسائل سے اسے آگاہ کر رہے تھے، بہت کم باتیں اس کے پلے پڑ رہی تھیں، زیادہ تر بھوک کی وجہ سے دماغ کے اوپر سے ہی گزر رہی تھیں، عادل اور کامران ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں کھڑے باہر لان کا جائزہ لے رہے تھے، شاہ زین نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑے چاولوں کے اوپر سے کور ہٹا کر دیکھا، چاولوں کے اوپر پڑی ران کی بوٹی دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ گیا، چاولوں کی خوشبو بتا رہی تھی کہ چاول مزے کے پکے ہیں، زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی کی موجودگی کو اتنے صبر سے برداشت کر رہا تھا، صبر کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا، شاہ زین نے بے بسی سے ڈھکی ہوئی پلیٹ کو دیکھا۔

"عادل طیب بھائی آنے والے ہیں۔" کامران نے عادل کو یاد کروایا۔

"اوئو ابھی تو مجھے ماہم آپا کو سٹور سے کچھ سامان بھی لا کر دینا ہے۔" کامران نے عادل کو یاد کروایا تو عادل سر پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے

دوسرا کام بھی یاد آ گیا تھا۔

"او کے انکل پھر ہم چلتے ہیں کوئی کام ہوا تو اسے ضرور بتائیے گا۔" عادل نے مروتاً کہا تو کامران نے پاؤں عادل کے پاؤں پر مارتے ہوئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی، شاہ زین کو دونوں کی اس حرکت پہ ہنسی آ گئی لیکن اس نے ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

"اللہ تعالیٰ تمہارے طیب بھائی اور ماہم آپا کو ہمیشہ خوش رکھے۔" شاہ زین نے ان کے جانے پر شکر ادا کیا اور ان کے طیب بھائی اور ماہم آپا کو دعائیں دیتے ہوئے پلاؤ کے اوپر سے کور ہٹایا، شاہ زین نے پلاؤ کھانے سے پہلے ایک لمحہ چمچ کے بارے میں سوچا جو کہ اسے اس وقت نہیں مل سکتا تھا، دوسرے ہی لمحے وہ صوفے پہ بیٹھ کر ہاتھوں کے ساتھ ہی چاولوں کے ساتھ انصاف کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

وہ چلتے ہوئے افسردگی سے سر جھکائے زندگی کے انوکھے کھیل کے بارے میں سوچ رہا تھا، جہاں ہر پل ہر لمحہ زندگی بدلتی ہے، اگلے لمحے میں کیا ہوگا کوئی نہیں جانتا یہاں لمحوں کی بھی کسی کو خبر نہیں اس کے باوجود انسان زندگی بھر کے منصوبے بناتا رہتا ہے خود اس نے کب زندگی میں آنے والے ان مراحل کا سوچا تھا کہ اسے سب کچھ بہت انوکھا لگے گا زندگی کی حقیقت بہت عجیب لگ رہی تھی، آج اس کا ایم بی اے کا رزلٹ آیا تھا اور وہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا، پچھلے دو سالوں سے ایم بی اے کرنے کے بعد امریکہ کسی بھی اچھی یونیورسٹی سے سی اے کرنے کے خواب دیکھتا رہا تھا لیکن اب اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی خواب ہی نہ رہا ہو، اس کا رزلٹ اس کی توقع سے بھی اچھا آیا تھا لیکن اسے اپنے اپنے اندر خوشی کی کرن جگمگاتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ یونہی سر جھکائے گلی میں چل رہا تھا اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آگے کی زندگی کیسی ہوگی، اب اسے کیا کرنا ہے؟ وہ اپنی سی وی مختلف کمپنیز کو میل کرنے کا سوچ رہا تھا، اچھی جاب حاصل کرنے کے لئے کچھ تو کرنا تھا، اپنے اوپر چھائی اتنی افسردگی کے باوجود اسے مکمل امید تھی کہ اس کی سی وی دیکھ کر کوئی بھی کمپنی اسے اس کی خواہش کے مطابق جاب آفر کرے گی، لیکن کوئی بھی اچھی نوکری ملنے تک ایسے ہی گزارہ کرنا تھا اور اس کے پاس جو رقم بچی تھی وہ زیادہ دیر نہیں چل سکتی تھی۔

"ارے بیٹا ذرا بات تو سننا۔" کسی نے مخاطب کرنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا، سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی جبکہ سر پر کروشیے کی بنی براؤن ٹوپی پہنی ہوئی تھی وہ رک گیا۔

"جی فرمایئے۔" اسے اس محلے کی بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ ہر کوئی جان پہچان بنانے میں ماہر تھا۔

"لگتا ہے محلے میں نئے آئے ہو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی نیا ہی آیا ہوں یہ سامنے والا گھر میرا ہے۔" اب تو اسے پوچھے جانا والا سوال بھی رٹ چکا تھا جب بھی محلے کا نیا فرد اسے مخاطب کرتا تو اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس سے کیا سوال پوچھا جانے والا ہے، محلے میں اس کی آمد کی خبر ایسے ہی پھیلی تھی جیسے جنگل میں آگ پھیلتی ہے، لیکن اس کے باوجود پوچھنا ہر کوئی اپنا فرض سمجھتا تھا، پوچھنے والے مخصوص سوال کا مقصد اس سے بات چیت بڑھانا ہوتا تھا لیکن اب تو اسے اس سے چڑ ہونے لگی تھی۔

"اچھا اچھا جیتے رہو، رشید نام ہے میرا، سب مجھے رشید چاچا کہتے ہیں، یہ سامنے پرچون کی دکان میری ہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" شاہ زین صرف دل میں ہی سوچ سکا تھا، اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"لیکن چلو کوئی بات نہیں یہ بچے ہی تو محلے کی رونق ہیں آج ہی طیب سے کہوں گا ٹھیک کر دے ماشاءاللہ بڑا ہی فرمانبردار بچہ ہے، اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔" رشید چاچا اب طیب کی تعریفیں کرنے میں مصروف تھے۔

"اب میں جاؤں؟" شاہ زین کوفت کا شکار ہو رہا تھا وہ جب سے اس محلے میں آیا تھا بچوں بڑوں بوڑھوں سب کی زبانوں پر ایک ہی نام تھا، "طیب بھائی بڑے اچھے ہیں تو طیب بیٹا بڑا ہی فرمانبردار ہے۔" وہ طیب کے قصیدے سن سن کر تھک گیا تھا طیب نہ ہو گیا کوئی فرشتہ ہو گیا، وہ سر جھٹکتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیا، صغیر نے چھوٹے لڑکوں نے میری عینک توڑ دی ہے۔

رشید چاچا اپنی دکان پر آنے والے گاہک کو دور سے ہی بتانے لگا، شاہ زین نے مڑ کر دیکھا اور پھر چھوٹا گیٹ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گیا، گھر کے اندر داخل ہوتے ہی افسردگی کچھ اور بڑھ گئی تھی، اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً دو ہفتے ہو گئے تھے اور ان دو ہفتوں میں نہ ہی اس نے شہربانو سے رابطہ کیا تھا نہ ہی حیدر سے ملنے کی کوشش کی تھی، یہ دو ہفتے اس نے بے مقصد گزارے تھے، اسے اپنے رزلٹ کا انتظار تھا اور آج جب رزلٹ آ گیا تھا تو خوشی میں افسردگی کی آمیزش تھی کہ اسے خوشی محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی، کوئی اس کے پاس بھی نہیں تھا کہ جس کو اپنا رزلٹ بتا سکے، حیدر نہیں تھا جو کہتا کہ تمہارے تھیسز اور رپورٹ کے Approne ہونے کی بہت دعائیں کی تھیں اب ٹریٹ تو بنتی ہے اور نہ ہی شہربانو تھی جو سن کر کہتی کہ اتنی محنت کی تھی رزلٹ تو اتنا اچھا آنا ہی تھا، اس نے اندر جانے کی بجائے لان کی طرف قدم بڑھا دیئے، لان میں داخل ہوتے ہی اسے راستے میں پڑی اینٹ سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے ہوئے بچا اس نے اینٹ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بینچ کے اوپر گرے سوکھے پتے ہٹاتے ہوئے بیٹھ گیا، ان دو ہفتوں میں اس نے گھر کی ایک چیز کو اٹھا کر ادھر سے ادھر نہیں کیا تھا سارا دن مٹرگشت کرتا شہر کی سڑکیں ناپتا شام کسی ہوٹل سے کھانا کھاتا اور رات گزارنے کے لئے گھر آ جاتا، گھر لوٹتے ہی تنہائی کا احساس اتنا جان لیوا ہوتا کہ وہ بے بسی سے ویران در و دیوار کو گھورتا رہتا۔

"اگر پاپا کو پتہ چلتا تو ان کا ری ایکشن کیسا ہوتا؟" بینچ پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی، وہ یقیناً کسی قسم کا ری ایکشن شو نہیں کرتے، نہ خوشی کا نہ ہی غم کا، ایسے ری ایکشن تو اپنوں کے لئے ہوتے ہیں وہ تو مجھے اپنا پرایا کچھ نہیں سمجھتے، میں تو بہت گرا ہوا انسان ہوں۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

"میں نے کون سا ان کے ساتھ بہت اچھا کیا ہے، جو میں ان کی بے رخی کا شکوہ کروں، میری سوچ میرا معیار تو بہت ہی گھٹیا ہے، میں ایک اچھا بیٹا ثابت نہیں ہو سکا۔" اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

"تمہارا معیار تمہاری طرح گرا ہوا ہے۔" پاپا کے کہے ہوئے الفاظ اس کے دماغ سے نکلتے ہی نہیں تھے، اس نے سامنے انار کے درخت پر نظریں گاڑھ دیں اور اپنے آنسو پینے کی کوشش کرتا رہا تھا، دل مزید بے چین ہو گیا تھا، وہ یونہی

بے چینی سے اِدھر سے اُدھر چکر لگانے لگا، یہ نفرت بھرا لہجہ اسے اندر ہی اندر کچوکے لگاتا تھا، اپنا دھیان بٹانے کے لئے اس نے لان کی صفائی شروع کی، گوڈی کرنے کے بعد کیاریوں سے نکلنے والے گند کو ایک طرف جمع کیا، بڑھی ہوئی گھاس کی کٹائی کے لئے اس کے پاس مشین نہیں تھی، اس نے لان میں بکھرے سوکھے پتے اکٹھے کیے اور انہیں آگ لگا دی، خشک پتوں کے جلنے سے مخصوص آواز پیدا ہو رہی تھی، وہ یک ٹک پتوں کو جلتے دیکھتا رہا، ایسی ہی ایک آگ اسے اپنے اندر جلتی محسوس ہوئی جس سے نکلنے والے نفرت کے شعلے اتنے تیز تھے کہ اس کا اپنا آپ جلا رہے تھے، وہ یونہی بدستور پتوں کو جلتے دیکھتا رہا اور ان میں اپنا آپ تلاشتا رہا، حتیٰ کہ وہ پتے جل کر راکھ ہو گئے، وہ پاؤں کے بل بیٹھا راکھ کو کریدتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ بھی اسی طرح ایک دن اپنی ہی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا، وہ غیر ارادی طور پر راکھ کو کرید رہا تھا جبھی گیٹ پر ہونے والی بیل نے اسے چونکا دیا، وہ گیٹ کی طرف مڑا، وہی لڑکا جو اپنا نام عادل بتا رہا تھا اندر داخل ہوا۔

"عادل رکو بیٹا کسی کو اندر سے آنے تو دو۔" عادل کے پیچھے ایک زنانہ آواز ابھری۔

"خالہ امی دروازہ کھلا ہے تو انکل گھر ہی ہوں گے۔" عادل آگے چلتا ہوا بولا اس کے پیچھے تقریباً چالیس پچاس سالہ ایک خاتون اندر داخل ہوئیں، جو عادل کی خالہ امی تھیں انہوں نے ہلکے پیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی، چادر کو سلیقے سے سر پر اوڑھا ہوا تھا، شاہ زین ہاتھ جھاڑتا ہوا انہی کی طرف آ گیا۔

"السلام علیکم!" عادل نے سلام میں پہل کی۔

"وعلیکم السلام!" شاہ زین نے سلام کا جواب دیا۔

"شکر ہے آپ گھر تو ملے ورنہ تو چکر لگا لگا کر میرے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔" عادل اپنے پرانے انداز میں بولا، عادل کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ شاہ زین کی نظریں بے ساختہ اس کے پاؤں کی طرف گئیں۔

"ویسے تو گھر ساتھ ہی ہے لیکن چکر بہت زیادہ تھے، اس لئے صرف درد ہی ہو رہا ہے زخمی ہونے کا تو محاورتاً کہا ہے۔" وہ شاہ زین کے یوں پاؤں کی طرف دیکھنے پر وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

"السلام علیکم!" سلام کی آواز پر شاہ زین کا دھیان عادل کی خالہ امی کی طرف گیا۔

"وعلیکم السلام!" شاہ زین متاثر سا ہو کر بولا بڑے ہونے کے باوجود انہوں نے سلام میں پہل کی تھی۔

"میں عادل کی خالہ امی ہوں، اس دن عادل آیا تھا یہاں۔" انہوں نے تعارف کی غرض سے کہا۔

"آئی ایم ساری آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانی پڑے۔"

"نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ دھیمے سے مسکرائیں۔

"آیئے نا آنٹی اندر آیئے۔" شاہ زین خوشدلی سے بولا اور ان کو لے کر اندر آ گیا۔

"آپ پلیز یہاں بیٹھیں۔" شاہ زین نے صوفے سے کپڑا ہٹاتے ہوئے کہا، عادل اور وہ صوفے پر بیٹھ گئے، ان کے بیٹھنے کے بعد شاہ زین سامنے والے صوفے سے کپڑا ہٹا کر بیٹھ گیا، وہ انہیں صحیح طرح سے جانتا بھی نہیں تھا لیکن دل میں ایک احترام پیدا ہو گیا تھا۔

''میرا نام طاہرہ ہے یہ پڑوس میں ہمارا ہی گھر ہے۔'' وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولیں۔

''جی!''

''میں نے دو بار عادل کو بھیجا لیکن گھر کو تالا ہی لگا ہوتا تھا۔''

''جی بس کچھ مصروفیت تھی۔'' شاہ زین کو بروقت کوئی بہانہ نہ سوجھ سکا تھا وہ غیر ارادی طور پر ان کے سامنے اپنا اچھا امیج بنانا چاہ رہا تھا۔

''خالہ امی کو شاید نئے ہمسائیوں سے ملنے کا شوق تھا۔''

''بیٹا تمہارے گھر والے نظر نہیں آ رہے۔'' طاہرہ آنٹی نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا، شاہ زین کو ایک پل کے لئے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔

''میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''شادی بھی نہیں ہوئی؟''

''جی ابھی تو نہیں ہوئی۔'' شاہ زین کو ایسے لگا جیسے وہ کسی کو انٹرویو دے رہا ہو، اس کے بعد طاہرہ آنٹی نے مزید کوئی ذاتی سوال نہیں کیا تھا شاید وہ شاہ زین کا ردعمل سمجھ گئیں تھیں۔

''آئی ایم سوری آنٹی میں کوئی خاطر مدارت نہیں کر سکا ایکچوئیلی گھر میں کچھ بھی کھانے کو نہیں ہے۔'' شاہ زین کی بات پر انہوں نے عجیب نظروں سے شاہ زین کی طرف دیکھا۔

''کبھی اکیلا رہا نہیں نا اسے لئے گھر کی چیزوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔'' وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

''کیا کرتے ہو؟'' خالہ امی نے پوچھا تھا۔

''ایم بی اے کیا ہے جاب کی تلاش میں ہوں۔'' اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں تھیں۔

''میں کل صبح نسرین کو بھیج دوں گی، وہ تمہارے گھر کی صفائی کر دے گی۔''

''آنٹی آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن آپ کو خانخواہ تکلیف ہوگی میں کر لوں گا۔''

''ارے بیٹا کہاں صفائیاں کرتے رہو گے صبح سنڈے ہے ماہم گھر ہی ہو گی وہ گھر کی صفائی کر دے گی میں نسرین کو تمہاری طرف بھیج دوں گی۔'' شاہ زین نے سر ہلا دیا۔

''انکل اپنا نام تو بتا دیں۔'' عادل نے یاد آنے پر پوچھا۔

''شاہ زین۔'' شاہ زین نے اپنا نام بتایا۔

''اچھا بیٹا اب ہم چلتے ہیں۔'' طاہرہ آنٹی کھڑی ہوئیں تو عادل اور وہ بھی کھڑے ہو گئے۔

''اب تو محلے داری ہے ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''انشاءاللہ۔''

''اللہ حافظ۔'' طاہرہ آنٹی نے شاہ زین کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا شاہ زین کو عجیب اپنائیت کا احساس ہوا، ایسے جیسے اس ایک لمحے میں اسے ماں کی ممتا مل گئی ہو۔

''اللہ حافظ۔'' شاہ زین جواباً بولا تو وہ عادل کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

شاہ زین ان کی شخصیت ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا تھا، اگلے دن نسرین عادل کے ساتھ صفائی کرنے پہنچ گئی تھی، وہ ابھی سو رہا تھا مسلسل بجنے والی بیل کی آواز پر اس نے تکیہ سامنے دیوار پر دے مارا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

''ایسا دن بھی دیکھنا تھا کہ چوکیدار کے فرائض بھی نبھانے تھے۔'' اپنی نیند خراب ہونے پر اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

''کون ہے؟'' شاہ زین گیٹ کھولتے

ہوئے اکھڑے لہجے میں بولا۔

''اتنی صبح۔'' سامنے عادل کو کھڑا دیکھ کر اس کا لہجہ کچھ مدھم ہوا۔

''دس بج رہے ہیں۔'' عادل اس پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''خالہ امی نے نسرین باجی کو صفائی کے لئے بھیجا ہے۔'' عادل کے کہنے پر شاہ زین گیٹ سے ہٹ گیا، اندر گھر کی حالت دیکھ کر نسرین کی حالت دیکھنے والی تھی۔

''طاہرہ بی بی نے مجھے صفائی کرنے کے لئے بھیج تو دیا ہے لیکن میں اکیلی اتنے گندے گھر کی صفائی کیسے کروں گی۔'' نسرین نے چھت پر لگے جالوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو شاہ زین کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

''نسرین باجی ہمسائیوں کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔'' عادل ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

نسرین صفائی کرنے میں لگ گئی شاہ زین اس کی برابر مدد کرتا رہا تھا عادل بھی کوئی چیز اٹھا کر ادھر سے ادھر کروا دیتا ورنہ تو وہ سیڑھیوں پر بیٹھا گیم کھیلنے میں ہی مصروف رہا تھا، اندرونی حصے کی صفائی کرنے کے بعد گیراج کے فرش کو دھویا، گھر کی صفائی ہونے تک ڈیڑھ بج چکا تھا، بھوک سے شاہ زین کی بری حالت تھی، اس نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا، لیکن وہ برابر ملازمہ کی مدد کرواتا رہا تھا۔

''صاحب جی لان کی صفائی کا کام میرا نہیں۔'' نسرین نے لان کی حالت دیکھتے ہوئے کہا، گھاس اور پودے بے ڈھنگے انداز میں بڑھے ہوئے تھے۔

''وہ میں کر لوں گا باقی سارے گھر کی صفائی کرنے کا شکریہ۔'' شاہ زین تھک کر گیراج میں کھلتے ڈرائنگ روم کے سامنے بنی دو سیڑھیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا، نسرین نے وائپر لگا کر فرش کو جلدی خشک کرنے کے لئے پنکھا لگا دیا، اے سی کی ٹھنڈ سے نکل کر ایسی ٹھنڈی ہوا لینے کا اس کا پہلا تجربہ تھا، اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں ٹھنڈے فرش پر لیٹے اور سو جائے لیکن نیند آنے کے لئے پیٹ کا بھرا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے خالی پیٹ تو نیند بھی نہیں آتی، زندگی میں پہلی بار اس نے ملازمہ کے ساتھ مل کر صفائی کی تھی، بہت سے کام تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے، لیکن اب کر رہا تھا۔

''کیا کھاؤں کیا پیزا منگوا لوں؟'' شاہ زین نے جیسے عادل سے رائے لینا چاہی۔

''جی انکل منگوا لیں بہت مزہ آئے گا۔'' عادل نے فوراً خوشی سے آنکھیں پھیلاتا ہوا بولا تو شاہ زین مسکرا دیا۔

شاہ زین نے مسکراتے ہوئے اپنا فون تھاما اور آڈر کیا شروع شروع میں جو حرکتیں اسے چھچھورا پن لگتی تھیں اب وہ انہیں انجوائے کرنے لگا تھا، شاہ زین کے آڈر کرنے کے تقریباً بیس منٹ بعد پیزا آ گیا تھا۔

''پیزا تو ایسے ہی کھانا پڑے گا، پلیٹیں اور چھری کانٹے نہیں ہیں۔'' شاہ زین نے پیزے کی پیکنگ کھولتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی آپ کے گھر میں برتن بھی نہیں ہے آپ کے امی ابو کہاں رہتے ہیں۔'' نسرین حیرانگی سے بولی، تو پیزا اٹھاتے شاہ زین کا ہاتھ ایک لمحے کے لئے رک گیا۔

''وہ نہیں ہیں۔'' شاہ زین نے مختصر کہا اور پیزا نسرین کی طرف بڑھایا۔

''اوہ۔'' وہ افسوس سے بولی۔

''میں آپ کو کچن کا ضروری سامان لکھوا دوں گی آپ لے آئیے گا۔'' پیزا کھانے کے بعد

نسرین نے ڈبہ اور ڈسپوزل گلاس کوڑے دان میں پھینکے، عادل اور نسرین کے جانے کے بعد شاہ زین ٹانگیں سیدھی کر کے نیچے فرش پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، نیند اس قدر حاوی ہو رہی تھی کہ اس کی بھوری آنکھیں بامشکل کھل رہی تھیں، فرش دھلنے کی وجہ سے پنکھے کی ہوا بھی ٹھنڈی تھی۔

وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا آیا، نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ وہ بیڈ پر لیٹتے ہی سو گیا، پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے، وہ اٹھ کر پہلے فریش ہوا پھر سارے گھر کا جائزہ لیا گھر کی حالت یکسر بدل چکی تھی، ہر چیز صاف شفاف تھی کہیں کوئی گرد نہیں تھی، گھر کو صاف ستھرا دیکھ کر اسے خوشی کا انوکھا احساس ہوا، پہلے تو تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے وہ صفائی کا جائزہ بھی نہیں لے سکا تھا، ضروری نہیں کہ بڑی بڑی باتوں پر ہی خوش ہوا جائے، چھوٹی چھوٹی عام سی باتوں پر بھی خوش حاصل ہو سکتی ہے، اس نے آج کے کام کے بعد یہی سبق سیکھا تھا، فریش ہونے کے بعد وہ کافی پینے کے موڈ میں تھا، سو کچن میں آ گیا کچن صاف تو تھا لیکن سامان سے خالی۔

نسرین کچن کا ضروری سامان لکھوا گئی تھی، وہ سامان لینے مارکیٹ چلا گیا وہاں جا کر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس بہت کم پیسے رہ گئے ہیں، اب جاب کے بارے میں سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنا تھا اسے پریشانی ہونے لگی، اس نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا، اسے گھر آ کر احساس ہوا کہ وہ سامان تو لے آیا ہے لیکن اسے کافی بنانی نہیں آتی، اس نے مایوسی سے شاپر کچن میں شیلف پر لا کر رکھ دیئے اور لیپ ٹاپ لے کر باہر لان میں آ گیا، گرمی کا زور کم ہوا تھا آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بن رہے تھے، وہ بینچ پر بیٹھ کر اپنی سی وی بنانے لگا، سی وی مکمل کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ پین ڈرائیو تو وہ لے کر ہی نہیں آیا تھا اور پھر میل کرنے کے لئے اس کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود نہیں تھی اس نے فائلیں سیو کیں اور لیپ ٹاپ بند کیا اور آسمان پر جمع ہوتے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

اس کی نظر کے سامنے جو زندگی تھی بہت محدود تھی، اس پر آسائش بنگلے سے نکل کر اس نے زندگی کے اور بھی بہت سے روپ دیکھے تھے، دو ہفتے کے اس مختصر عرصے میں وہ زندگی کی بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہوا تھا، بہت کم نیا تجربہ کیا تھا، وہ یونہی بیٹھا آسمان کی طرف دیکھتا رہا آسمان کالے بادلوں سے بھر گیا تھا، جو برسنے کے مکمل موڈ میں تھے، اس نے لیپ ٹاپ واپس اندر رکھا اور پھر سے باہر آ گیا، بارش کی بوندیں گرنے لگی تھیں، وہ گیراج میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور بارش کو برستے دیکھنے لگا اور ان دنوں کو سوچنے لگا جب شہر بانو اس کے ساتھ اس گھر میں موجود ہوگی اور ایسی ہی بارش ہو رہی ہوگی، یہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ دونوں باتیں کیا کریں گے اور دونوں کے ہاتھ میں گرم گرم کافی ہوگی۔

یہ دن مشکل ضرور تھے لیکن آنے والے اچھے دنوں کی امید بھی تھی شاہ زین نے مسکرا کر اپنے ساتھ خالی جگہ کو دیکھا جہاں شہر بانو موجود نہیں تھی لیکن انشاءاللہ ایک دن ضرور ہوگی۔

☆☆☆

گیٹ بند کر کے مڑا تو سامنے پروفیسر صاحب رشید چاچا سے باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے رشید چاچا کی لمبی لمبی باتیں سوچ کر ایک بار تو اس کا دل کیا کہ واپس اندر چلا جائے لیکن ساتھ پروفیسر صاحب بھی تھے اور وہ اسی طرف ہی آ رہے تھے، سو یوں اچانک دیکھ کر مڑ

جانا بھی خلاف آداب تھا۔

''السلام علیکم!'' زین شاہ نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! کیا حال ہے؟'' پروفیسر صاحب خوشدلی سے بولے۔

''رشید چاچا آپ کیسے ہیں؟'' شاہ زین نے رشید چاچا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بس کیا بتاؤں گھٹنوں کا درد ہی نہیں جاتا اور ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ تو اتنی گولیاں دے دیتا ہے کہ انسان ٹھیک ہونے کی بجائے بیمار ہو جائے، اوپر سے مہنگائی جان لینے کو آتی ہے، ایسے میں حالت کیسی ہو سکتی ہے۔'' رشید چاچا کا بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔

''غالباً تم کہیں جا رہے تھے؟'' پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

''جی بس کام سے جا رہا تھا۔''

''اچھا پھر اللہ حافظ۔'' پروفیسر صاحب نے شاہ زین سے کہا اور رشید چاچا کے ساتھ آگے کی جانب بڑھ گئے، وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے، شاہ زین بھی چلا گیا اسے پروفیسر صاحب سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا، لیکن رشید چاچا کی باتیں سننے کے لئے بہت زیادہ وقت اور دماغ چاہیے اس کا اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا، وہ انٹرنیٹ کیفے چلا آیا، اپنی سی وی مختلف کمپنیز کو میل کر کے وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا، وہ بہت پر یقین تھا کہ بہت جلد اسے بہت اچھی جاب مل جائے گی، Sign out کرنے سے پہلے ایک بار اس نے ان بکس چیک کیا جہاں حیدر کی میلز موجود تھیں۔

''شاہ زین تم کہاں ہو اگر انکل نے ایسا کہہ دیا ہے تو تمہاری ناراضگی ان کے ساتھ ہے مجھ سے تو رابطہ کرو کہاں جا رہے ہو کیوں جا رہے ہو، شہر بانو کو بھی کچھ نہیں بتایا اور پھر نمبر بھی بند کر دیا ہے، تم انکل اور مما کی وجہ سے ہمیں کیوں اگنور کر رہے ہو، یہ گھر تمہارا ہی ہے پلیز واپس آ جاؤ، میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔''

''نہیں حیدر وہاں میرا کوئی نہیں رہتا وہ گھر میرا تھا ہی نہیں۔'' اس نے افسردگی سے سوچا اور دوسری میل اوپن کی۔

''شاہ زین یار کوئی Reply تو کرو۔''

''زین پلیز واپس آ جاؤ شہر بانو بھی بہت پریشان ہے۔'' باقی میلز اس نے پڑھے بغیر ہی ڈیلیٹ کر دیں، وہ جانتا تھا کہ ہر میل میں ایک ہی بات ہوگی کہ واپس آ جاؤ اور وہ قسم کھا کر اس گھر سے نکلا تھا، کہ آئندہ کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئے گا، وہ رخشندہ ناز کو باور کروانا چاہتا تھا کہ یہ گھر صرف اس کا ہے، وہ اس کے پاپا ہیں اور وہ ان کا اکلوتا وارث، لیکن اس کے سارے دعوے جھوٹے نکلے تھے، اس کے دعوؤں کو جھوٹا کہنے والا کوئی اور شخص نہیں اس کا باپ تھا، اسے لگا جیسے کسی نے اسے بلندی سے نیچے گہری پستیوں میں پھینک دیا ہو، وہ سڑک پر کھڑا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا جب اس کی نظر سامنے پاسپورٹ آفس سے نکلتے حیدر پر پڑی، وہ گاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا، حیدر اس کے قریب سے گزر کر چلا گیا، وہ دیر تک اس راستے کی طرف دیکھتا رہا جہاں سے ابھی حیدر گزر کر گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' وہ بدستور اسی رخ میں کھڑا تھا جب کسی کے سلام کرنے پر چونک کر مڑا، موٹر سائیکل پر ایک گندمی رنگت کا نوجوان مسکراتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، کالی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی، شاہ زین نے اسے بالکل نہیں پہچانا تھا۔

''آئی ایم سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''پہچانو گے کیسے ہم پہلے کبھی ملے ہی نہیں۔'' وہ نوجوان ہلکا سا مسکرایا۔

''مجھے طیب کہتے ہیں طیب فراز پروفیسر۔''

''اوہ تو تم ہو طیب پروفیسر فراز احمد کے بیٹے۔'' شاہ زین اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو طیب نے ہلکا سا مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا، شاہ زین نے طیب کا جائزہ لیتی نظروں سے دیکھا، وہ چھبیس ستائیس سالہ خوبرو نوجوان تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا سب بتاتے تھے۔

''آپ کے والد صاحب بہت اچھے ہیں۔'' شاہ زین مروتاً نہیں کہہ رہا تھا، وہ حقیقتاً پروفیسر صاحب کو پسند کرتا تھا۔

''میرے ساتھ چلو میں بھی گھر کی طرف ہی جا رہا ہوں۔'' طیب نے سر کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''ہاں کیوں نہیں میں بھی ٹیکسی کا ہی ویٹ کر رہا تھا۔'' طیب نے راستے میں ایک ریڑھی کے پاس بائیک روکی۔

''جوس پیو گے؟''

''نہیں شکریہ۔'' ریڑھی والے کا جوس پینے کا سوچ کر ہی شاہ زین کا جی متلانے لگا تھا۔

''یہ بہت گندے ہوتے ہیں۔'' شاہ زین دل کی بات زبان پر لے ہی آیا، وہ ویسے بھی دل کی باتیں دل میں رکھنے کا قائل نہیں تھا، اس کی اسی صاف گوئی نے تو ہمیشہ اسے نقصان پہنچایا تھا، شاہ زین کا خیال تھا کہ طیب کو برا لگے گا اس نے اس طرح سے کیوں کہا، لیکن طیب کا ردعمل اس کی سوچ کے بالکل الٹ تھا، بالکل ویسے ہی جیسے شاہ زین کی بات طیب کے لئے حیرت انگیز تھی۔

''ہاں ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے۔'' طیب نے مسکرا کر کہا اور ریڑھی والے کو فریش سٹابری جوس بنانے کو کہا۔

''کرم دین اچھا سا جوس بنانا مہمان ہے ساتھ۔''

''طیب صاحب آپ فکر ہی نہ کرو۔'' ریڑھی والا فوراً سے جوس بنانے لگا۔

''اور سناؤ گھر میں سب ٹھیک ہے؟ بڑا بیٹا کس کلاس میں ہے۔''

''ماشا اللہ ایف ایس سی کر رہا ہے۔'' ریڑھی والا جوس بناتے ہوئے طیب کو بتا رہا تھا، شاہ زین حیران ہو کر یہ شخص کیسے کیسے لوگوں کو جانتا تھا، اس نے کبھی آج سے پہلے ان جیسے مزدوری کرنے والوں کے پاس رکنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا، شروع سے یہی سنتا آیا تھا کہ ایسے ریڑھیوں پر چیزیں بیچنے والے گھٹیا چیزیں بیچتے ہیں، کرم دین نے جوس کے گلاس طیب کے ہاتھ میں پکڑائے۔

''لو شاہ زین جوس پیو اگر پسند نہ آئے تو جس ریسٹورنٹ میں بولو گے چلوں گا۔'' شاہ زین نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ جوس کا گلاس پکڑا، جتنی بے تکلفی آج اس نے طیب کے ساتھ برتی تھی اتنی بے تکلفی حیدر اور شہر بانو کے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں تھی جوس واقعی ہی مزے کا تھا، جوس بناتے ہوئے شاہ زین نے دیکھا کرم دین نے صفائی کا خاص خیال رکھ رہا تھا۔

''ٹیسٹ واقعی اچھا تھا۔'' جوس پینے کے بعد طیب نے بائیک سٹارٹ کی تو شاہ زین پیچھے بیٹھتے ہوئے بولا، طیب نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''بہت ذکر سنا ہے تمہارا جب سے محلے میں آئے ہو سب کی زبانوں پر تمہارا ہی نام ہے، سب کو ایک نیا موضوع مل گیا ہے۔''

''ہاں ابھی نیا آیا ہوں نا اس لئے۔''

''ویسے میں تو نیا ہوں تمہارے بھی بہت چرچے ہیں محلے میں۔'' جواباً وہ بولا۔

''اور یکی۔'' طیب حیرانگی سے بولا۔

''ہاں اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا ہے۔''

''اور سناؤ کیا کرتے ہو؟''

''میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں اور تم؟'' طیب نے موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''آج کل فارغ ہی ہوں انٹرنیٹ کیفے آیا تھا، سی وی میل کرنی تھی۔''

''اوہ تو تمہارے پاس گھر میں انٹرنیٹ نہیں ہے۔''

''بتایا نا فارغ ہوں ابھی تو مجھے شفٹ ہوئے بھی زیادہ دن نہیں ہوئے ویسے بھی کوئی جاب ملنے تک میں نیٹ بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔'' شاہ زین اپنے مسائل یوں کسی کو نہیں بتاتا تھا لیکن نجانے کیوں طیب کو بتا گیا تھا، بتانے کے بعد اسے ایک لمحے کو افسوس ہوا کہ اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔

''کوئی بات نہیں تم میرے ساتھ انٹرنیٹ شیئر کر لو گھر بھی ساتھ ساتھ ہیں ہم وائی فائی شیئر کر لیں گے اور پھر شیئرنگ سے خرچہ بھی کم ہو جاتا ہے۔'' طیب نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چوک کراس کیا۔

''تھینکس یو۔'' شاہ زین طیب کا مشکور ہوا، اسے لگا کہ اس نے طیب کو بتا کر غلطی نہیں کی، اسے ابھی سمجھ آ رہا تھا کہ سب طیب کا دم کیوں بھرتے ہیں، اس کے ماں باپ کی تربیت کا گہرا اثر تھا کہ وہ سب کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا، وہ تھا ہی ایسا سب سے پیار کرنے والا سب کو اپنا گرویدہ بنا لینے والا، گھر پہنچنے تک دونوں کے درمیان بے تکلفی کا ایک رشتہ قائم ہو چکا تھا، حیدر کے بعد طیب دوسرا شخص تھا جو شاہ زین کا دوست بنا تھا، اچھا اور سچا دوست پھر کچھ ہی عرصے میں نکڑ والے رشید چاچا، بلو پہلوان، ماسی، بختاں، ماہم، عادل، پروفیسر صاحب، طاہرہ آنٹی، نسرین سب کے ساتھ وہ ایسے بے تکلف ہو گیا تھا جیسے برسوں سے انہیں جانتا ہو، بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جن کو جاننے کے لئے لمحے ہی کافی ہوتے ہیں اور بعض اوقات انسانوں کو سمجھنے میں ایک عمر گزر جاتی تھی، پاپا کو سمجھنے میں عمر کا ایک حصہ گزرا تھا لیکن پھر جو اندازہ لگایا کہ وہ اس کے پاپا ہیں جو اس سے بہت پیار کرتے ہیں وہ بھی غلط نکلا اسے یہاں آئے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا، اس ڈیڑھ مہینے میں اس نے بہت مشکل وقت گزارا تھا اور ابھی بھی گزار رہا تھا، اسے ابھی تک کوئی من پسند جاب نہیں ملی تھی، دو دن کہیں کوئی معمولی سی نوکری کرتا، تیسرے دن وہ نوکری ختم ہو جاتی، کبھی یہاں تو کبھی وہاں وہ جب بھی مایوس ہونے لگتا طیب اسے ڈھارس دیتا، اسے پرامید رکھتا، اچھے دنوں کے آنے کی آس دلاتا، وہ بہت سی جگہوں پر انٹرویوز دے کر آتا لیکن کہیں سے بھی جواب نہیں ملتا تھا، اب تو اسے لگنے لگا تھا کہ اس نے ایم بی اے کر کے غلطی کی ہو، ہر جگہ تو سفارش چلتی ہے اور سفارش اس کے پاس تھی نہیں اگر وہ اپنی سابقہ زندگی میں کہیں انٹرویو دینے جاتا تو شاید نہیں یقیناً اس کے سٹیٹس کی وجہ سے اسے اس کی من پسند جاب پلیٹ میں سجا کر پیش کی جاتی لیکن اب وہ شاہ زین حسن نہیں تھا جس کا باپ ملک کے چند بڑے انڈسٹریلسٹ میں شامل تھا، اب وہ شاہ زین تھا بہت ہی معمولی انسان جس کے پاس اپنے امیر باپ کے نام کا حوالہ نہیں تھا، اب وہ عام شخص تھا جس کے پاس پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے لئے بھی بہت کم پیسے ہوا کرتے تھے

اب تو اسے شہربانو کو پانا بھی ایک خواب ہی لگتا تھا، ایسا خواب جس کو صرف دیکھا ہی جا سکتا ہو جس کی کوئی تعبیر نہ ہو، اس تنگ دستی میں ایک بار بھی اسے اپنی سابقہ پرآسائش زندگی کا خیال نہیں آیا تھا، آتا بھی کیسے وہاں اس کے لئے نفرت تھی، حقارت تھی، روکھی سوکھی جیسی بھی کھاتا تھا اللہ کا شکر کرکے کھاتا تھا کہ اب کسی کا محتاج نہیں، اپنی محنت سے کما کر کھاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی کبھی بہت مایوس ہو جاتا۔

''شاہ زین تم اتنا مایوس کیوں رہتے ہو، اللہ کوئی راستہ دکھا دے گا اور پھر مایوسی گناہ ہے۔'' طیب اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے یہ گناہ ہو جاتا ہے۔'' شاہ زین اسی مایوسی سے کہتا اور طیب خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ جاتا۔

☆☆☆

''ماہی کدھر ہو؟'' طیب گھر میں داخل ہوتے ہوئے ماہم کو آواز دی، شاہ زین بھی ساتھ تھا، صحن میں سامنے دو اطراف میں برآمدہ تھا برآمدے سے ایک طرف سیڑھیاں چھت کی طرف جاتی تھیں، سیڑھیوں پر ریلنگ کے ساتھ چھوٹے گملوں میں پھول دار پودے لگے ہوئے تھے، صحن میں دیوار کے ساتھ کیاری میں بھی پھول دار پودے اگے ہوئے تھے، برآمدے میں چار کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں، طیب نے سارے گھر میں نگاہ دوڑائی کوئی بھی فرد سامنے نہیں تھا۔

''امی!'' طیب نے طاہرہ بیگم کو آواز دی۔

''خالہ امی گھر پر نہیں وہ بتول باجی کے گھر گئیں ہیں، تایا ابو یونیورسٹی ہیں اور ماہم آپا یونیورسٹی سے آ کر سو رہی ہیں۔'' عادل کامران کے ساتھ دیوار پر بیٹھا پڑھ رہا تھا وہیں سے بولا، جبکہ انار کی پلیٹ درمیان میں رکھی تھی۔

''یہ کون سا پڑھنے کا سٹائل ہے؟'' شاہ زین اوپر دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ ہمارا سٹائل ہے۔'' کامران جواباً کالر اکڑا کر بولا۔

''ہر وقت انار کھاتے رہتے ہو کچھ شاہ زین کے لئے بھی رہنے دو۔'' طیب نے اسے گھرکا۔

''قسم لے لیں جتنے انار ہماری طرف ہوتے ہیں وہی اتارتا ہوں۔'' جواباً وہ مسکینت سے بولا۔

''کون ہے؟'' ماہم بالوں کو کیچر کی مدد سے قید کرتی ہوئی کمرے سے باہر برآمدے میں نکلی۔

''ماہم پلیز دو کپ اچھی سی چائے تو بنا دینا۔'' طیب برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی ماہم سے بولا اور شاہ زین کو لے کر کمرے میں آ گیا۔

''اور ہاں کچھ میٹھا بھی لے کر آنا خوشی کی خبر ہے۔''

''اچھا!'' ماہم جمائی روکتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''فی الحال دس ہزار سیلری ہے آئی نو سیلری کم ہے لیکن نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔''

''آئی نو۔'' شاہ زین بے تاثر لہجے میں بولا۔

''کیا تمہیں خوشی نہیں ہے؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔''

''پھر اداس کیوں ہو؟'' شاہ زین کو ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر کی جاب ملی تھی۔

''آئی ڈونٹ نو۔'' شاہ زین نے پیچھے صوفے سے ٹیک لگائی، طیب خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر میں ماہم ٹرالی میں چائے کے ساتھ کیک اور بسکٹ لئے اندر داخل ہوئی۔

''تم آج یونیورسٹی سے جلدی واپس آ گئی ہو۔''

''ہاں ایک ہی کلاس تھی اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔'' ماہم چائے بناتے ہوئے بولی۔

''کیا خوشی کی خبر ہے؟'' ماہم نے چائے کا کپ طیب اور پھر شاہ زین کی طرف بڑھایا۔

''شاہ زین کو ایک سکول میں ٹیچنگ کی جاب ملی ہے۔'' طیب نے بتایا۔

''That,s a good news۔'' ماہم اٹھ کر طیب کے ساتھ دوسرے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی، طیب نے بسکٹ کی پلیٹ شاہ زین کی طرف بڑھائی تو شاہ زین نے رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلیٹ سے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

''شاہ زین ایک بات پوچھوں؟'' طیب بغور شاہ زین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پوچھو۔''

''تم نے گھر کیوں چھوڑا؟'' طیب کے پوچھنے پر شاہ زین کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''تم کیا کرو گے پوچھ کر۔''

''تم اگر نہ بتانا چاہو تو تمہاری مرضی۔'' کمرے میں کچھ لمحوں کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی جیسے کوئی موجود ہی نہ ہو۔

''جب انسان کو پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں کتنا حقیر ہے تو وہ خود اپنی نظروں میں بھی گر جاتا ہے اور نظریں اپنی ہوں یا کسی اور کی نظروں سے گرنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔'' شاہ زین چائے پر جمی جھلی پر نظر جمائے ہوئے بولا۔

دکھ، کرب، مایوسی، افسوس کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں، شاہ زین نے نظریں اٹھا کر طیب اور ماہم کو دیکھا، دونوں مکمل طور پر اسی کی طرف متوجہ تھے اور پھر ایک ایک کرکے وہ پرانے زخم کریدنے لگا۔

☆☆☆

رخشندہ ناز سے اس کی دشمنی بہت پرانی تھی، بیس سالوں سے وہ اس دشمنی کی آگ میں جل رہا تھا، رخشندہ ناز کی وجہ سے ہی اسے اپنے پاپا سے نفرت ہونے لگی تھی، یہ وہ عورت تھی جو باپ بیٹے کی محبت میں دراڑ بنی تھی اور اس دشمنی کو ختم کرنا اس کے بس میں نہیں تھا، جو نفرتیں بچپن میں ہی دل میں بیٹھ جائیں بڑی مشکل سے پیچھا چھوڑتی ہیں اور بعض اوقات تو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں، کلاس ٹو کا وہ بچہ جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد ہو جو اپنی ذہانت کی وجہ سے سکول میں تمام ٹیچرز کی آنکھوں کا تارا ہو جس کے دوست اس کی دوستی پر فخر محسوس کرتے ہوں، ایسا بچہ جس نے ہمیشہ ہر کسی سے محبت ہی سمیٹی ہو اور سب میں پیار بانٹا ہو، جس کا نفرتوں سے دور تک کا بھی رشتہ نہ ہو اگر ایسے بچے کو نفرتوں سے گہری آشنائی ہو جائے تو اکثر شخصیت ایسی ہی بنتی ہے جیسی شاہ زین حسن کی تھی۔

☆☆☆

''شاہ زین تم آج لنچ میں کیا لائے ہو؟''

''میں...... آج ماما نے مجھے ایک سینڈوچ بنا کر دیئے ہیں۔'' شاہ زین نے لنچ باکس کھولتے ہوئے بتایا۔

''اور تم؟''

''میرے پاس صرف ایک سیب ہے۔'' دوست نے بیگ سے اپنا ایپل نکالا۔

''کیوں تم نے زیادہ سیب کھانے تھے۔''

''میں نے آج فرنچ فرائز کھانے تھے لیکن میری ممی کہتی ہیں کہ مجھے پہلے ہی کھانسی ہے اور گلا بھی خراب ہے۔''

''تمہاری ممی بالکل ٹھیک کہتی ہیں جب

نہاری کھانسی ٹھیک ہو جائے گی تو میں بھی ماما سے کہہ کر فرنچ فرائز بنوا کر لاؤں گا پھر ہم مل کر کھائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دوست نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر بیگ سے سیب نکال لیا۔

"صفی تم بھی جلدی سے اپنا لنچ ختم کر لو پھر ہم مل کر کھیلیں گے۔" سیب کھاتے ہوئے دوست نے دو ڈیسک پیچھے بیٹھے اپنے دوست سے کہا جو کاپی پر ڈرائنگ بنا رہا تھا۔

"میں آج لنچ نہیں لایا کیونکہ میری ماما بیمار ہیں صبح مجھے اور دادا ابو کو پاپا نے ہی ناشتہ بنا کر دیا تھا۔"

"اوہ کیا ہوا تمہاری ماما کو؟" شاہ زین اپنا لنچ باکس اٹھا کر دو ڈیسک پیچھے صفی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ہمدردی سے بولا، دوسرا دوست جو سیب کھا رہا تھا وہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"میری ماما کو بہت سخت بخار ہے۔" صفی رونے لگا۔

"تمہاری ماما ٹھیک ہو جائیں گی ڈاکٹر نے میڈیسن تو دی ہوگی۔"

"ہاں لیکن ڈاکٹر انکل کہہ رہے تھے کہ ماما کے دماغ میں بخار ہے آپ انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروائیں میں نے خود سنا تھا ڈاکٹر انکل پاپا کو ایسے ہی کہہ رہے تھے۔"

"تمہاری ماما ہاسپٹل جائیں گی تو ٹھیک ہو کر واپس آ جائیں گی۔" بچے نے سیب کھانا چھوڑ کر تسلی دی۔

"نہیں ہاسپٹل میں ٹھیک ہو کر نہیں آتے۔" صفی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جب دادو ہاسپٹل گئی تھیں تو پاپا بھی یہی کہتے تھے کہ وہ ٹھیک ہو کر واپس آ جائیں گی لیکن دادو تو مر گئی تھیں۔"

"شاہ زین جو مر جاتے ہیں پھر وہ کدھر جاتے ہیں؟"

"پتہ نہیں؟" شاہ زین مایوسی سے بولا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں جانتا۔

"آج تمہارے پاس لنچ نہیں تھا تو یہ دوسرا سینڈوچ میری ماما نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔" شاہ زین نے کہا۔

"میرے لئے؟ انہیں کیسے پتہ چلا کہ میرے پاس لنچ نہیں ہے۔" صفی حیرانگی سے بولا۔

"میری ماما کہتی ہیں کہ میں جو بھی کروں انہیں پتہ لگ جاتا ہے۔" شاہ زین نے سینڈوچ صفی کی طرف بڑھایا تو اس نے خوشی سے تھام لیا، لنچ کرنے کے بعد تینوں پلے گراؤنڈ میں آ کر کھیلنے لگے، جہاں باقی بچے بھی اپنی اپنی کھیل میں مصروف تھے، شاہ زین ایک طرف لگے جھولے کے اوپر چڑھ گیا اور پھر اوپر سے چھلانگ لگا دی، چھلانگ لگانے کی وجہ سے اس کی دونوں ٹانگیں زمین پر جا کر لگی تھیں، جس کی وجہ سے گھٹنوں پر مٹی لگ گئی تھی، اس نے کالی پینٹ پر لگی مٹی کو ہاتھوں سے جھاڑا اور پھر سے چھلانگ لگانے کے لئے جھولے پر چڑھنے لگا، باقی دونوں دوست بھی اسے چھلانگیں لگانے میں مصروف ہو چکے تھے، تینوں ایک دوسرے کے مقابلے میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔

"شاہ زین!" وہ چھلانگ لگانے ہی لگا تھا جب میڈ کی آواز پر رک گیا۔

"تمہارے لئے فون ہے؟"

"میرے لئے؟" شاہ زین نے نیچے چھلانگ لگا دی۔

"تمہارے پاپا کا فون ہے۔" شاہ زین

اپنے یونیفارم سے مٹی جھاڑتے ہوئے میڈ کے پیچھے چل دیا آفس میں آ کر ہولڈ کی ہوئی کال ریسو کی۔

"ہیلو۔" شاہ زین نے ریسور کان سے لگایا۔

"بیٹا ابھی آپ کو ڈرائیور لینے آ رہا ہے بس آپ جلدی سے ڈرائیور کے ساتھ ہاسپٹل آ جاؤ۔"

"ہاسپٹل کیوں؟" وہ پریشانی سے بولا۔

"بس آپ آ جاؤ میں نے آپ کی ٹیچر سے بات کر لی ہے۔"

"لیکن۔" وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی تھی، وہ الجھا الجھا کلاس روم میں آیا اور اپنا بیگ اٹھا کر گیٹ کی جانب چل دیا، تھوڑی ہی دیر میں ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔

"انکل ہاسپٹل کیوں جانا ہے؟"

"بیگم صاحبہ سیڑھیوں سے گری ہیں اور ان کے سر پر چوٹ لگ گئی ہے۔" ڈرائیور نے بتایا، ہاسپٹل پہنچ کر اس نے دیکھا اس کی ماما کے سارے منہ پر سوجن تھی اور اس حد تک سرخ ہو رہا تھا جیسے کسی نے غبارے میں سرخ رنگ بھر دیا ہو، پاپا پریشانی کے عالم میں ماما کے پاس کھڑے تھے، جبکہ ڈاکٹر ماما کا چیک اپ کر رہا تھا نرس ڈاکٹر کی مدد کے لئے پاس ہی موجود تھی۔

"ماما!" وہ روتے ہوئے بولا، لیکن مما نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ماما!" شاہ زین نے ایک بار پھر کہا، ماما کی ڈرپ لگے ہاتھ میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

"ماما پلیز اٹھیں آپ کو کیا ہوا ہے، پاپا ماما کا چہرہ ایسا کیوں ہو رہا ہے یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں۔" وہ رونے لگا، ماما کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

"سر پلیز آپ بچے کو لے کر باہر جائیں۔" نرس کے کہنے پر اس کے پاپا اسے لے کر باہر آ گئے، ماما سے ملنے کے بعد پاپا نے اسے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا تھا، گھر آ کر وہ بہت رویا تھا، اللہ تعالیٰ سے بہت دعائیں کی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ جی پلیز میری ماما کو ٹھیک کر دیں میں آئندہ کبھی بھی ماما کو سیڑھیوں سے اترنے نہیں دوں گا، تنگ تو بالکل بھی نہیں کروں گا، آپ تو بچوں کی دعا جلدی سنتے ہیں پلیز اللہ جی میری ماما جلدی سے گھر آ جائیں۔" وہ رو رو کر دعائیں مانگتا رہا لیکن اس کی دعائیں فرش اور عرش کے درمیان ہی کہیں معلق ہو گئی تھیں شام مغرب کے بعد اس کی ماما واپس تو آ گئی تھیں لیکن مردہ حالت میں، وہ رو رو کر ماما کو اٹھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ماما کچھ بھی نہیں بولی تھیں۔

"پاپا مرنے کے بعد لوگ کہاں جاتے ہیں۔" اس نے معصومیت سے روئی ہوئی سوجی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے پاپا سے پوچھا تو پاپا نے اپنے آنسو پونچھے۔

"وہ اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں۔"

"اوپر آسمان پر؟" اس کے پوچھنے پر پاپا نے ہاں میں سر ہلایا۔

"پھر کیا وہ کبھی واپس نہیں آتے؟" پاپا نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"پاپا اللہ تعالیٰ نے ماما کو کیوں اپنے پاس بلا لیا ہے مجھے صبح سکول جانے کے لئے کون اٹھائے گا میری تو ابھی سٹوری بھی کمپلیٹ نہیں ہوئی، ماما اللہ تعالیٰ کے پاس چلی کیوں گئی ہیں وہ تو میری ماما ہیں آپ ان سے کہیں شاہ زین کہہ رہا ہے کہ پلیز واپس آ جائیں۔" پاپا نے اسے سینے سے لپٹا لیا ان کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی پھر وہ دن

شاہ زین کی زندگی میں جیسے ہمیشہ کے لئے رک گیا ہو، وہ بہت چڑچڑا ہو گیا تھا، سب سے لڑتا اس کا یونیفارم صاف نہیں ہوتا تھا، ہوم ورک بھی نامکمل ہی ہوتا ٹیچرز پوچھتے رہے، وہ خاموشی سے کھڑا رہتا۔

"تمہیں پتہ ہے شاہ زین کی ماما فوت ہو گئیں ہیں۔" اس نے کئی بار اپنے کلاس فیلوز کو افسوس سے اور پھر ترس کھاتی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا، ٹیچرز بھی اسے بہت ترس کھاتی نظروں سے دیکھتے اسے اپنے پاس بلا کر پیار کرتے۔ لیکن اب اس پر پیار نے بھی اثر کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ سب سے لڑنے لگا تھا پاپا شروع شروع میں اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ زندگی کے جھمیلوں میں معروف ہو گئے، رات سونے سے پہلے اسے گڈ نائٹ بولتے اور اپنے کمرے میں چلے جاتے، اس کا سارا دن کیسا گزرا؟ رات اسے ڈر تو نہیں لگے گا، کچھ بھی نہیں پوچھتے، اس کے پاس پاپا کو بتانے کے لئے بہت کچھ ہوتا لیکن پاپا کے پاس سننے کے لئے وقت کی سخت کمی ہوتی تھی، وہ سب سے الگ تھلگ رہنا شروع ہو گیا، کوئی ہمدردی سے بھی بات کرتا تو وہ سامنے والے سے لڑنا شروع کر دیتا، ٹیچرز سے بدتمیزی کرتا اس کے کلاس فیلوز آہستہ آہستہ اس سے دور ہونے لگے تھے اور کسی پر غصہ نہیں نکلتا تو ملازموں سے بدتمیزی شروع کر دیتا، ملازم بچارے پوری کوشش کرتے کہ شاہ زین کو ان کی کوئی بات بری نہ لگے، اس کا رزلٹ بھی برا آنے لگا تھا، گریڈز یکدم اے سے بی تک آ گئے تھے اس نے کھیل کود میں بھی حصہ لینا چھوڑ دیا تھا، اس کی رپورٹ جب پاپا تک پہنچی تو انہوں نے اسے بہت ڈانٹا پھر پیار سے بھی سمجھایا، ڈانٹ یا پیار سب بے اثر ہی رہا، پھر شکایات تو معمول کی بات ہو گئی تھی، آج شاہ زین نے فلاں بچے کی بکس پھاڑ دیں تو کبھی فلاں بچے کو زخمی کر دیا، دو بار وارننگ دینے کے بعد اسے سکول سے نکال دیا گیا۔

اس دن اس نے پاپا کو بہت پریشان دیکھا تھا، اس دن پاپا نے اسے ڈانٹا نہیں تھا، کچھ بھی نہیں کہا تھا بس پریشانی سے اسے دیکھا ضرور تھا، اس دن اس کے دل میں نجانے کیا بات آئی کہ اس کا دل بھر آیا اور وہ پاپا سے لپٹ کر بہت رویا، پاپا سے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی اس کی کوئی شکایت نہیں آئے گی سکول رپورٹ بھی اچھی ہی ہو گی، پاپا نے اسے شہر کے دوسرے سکول میں داخل کروا دیا، سکول بدلنے سے جیسے اس کی زندگی بھی بدل گئی ہو، وہ بہت خاموش ہو گیا تھا، اس نے دوست بنانے چھوڑ دیئے تھے بس خود تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اس سکول میں اس کا کوئی بھی دوست نہیں تھا، کلاس فیلوز اسے اکڑو، مغرور اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے رہتے لیکن وہ ان سے لڑتا نہیں تھا، ملازم لنچ باکس دے دیتا تو ساتھ لے آتا ورنہ سارا دن بھوکے گزار دیتا، شاہ زین کی سکول سے شکایات کیا آنا بند ہوئیں اسے ایک خوف نے آن گھیرا کہ اس کے پاپا اسے بھول گئے ہیں اب اس کی پاپا سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی، پھر ایک دن وہ اکیلا لاؤنج میں بیٹھا کارٹون دیکھ رہا تھا جب اسے پاپا کی ہنستے ہوئے کسی کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز آئی، اس نے جلدی سے انگلی پر حساب کیا کہ وہ پاپا سے کتنے دنوں بعد ملے گا، پچھلے ہفتے وہ سکول سے واپس آ کر لان میں کھیل رہا تھا جب پاپا نے اس سے بات کی تھی، شاہ زین نے صوفے پر بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کے پاپا اکیلے نہیں تھے، شاہ زین نے ایک عورت کو پاپا کے ساتھ اندر آتے دیکھا جس

نے جدید تراش خراش کا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔

"شاہ زین ان سے ملو یہ ہیں تمہاری نئی ماما۔" شاہ زین نے پاپا کے ساتھ کھڑی عورت کو دیکھا۔

"اور یہ تمہارا چھوٹا بھائی حیدر۔" شاہ زین کی نظریں پانچ سالہ حیدر پر جا کر رکیں جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور کچھ ڈرا ڈرا لگ رہا تھا۔

"اور رخشندہ یہ میرا بیٹا شاہ زین۔" پاپا نے رخشندہ ناز کو بتایا۔

"چلو بیٹا سلام کرو ماما کو۔" آج پاپا بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

"یہ میری ماما نہیں ہے، میری ماما تو مر گئی ہیں، میرا کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔" شاہ زین نے ریموٹ غصے سے صوفے پر پھینکا اور اوپر اپنے کمرے میں آ گیا، پاپا نے کیسے زبردستی مسکرانے کی اور اپنی شرمندگی چھپانے کی کوشش کی تھی، شاہ زین نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور حیدر کی نظروں نے نظروں سے اوجھل ہونے تک شاہ زین کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

رخشندہ ناز سے اس کی پہلے دن ہی نہیں بنی تھی، اس نے انہیں قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی رخشندہ ناز نے اسے اپنا مانا تھا رخشندہ ناز اسے جس کام سے منع کرتیں وہ وہی کام کرتا، پاپا کے سامنے رخشندہ ناز کا لہجہ اور انداز بہت شریں اور محبت بھرا ہوتا لیکن ان کی غیر موجودگی میں اسے ڈانٹنا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیتیں، حیدر اس کے پاس آنے کی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ اسے بھی کمرے سے نکال دیتا، اپنا سارا غصہ کھلونوں پر نکالتا، کبھی کبھار تو یہ غصہ حیدر بھی بھی نکل جاتا لیکن حیدر کچھ نہ کہتا اور نہ ہی ماما (رخشندہ ناز) کو بتاتا کہ شاہ زین نے اسے مارا ہے، حیدر اپنے کھلونے بھی شاہ زین کو کھیلنے کے لئے دیتا لیکن شاہ زین ہمیشہ اس کے کھلونے توڑ دیتا، شاہ زین کو لگتا کہ دونوں ماں بیٹے نے مل کر اس سے اس کے پاپا کو چھین لیا ہو، جب وہ پاپا کو رخشندہ ناز یا حیدر سے ہنستے ہوئے بات کرتے دیکھتا تو حسد محسوس کرتا کہ وہ صرف اس کے پاپا ہیں پھر وہ حیدر سے یا رخشندہ ناز سے کیوں اس طرح ہنس کر بات کرتے ہیں مجھ سے کیوں نہیں، وہ خود کو بہت غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا اسے لگتا کہ رخشندہ ناز اسے گھر سے نکال دیں گی، اس دن رخشندہ ناز اپنی نئی ساڑھی پہنے اپنی کسی دوست کے گھر جانے کے لئے تیار ہوئی تھیں جب وہ ملازمہ سے فرنچ فرائز بنوا کر ان پر کیچپ کا ڈھیر لگائے اپنے روم میں جا رہا تھا، وہ پلیٹ سے فرنچ فرائز کھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اچانک اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کیسے اس کی رخشندہ ناز سے جو سیڑھیاں اتر رہی تھیں ٹکر ہو گئی اور کیچپ اور آئل نے رخشندہ ناز کی ساڑھی پر گہرے نشان چھوڑ دیئے۔

"جاہل بدتمیز یہ کیا کیا ہے؟" وہ اپنی نئی ساڑھی پر کیچپ اور آئل کے نشان دیکھ کر چلا اٹھیں، رخشندہ ناز کی آواز سن کر وہ ایک لمحے کے لئے ڈر گیا، فرنچ فرائز سیڑھیوں پر گر چکے تھے۔

"یہ دیکھو کیا ہے تم نے۔" رخشندہ ناز نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا شور کی آواز سن کر حیدر بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"یہ میرا اور میری ماما کا گھر ہے نکل جاؤ تم یہاں سے۔" شاہ زین چیخ کر بولا۔

"میں تم دونوں کو نکال دوں گا۔" شاہ زین نے رخشندہ ناز کو دھکا دینا چاہا لیکن وہ انہیں ایک قدم بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکا تھا۔

"بدتمیز۔" رخشندہ ناز نے غصے سے ایک تھپڑ شاہ زین کے گال پر دے مارا، شاہ زین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"تم نکل جاؤ میرے گھر سے۔" شاہ زین نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے حیدر کو زور سے دھکا دیا، جس کا سر ساتھ ہی پڑے میز کے کنارے پر جا لگا، حیدر نیچے گر گیا، اس نے جھپٹ کر میز کے ساتھ نیچے گرے حیدر پر ایک اور حملہ کیا، حیدر کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"چھوڑو اسے۔" رخشندہ ناز جلدی سے حیدر کی طرف آئیں جو شاہ زین کے پنجوں میں کسی شکار کی طرح موجود تھا۔

"میں مار دوں گا اسے۔" شاہ زین بالکل بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا ایسے جیسے وہ جنونی ہو گیا ہو جو ہوش و حواس میں نہیں ہوتا۔

"شاہ زین۔" شاہ زین کا جنون پاپا کی غصہ بھری گرجدار آواز سننے پر ٹوٹا، شاہ زین کا رنگ یکدم فق ہو گیا، رخشندہ ناز نے جلدی سے حیدر کو تھاما جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، اس دن پاپا نے اس کی بہت پٹائی کی تھی، اسے بہت مارا تھا، اسے رات کا کھانا بھی نہیں ملا تھا اور سزا کے طور پر پاپا نے اسے سٹور روم میں بند کر دیا تھا، وہ رات شاہ زین کی بیانک ترین راتوں میں سے ایک رات تھی، حیدر کو پٹی کروانے کے بعد دوائی دے کر سلا دیا، رات بارہ بجے حیدر کی آنکھ کھلی تو اسے پہلا خیال شاہ زین کا آیا، اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کی لائٹ آن کی اور پھر اپنا جوتا پہنا اور آرام سے دروازہ کھول کر باہر آیا، ہر طرف خاموشی کا راج تھا، وہ شاہ زین کے کمرے میں آیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن شاہ زین کمرے میں نہیں تھا، اسے یاد آیا انکل حسن نے اسے سٹور روم میں بند کیا تھا، حیدر دبے پاؤں کچن میں آیا اور فریج سے کچھ فروٹ اور کیک کے دو بڑے پیس نکال کر ٹرے میں رکھ کر سٹور روم میں شاہ زین کے لئے لے کر آیا، شاہ زین نے ٹرے نیچے رکھ کر دروازہ کھولا، ترچھی روشنی سٹور روم میں داخل ہوئی تو شاہ زین جو ایک طرف ڈرا سہا بیٹھا تھا اس کا وجود روشن ہوا اندر داخل ہو کر حیدر نے ٹرے ایک بار پھر نیچے رکھی اور چھوٹی میز کھینچ کر سوئچ کے پاس کیا اور سٹور کی لائٹ آن کی، سارا کمرہ یکدم روشن ہو گیا، روشنی میں شاہ زین کی آنکھیں چندھیا گئیں، بہت زیادہ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجھ چکی تھیں، کچھ ٹوٹا فرنیچر اور گھر کا باقی فالتو سامان بے ترتیب انداز میں پڑا ہوا تھا، حیدر ٹرے اٹھا کر شاہ زین کے پاس آ گیا، شاہ زین نے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم نے کھانا نہیں کھایا۔" حیدر نے ٹرے شاہ زین کے سامنے رکھی اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں چلے جاؤ۔" آنسو جو تھوڑی دیر کو رکے تھے پھر سے بہنے لگے، شاہ زین نے اونچی آواز میں بولنے کی کوشش کی لیکن زیادہ رونے اور بھوک کی وجہ سے وہ اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اس سے اونچی آواز میں بولا بھی نہیں گیا۔

"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا تمہاری ماما تو زندہ ہیں نا۔" شاہ زین نے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

"ہاں لیکن ڈائننگ ٹیبل پر تم نہیں تھے نا میرے ساتھ والی چیئر خالی تھی۔" حیدر نے کیک کا ایک پیس شاہ زین کو پکڑایا اور دوسرا پیس خود کھانے لگا، شاہ زین کو شرمندگی نے آن گھیرا حیدر کے سر پر چوٹ جو سخت لگی تھی اور وہ بھی شاہ

زین کی وجہ سے۔

"زینی بیٹا اگر کوئی کام غلط ہو جائے تو فوراً سوری کر لو اور غلط کام کو ختم کرنے کی کوشش کرو تاکہ آئندہ کبھی غلطی نہ ہو۔" ایک رات سونے سے پہلے کہانی کے آخر پر ماما نے اسے کہا۔

"I am sorry۔" شاہ زین شرمندگی سے کمزور سی آواز میں بولا۔

"کیوں؟"

"میں نے تمہیں زخمی کیا لیکن میں نے فریج فرائز جان بوجھ کر نہیں گرائے تھے۔" شاہ زین نے روتے ہوئے وضاحت دی۔

"میں جانتا ہوں تم پلیز روؤ مت۔" حیدر کے لئے پریشان شاہ زین نے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھے۔

"یہ تمہاری ماما کی تصویر ہے۔" کیک کھاتے ہوئے حیدر نے شاہ زین کی گود میں پڑی تصویر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" شاہ زین نے ہاں میں سر ہلایا، اس نے ابھی تک کھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"میں دیکھ لوں؟"

"ہاں۔" شاہ زین نے فوٹو فریم حیدر کو پکڑایا۔

"تمہاری ماما بہت اچھی تھیں؟"

"ہاں۔"

"وہ تم سے بہت پیار کرتی تھیں؟"

"ہاں بہت زیادہ۔" شاہ زین کیک کھاتے ہوئے بولا۔

اس رات حیدر نے دوستی کا بیج بویا تھا اور شاہ زین نے اسے اعتماد کا پانی دیا تھا اس رات وہ لڑے بغیر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے، شاہ زین اسے اپنی ماما کی باتیں بتاتا رہا تھا، اگلے دن رخشندہ ناز کے نجانے پاپا کو کیا کہا کہ انہوں نے شاہ زین کو بورڈنگ بھجوا دیا۔

شاہ زین کے دل میں رخشندہ ناز کے لئے نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی اسے بورڈنگ بھجوا کر بھی مسئلے ختم نہیں ہوئے تھے، بلکہ اور بڑھ گئے تھے، شاہ زین کی سکول رپورٹ اور بری ہو گئی تھی، وہاں اس کے جھگڑے اور بدتمیزیاں اور بڑھ گئی تھیں، آئے دن اس کی لڑکوں سے لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

"یار آخر تم چاہتے کیا ہو مجھے سکون سے جینے کیوں نہیں دیتے، ہر جگہ تمہاری وجہ سے بے عزت ہوتا ہوں۔" ایک دن پاپا نے تنگ آ کر پوچھا، وہ کچھ بھی نہیں بولا بس خاموشی سے کھڑا رہا، یونہی شب و روز گزرتے گئے، رخشندہ ناز سے نفرت بڑھتی گئی اور حیدر کے ساتھ دوستی پروان چڑھتی رہی، وہ اے لیولز میں تھا جب ایک دن اس کی اپنے ایک سکول فیلو سے لڑائی ہو گئی، وہ کچھ زخمی ہو گیا، اس کے دوستوں نے شاہ زین سے لڑائی کے لئے میدان گرم کر لیا، شاہ زین احسن سے لڑ کر کینٹین آ کر بیٹھ گیا، ایک لڑکے کے بازو ٹوٹ گیا تھا جبکہ چند دوسرے لڑکوں کو کچھ چوٹیں آئیں تھیں، شاہ زین کے ہاتھ پر بھی زخم آیا تھا، جب حیدر کو پتہ چلا کہ کچھ لڑکوں نے مل کر شاہ زین سے لڑائی کی ہے وہ اپنے دوستوں کو لے کر پہنچ گیا اور ان لڑکوں کی دھلائی کر آیا اور کینٹین آ کر شاہ زین کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کا زخم صاف کرنے لگا۔

"چھوٹے ذرا جلدی سے دو فریش ایپل جوس تو لاؤ۔" حیدر نے پٹی کرتے ہوئے وہاں کام کرنے والے چھوٹے لڑکے سے کہا تو شاہ زین مسکرا دیا، حیدر نے بھی مسکرانے میں شاہ زین کا ساتھ دیا اور اس کی پٹی کرتا رہا، اس دن

پاپا نے حیدر اور شاہ زین کو بہت سخت سنائیں۔

''جانتے ہو تم دونوں کی وجہ سے میں سکول والوں کے سامنے کتنا شرمندہ ہوا ہوں، کتنی باتیں سننی پڑیں ہیں مجھے۔'' زیادہ ڈانٹ شاہ زین کے حصے میں ہی آئی تھی رخشندہ ناز نے حیدر کو ہمیشہ کی طرح شاہ زین سے دور رہنے کا کہا تھا۔

لیکن اس دن پہلی بار شاہ زین کو پاپا کا اسے یوں ڈانٹنا برا نہیں لگا تھا، نہ ہی حیدر نے اس دن ماما کے سامنے شاہ زین کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، دونوں خاموشی سے سر جھکائے ایک طرف کھڑے رہے تھے اور ڈانٹ کھانے کے بعد کمرے میں آ کر شاہ زین حیدر کے گلے ملا، دونوں اس لڑائی پر دل کھول کر ہنسے تھے، اتنا ہنسے تھے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''تھینک یو سو مچ۔'' شاہ زین حیدر کا مشکور ہوا۔

''اگر دوست سمجھتے ہو تو شکریہ واپس لو۔'' حیدر مصنوعی خفگی سے بولا۔

''تو پھر دو میرا شکریہ واپس۔'' شاہ زین اپنی ہتھیلی آگے کرتے ہوئے بولا تو حیدر نے مسکرا کر شاہ زین کے گلے لگ گیا دونوں کی آنکھیں بھر آئیں تھیں اور دونوں ہی اپنے آنسو ایک دوسرے سے چھپا گئے تھے۔

☆☆☆

جب شاہ زین ایم بی اے کے فائنل ائیر میں تھا حیدر اے لیولز کے آخری سال میں تھا، یونیورسٹی میں بھی اسے وہی پرانے القاب ملے تھے جھگڑے یہاں بھی برقرار تھے، لیکن جھگڑوں کی نوعیت بدل گئی تھی، لڑائی کا آغاز پہلے بھی وہ نہیں کرتا تھا، لیکن اب اکثر وہ لڑائیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تھا، لڑکیاں اسے مغرور کہتی وہ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی دیکھ چکا تھا یہی وجہ تھی کہ دوسرے لڑکوں کے دلوں میں اس کے لئے رقابت تھی اگر کوئی لڑکی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اکثر بدتمیزی کر جاتا، جس کی وجہ سے کوئی بھی اسے مخاطب کرنے میں اپنے الفاظ چناؤ بہت سوچ سمجھ کر کرتا تھا، یہ بات جہاں اس کی شخصیت میں ایک خامی کی مانند تھی وہیں اس کی خوبی بھی تصور کی جاتی تھی، وہ کسی سے بے مقصد بات نہیں کرتا تھا، وہ عام لڑکوں کی طرح نہیں تھا۔

''اول تو شاہ زین بولتا نہیں ہے اور اگر بولتا ہے تو بہت ہی تلخ۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے جونیئر گروپ کو باتیں کرتے ہوئے سنا، چار سے پانچ لڑکیوں کا گروپ سیڑھیوں پر ایک طرف بیٹھا محو گفتگو تھا اور ان کی گفتگو کا موضوع شاہ زین حسن تھا، شاہ زین کے قدم رک گئے۔

''ہاں یہ تو ہے مجھے لگتا ہے کہ اس نے ہر وقت چپ کا روزہ رکھا ہوتا ہے اور افطاری سڑی ہوئی باتوں سے ہوتی ہے۔'' ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تو باقی سب نے ہنسنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

''لیکن شاہ زین جیسا بھی ہے بہت گریس فل ہے۔''

''تو کیا پھر شادی کروا دیں۔'' ایک ہنستے ہوئے بولی۔

''اللہ معاف کرے ویسے ہی تعریف کی ہے اب بددعا تو مت دو۔'' وہ لڑکی دہل کر بولی، شاہ زین خاموشی سے ان کے پاس سے گزر کر سیڑھیاں اتر گیا، انہوں نے اسے سیڑھیوں سے نیچے اترتے دیکھا تو دانتوں تلے زبان دبا لی۔

''یار اگر اس نے سن لیا تو لڑنے ہی نہ آ جائے مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''اینویں ہی لڑنے آ جائے گا، تعریف بھی کی ہے گریس فل بھی تو کہا ہے۔'' ان میں سے ایک تسلی دیتے ہوئے بولی، شاہ زین نے ڈیپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے آن کے کمنٹس سنے اور بیرونی سیڑھیاں اترتے ہوئے مسکرا دیا کہ اس کے اردگرد کے لوگ اسے کوئی بھوت سمجھتے ہیں، وہ ایسی باتیں سننے کا عادی ہو چکا تھا، اکثر ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس کے محدود سے تعلقات میں حیدر کی دوستی، پاپا سے رنجش اور رخشندہ ناز سے نفرت شامل تھی، باقی سب تعلقات صرف وقتی ہی ہوا کرتے تھے جو اکثر وقت سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے تھے، حیدر اسے اکثر کہتا تھا کہ شاہ زین تم بہت جذباتی ہو بہت جلد غصہ میں آ جاتے ہو اور وہ جواباً کہتا کہ میں اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یونیورسٹی میں اس کا سارا دھیان اپنا تعلیم میں تھا، وہ ایم بی اے کر کے امریکہ کی کسی بھی اچھی یونیورسٹی سے سی اے کرنا چاہتا تھا اور اپنے اس خواب کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، جبکہ ایک ہی مقصد تھا رخشندہ ناز کو شکست دینا ان کو اپنے گھر اور بزنس سے بے دخل کرنا اور اس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا تھا۔

''شاہ زین کیا تم کبھی ماما کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتے۔''

''نہیں میں کبھی رخشندہ ناز کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتا۔'' حیدر کے کہنے پر وہ صاف گوئی سے بولتا تو حیدر خاموش ہو جاتا، ایسا ہی سوال وہ اکثر رخشندہ سے بھی کرتا تھا لیکن ان کی طرف سے بھی ویسا ہی جواب ملتا تھا جیسا شاہ زین کی طرف سے آتا تھا، حیدر شاہ زین کی بات پر خاموش ہو جاتا تھا، محبت ہو یا نفرت وہ دل میں رکھنے کا قائل نہیں تھا، اسے اب بھی یہی لگتا تھا کہ اس کے پاپا نے رخشندہ ناز کی وجہ سے اسے بھلا دیا ہے، رخشندہ ناز کے ساتھ دشمنی کو ہوا اس کی محرومیوں نے دی تھی جو کہ اب انتقام میں بدل چکی تھی۔

☆☆☆

وہ لائبریری میں بیٹھا اپنے تھیسز کے لئے ڈیٹا سرچ کر رہا تھا، سامنے میز پر لیپ ٹاپ پڑا ہوا تھا لیپ ٹاپ کے ساتھ موبائل فون پڑا ہوا تھا، وہ کتاب میز پر رکھے پڑھنے میں مصروف تھا، جب میز پر پڑا موبائل وائبریٹ کرنے لگا، شاہ زین نے نظریں کتاب سے ہٹا کر موبائل فون کو دیکھا، حیدر کا نام اور تصویر جگمگا رہی تھی، شاہ زین نے فون کاٹ دیا اور اپنے باقی نوٹس سمیٹنے لگا، لیپ ٹاپ Sutt down کیا اور بیگ میں رکھا اور لائبریری سے باہر آ گیا، باہر آ کر حیدر کو کال بیک کی۔

''ہیلو ہاں زین یار کدھر ہو؟'' حیدر فون اٹھاتے ہی بولا۔

''میں اس وقت کہاں ہو سکتا ہوں یونیورسٹی میں ہی ہوں۔''

''کب تک فارغ ہو جاؤ گے؟''

''کیوں کوئی خاص کام ہے کیا؟''

''نہیں خاص نہیں لیکن کام ہے۔''

''کیا؟''

''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور ورکشاپ میں کھڑی ہے تم پلیز مجھے کالج سے پک کر لینا میں ابھی فارغ ہی ہوں۔''

''ابھی تو میں کلاس لینے جا رہا ہوں میری بھی آج کی لاسٹ کلاس ہے تم ایک گھنٹہ ویٹ کر لو میں واپسی پر تمہیں بھی پک کر لوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے پھر ملتے ہیں۔'' شاہ زین نے فون کاٹ دیا، کلاس کے بعد شاہ زین نے

حیدر کو آنے کا میسج کیا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کی، ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ حیدر کے کالج پہنچ چکا تھا، حیدر پارکنگ ایریا میں ہی کھڑا کسی لڑکی سے بات کر رہا تھا، شاہ زین کو دیکھ کر اس نے پانچ منٹ رکنے کا اشارہ کیا شاید کوئی ضروری بات چل رہی تھی، حیدر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لڑکی مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی اور کچھ پریشان بھی لگ رہی تھی، کمر تک آتے ریشمی کالے بالوں کی ہلکی سی چٹیا بنا رکھی تھی سفید ٹراؤزر پر ہلکے پیلے رنگ کے پرنٹ کی لانگ شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ سفید ریشمی دوپٹہ کندھے پر لہرا رہا تھا، شاہ زین وہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے حیدر کو اس لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھنے لگا، پھر اس لڑکی نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو حیدر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسائنمنٹ اس کو پکڑا دی، اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسائنمنٹ تھام لی، اس کے لبوں کی جنبش بتا رہی تھی کہ اس نے حیدر کو تھینک یو بولا ہے، حیدر اسے اللہ حافظ کہتے ہوئے گاڑی کی طرف آ گیا۔

''ہائے۔'' حیدر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہائے۔'' شاہ زین نے آخری نظر کالج کے اندر جاتی لڑکی کو دیکھا جس کے بال کمر پر جھول رہے تھے اور پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' شاہ زین نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کون لڑکی...... اچھا وہ، شہر بانو نام ہے اس کا۔''

''شہر بانو!'' شاہ زین نے سامنے روڈ پر دیکھتے ہوئے زیر لب نام دہرایا۔

''کیوں خیریت؟'' حیدر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں خیریت ہی تھی تمہاری اس کے ساتھ کوئی پرابلم چل رہی تھی؟''

''ہاں ایک چھوٹی سی پرابلم تھی لیکن اب سولو ہوگئی ہے۔''

''کل Assignment submit کروانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے اور اس کی ابھی تک اسائنمنٹ نہیں بنی میں نے کہا کہ تم میری لے لو میں رات میں اور بنا لوں گا۔''

''تم نے اپنی کیوں دی وہ خود بھی بنا سکتی تھی۔''

''آج اس کی پھپھو کی ڈیتھ ہوگئی ہے اور اسے ابھی وہیں جانا ہے اس لئے نہیں بنا سکتی تھی وہ تو لے ہی نہیں رہی تھی لیکن میں نے بھی دے ہی دی بہت اچھی نیچر ہے اس کی۔'' حیدر تفصیلاً بولا۔

''اوہ تو تمہیں اسے ڈراپ کر دینا چاہیے تھا۔''

''اوہ یاد ہی نہیں رہا دماغ میں بات ہی نہیں آئی۔'' حیدر افسوس سے بولا۔

''ہائے داوے تم اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔'' حیدر شاہ زین کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' شاہ زین نے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر نظریں سامنے روڈ پر منتقل کر دیں، اس شام جم میں بھی وہی لڑکی اس کے سر پر سوار رہی تھی، وہ ٹھیک طرح سے کھیل بھی نہیں پا رہا تھا۔

دماغ کی رو بار بار بھٹک کر اسے کے مسلسل نہ میں ہلتے سر کی طرف ہی جا رہی تھی، کمر پر جھولتے سیاہ بالوں کی چٹیا نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود نظروں کے سامنے تھی، وہ مسکراہٹ تو جیسے آنکھوں میں بس گئی تھی۔

''شہر بانو نام ہے اس کا۔'' شاہ زین نے اپنے سامنے رکھے نوٹس کے بے بسی سے دیکھا اور پھر نوٹس ایک طرف رکھ دیئے، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے حواسوں پر کیوں سوار ہوتی جا رہی ہے، وہ اٹھ کر باہر لان میں آ گیا، رخشندہ ناز اور پاپا لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہ الٹے قدموں واپس پلٹا، وہ پاپا اور رخشندہ ناز کے سامنے بہت کم جاتا تھا کیوں وہ اس کے سامنے ہوتی تھیں اس سے بدتمیزی کے علاوہ کچھ بھی نہیں بولا جاتا تھا، جب تک بچہ تھا اسے پاپا کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی، وہ جب بھی اسے اپنے پاس بلاتے اسے دکھاوا ہی لگتا بالکل ویسا ہی دکھاوا جیسا دکھاوا رخشندہ ناز پاپا کے سامنے اس سے میٹھا بول کر کرتی تھیں، لیکن اب وہ بچہ نہیں تھا، پاپا کی کمی اب بھی محسوس تھی لیکن اب یہ بات پاپا سے کہنی چھوڑ دی تھی۔

''شاہ زین!'' پاپا کی پکار پر وہ رک گیا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''آؤ بیٹھو۔''

''نہیں شکریہ۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''کیوں؟''

''اب مجھے آپ کے پاس بیٹھنے کی عادت نہیں رہی۔'' شاہ زین نے بھرپور کوشش کی تھی کہ اپنا لہجہ متوازن رکھے لیکن اتنی کوشش کے باوجود بھی لہجے میں طنز کی آمیزش ہو ہی گئی تھی۔

''اور پھر یہاں میری ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''ہر کام ضرورت کے لئے نہیں کیا جاتا۔'' وہ جانے کے لئے واپس مڑا لیکن پاپا کی بات پر پھر سے رک گیا۔

''ہر کام ضرورت کے تحت ہی کیا جاتا ہے کسی کو پھانسنا بھی کسی سے کچھ چھین لینا بھی۔'' شاہ زین نے رخشندہ ناز کو دیکھتے ہوئے تنفر سے کہا، رخشندہ ناز نے کرسی پر پہلو بدلا، نفرت اور غصے کی ایک لہر ان کے اندر دوڑ گئی، جی چاہا کہ سامنے کھڑے شاہ زین کے منہ پر ایک تھپڑ ماریں یا پھر کم از کم اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے دو چار گالیاں تو ضرور دیں لیکن صورتحال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموشی میں ہی عافیت جانی اور اپنے غصے کو پی گئیں۔

''تمہاری نفرت کی کوئی انتہا بھی ہے؟''

''کوئی انتہا نہیں۔'' شاہ زین نے سرد لہجے میں کہا اور واپس پلٹ آیا، دونوں کو ایک دوسرے کو جلانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی میں بھی اس کا دھیان بار بار شہر بانو کی طرف ہی جاتا رہا، کلاس میں کس موضوع پر ڈسکشن ہو رہی ہے وہ کلاس میں موجود ہونے کے باوجود بھی دماغی طور پر غیر حاضر تھا۔

''شاہ زین تم بتاؤ کیا ایسا ہونا چاہیے۔''

''شاہ زین!'' پروفیسر نے دوسری بار اسے مخاطب کیا لیکن وہ ایسے بیٹھا تھا جیسے کلاس میں موجود ہی نہ ہو، ساتھ بیٹھے کلاس فیلوز اسے بازو سے ٹہوکا دیا تو وہ چونک گیا۔

''یس سر!'' اس کے اس عمل پر ساری کلاس میں ہلکی سی ہنسی بلند ہوئی۔

''شاہ زین تم کہاں گم ہو؟'' پروفیسر کے کہنے پر وہ کچھ شرمندہ سا ہوا اور اپنی اس بے خیالی پر خود کو کوسنے لگا، لیکن کلاس روم سے باہر آ کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بار حیدر کو کال بھی کی لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا، کچھ دیر کے بعد اسے حیدر کی کال آئی۔

''ہیلو۔''

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے حیدر بولا، لیکن شاہ زین کو سمجھ نہ آئی کہ کیا بات کرے، اس سے کیا پوچھے وہ خاموش ہی رہا۔

”شاہ زین!“ حیدر نے اسے پکارا۔

”زین خیریت ہے نا؟“ حیدر شاہ زین کی اس چپ سے پریشان ہو گیا تھا۔

”تمہاری Presentation تھی نا آج ہو گئی ہے؟“

”ہاں ہو گئی ہے۔“

”کیسی ہوئی؟“

”بہت اچھی۔“

”او کے اللہ حافظ۔“ شاہ زین نے فون بند کرنا چاہا لیکن حیدر کی آواز پر رک گیا۔

”پکی بات ہے نا؟“ حیدر کی تسلی نہیں ہوئی تھی اسے شاہ زین کی کال کرنے کا مقصد سمجھ نہیں آرہا تھا۔

”ہاں۔“ شاہ زین نے فون کاٹ دیا وہ چاہتے ہوئے بھی زبان پر شہربانو کا نام نہیں لا سکا تھا، اگلا پورا ہفتہ اس کا یونہی بے چین ہی گزرا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ خود کو شہربانو کی سوچ کے سامنے اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا تھا، لیکن اس بے چینی میں بھی عجیب سکون تھا، جو بھی تھا اسے اس کے بارے میں سوچنا اچھا لگ رہا تھا، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ حیدر کے کالج بے وجہ کتنے ہی چکر لگا چکا تھا، حیدر نے کئی بار اس سے یوں گم صم رہنے کی وجہ پوچھی لیکن وہ حیدر کو یہ بات نہیں بتا سکا کہ وہ خود کو ایک لڑکی کے خیالوں سے آزاد نہیں کروا پا رہا، پھر ایک شام جم سے واپسی پر اس نے اپنی موجودہ کیفیت حیدر کو بتا ہی دی۔

”تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“ حیدر ناراضگی سے بولا۔

”مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ میں ایسا کیوں محسوس کرتا ہوں۔“ شاہ زین بے بسی سے بولا۔

”اگر ایسا جان بوجھ کر محسوس کیا جائے تو پھر شاید کسی کو بھی محبت نہ ہو یا پھر شاید ہر کسی کو محبت ہو جائے محبت اختیار میں نہیں ہوتی۔“

”تم اتنی بڑی بڑی اور سیانی باتیں کیسے کرتے ہو؟“ شاہ زین حیدر کو سرختے ہوئے بولا۔

”میں ہوں ہی سیانا۔“ حیدر ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسکرایا۔

”شاہ زین کیا تم واقعی ہی سیریس ہو؟“ حیدر نے شاہ زین سے تسلی چاہی۔

”اگر مجھے فلرٹ کرنا ہوتا تو تم سے بات نہیں کرتا۔“ شاہ زین سنجیدگی سے بولا۔

”خیر اب تمہارے بارے میں بھی کچھ سوچتے ہیں تم اپنے فیوچر پلان تو بتاؤ۔“ حیدر نے مسکرا کر پوچھا۔

”آج کل تو مجھ سے کچھ بھی نیا پلان نہیں ہو رہا ہاں البتہ محبت ہونے سے پہلے تک میں فارن جانا چاہتا تھا اب بھی یہی چاہتا ہوں And you know that is my dream۔“

”ہاں بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں اور اب فارن جانے سے پہلے تم شہربانو سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہو۔“ حیدر کے کہنے پر شاہ زین نے ہاں میں سر ہلا دیا، حیدر شاہ زین کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور گاڑی کا ہارن بجایا، ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے مستعدی سے گیٹ کھول دیا، گاڑی لمبی راہ داری سے ہوتی ہوئی گیراج میں آکر رکی۔

”میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں چلو گے؟“

”نہیں۔“ شاہ زین نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا حیدر گاڑی ریورس کر کے لے گیا۔

☆☆☆

”شاہ زین کا ایم بی اے کمپلیٹ ہونے ہی والا ہے میں سوچ رہا ہوں کہ اسے ہائر اسٹینڈیز کے لئے امریکا بھیج دوں۔“ حسن مراد نے اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں بات کی تو چائے پیتی رخشندہ ناز کا منہ بن گیا۔

”کیا ہوا؟“ حسن مراد نے اخبار سے نظریں ہٹا کر پوچھا اور میز پر رکھا چائے کا کپ اٹھا لیا، شاہ زین کے قدم کوریڈور میں ہی رک گئے، اسے لگا کہ وہ خود ہی پاپا کے بارے میں غلط رائے رکھتا ہے اس کے پاپا ابھی بھی اسی سے پیار ہی کرتے ہیں، جبھی تو اس کے دل میں چھپی بات بن کہے سمجھ گئے تھے۔

”حسن کیا ضرورت ہے اسے باہر بھیجنے کی میرا مطلب ہے کہ اس کی نیچر کا تو آپ کو پتہ ہے ہر وقت کی لڑائیاں جھگڑے اور پھر کتنا ضدی ہے اسے باہر بھیج کر آپ خود کو بھی مشکل میں ڈالیں گے۔“ رخشندہ ناز سنبھل سنبھل کر اور سوچ کر لفظوں کا چناؤ کر رہی تھیں، شاہ زین نے نفرت بھری نظروں سے رخشندہ ناز کی پشت کو دیکھا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے، بچپن سے لے کر اب تک شاہ زین نے انہیں تنگ ہی کیا تھا، شاہ زین نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں، دل میں پاپا کے لئے محبت کا جو گوشہ ہرا ہوا تھا فوراً اجڑ گیا تھا، وہاں پھر وہی نفرت کی آگ جلنے لگی تھی۔

”یہاں رہ کر پہلے کوئی جاب کرنے گا تو Experiance بڑے گا، اپنے بزنس کا حصہ بننے سے پہلے کچھ Experiance تو ہونا چاہیے۔“ رخشندہ ناز کی بات پر پاپا چپ کر گئے، وہ کچھ سوچنے لگے تھے، سوچتے ہوئے انہوں نے رخشندہ ناز کی طرف دیکھا، شاہ زین کو پاپا کی خاموشی بہت گہری لگ رہی تھی، اس کا جی چاہا کہ پاپا فوراً سے رخشندہ ناز سے کہہ دیں کہ میرا بیٹا ضرور پڑھنے جائے گا، لیکن وہ صرف سوچ ہی سکا تھا۔

”حسن میں ایک اور بات سوچ رہی تھی کہ اگر حیدر کو فارن بھیج دیا جائے، میرا مطلب ہے کہ دونوں کی نیچر میں بہت فرق ہے حیدر زمانے کی اونچ نیچ کو شاہ زین سے بہتر سمجھتا ہے اور پھر جب تک حیدر کی سٹڈیز کمپلیٹ ہو گی شاہ زین بھی Experiance ہو چکا ہوگا، پھر جب دونوں مل کر بزنس کریں گے تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

”ہاں لیکن دونوں کی آپس میں اچھی دوستی ہے۔“

”وہ حیدر کے بے وقوفی ہے۔“ رخشندہ ناز زیر لب بڑبڑائیں، بڑبڑاہٹ اتنی کم تھی کہ حسن تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔“ حسن نے کہتے ہوئے میز پر رکھا اخبار اٹھانے لگے ایسے جیسے بات ہی ختم کر دی ہو، شاہ زین کے لئے برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا، اس عورت کی وجہ سے اس کا باپ اس کی خواہشات کو پس پشت ڈال رہا تھا، اس نے زور سے قریب ہی پڑے کرسٹل لیمپ کو مکا دے مارا، کانچ چکنا چور ہو کر فرش پر بکھر گیا، اچانک ٹوٹنے کی آواز پر رخشندہ ناز اور پاپا نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو، ہاں بولو۔“ شاہ زین غصے کی وجہ سے بپھر رہا تھا۔

”تم اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، یہ میرا گھر ہے سنا تم نے لالچی عورت۔“

''شاہ زین!'' پاپا تنبیہی انداز میں لیکن سخت غصے سے بولے، شاہ زین کی بدتمیزیاں ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔

''پاپا آپ نہیں جانتے یہ بہت لالچی چالاک اور مکار......'' شاہ زین کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پاپا نے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا تھا، شاہ زین نے شاکڈ ہو کر پاپا کی طرف دیکھا، وہ اس وقت غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاپا نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

''آپ نے اس عورت کی وجہ سے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔'' وہ صدمے سے دوچار بولا۔

''بیوی ہے میری۔'' پاپا نے بیوی پر زور دیا۔

''میں آپ کا کچھ نہیں لگتا۔'' شاہ زین کی آنکھوں اور لہجے میں ضرور کچھ ایسا موجود تھا کہ پاپا نظریں چرا گئے۔

''میں تمہیں کبھی کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔'' وہ رخشندہ ناز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، شاہ زین کی آنکھوں میں لپکتے انتقام کے شعلوں نے ایک لمحے کے لئے رخشندہ ناز کو بھی ڈرا دیا تھا اور یہ صرف ایک لمحے کے دسویں حصے میں ظاہر ہو کر غائب ہو گیا، شاہ زین نے کرسی کو ٹھوکر سے پیچھے کیا تو وہ کچھ دور جا گری، شاہ زین سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''آئی ایم سوری۔'' حسن نے رخشندہ ناز سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئے، رخشندہ سرشاری سے مسکرا دیں۔

''شاہ زین حسن آدھی جنگ تو میں جیت چکی ہوں اب بہت جلد Ending بھی ہونے والی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے خالی سیڑھیوں کی طرف دیکھا، جہاں سے ابھی شاہ زین اوپر گیا تھا اور سرشاری کے عالم میں سوچا، شاہ زین ہمیشہ سے ان کے لئے ایک مشکل رہا تھا، پہلے دن سے ہی اس نے رخشندہ ناز کو اس گھر میں قبول نہیں کیا تھا اور پھر اپنے بیٹے حیدر علی کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے بیٹے کی خواہش دل میں نہیں جاگی تھی، لہٰذا انہوں نے شاہ زین اپنا بیٹا نہیں مانا تھا تو قائل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

کمرے کی حالت دو منٹ میں ہی ابتر ہو گئی تھی، وہ زور زور سے چیخ رہا تھا، ایسے جیسے اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو، ہمیشہ سے جب بھی اس کی پاپا یا پھر رخشندہ ناز سے لڑائی ہو جاتی اس کا سارا غصہ اپنے کمرے میں موجود چیزوں پر ہی نکلتا تھا اور پھر وہ گھر سے ہی باہر نکل جاتا واپس آنے تک ملازم کمرے کو واپس پرانی حالت میں لا چکے ہوتے تھے، لیکن آج تو دیوانگی انتہا پر تھی۔

''زین کدھر ہے؟'' حیدر شاپنگ بیگز ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا تو سامنے کانچ سمیٹتے ہوئے ملازم سے پوچھا۔

''صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔''

''خیریت تو ہے نا؟'' ملازم کو کانچ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر حیدر نے پوچھا تو ملازم نے نفی میں سر ہلا دیا، حیدر جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا، ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ شاہ زین کو اچھے موڈ میں چھوڑ کر گیا تھا۔

''ماما کدھر ہیں؟'' حیدر زینے پھلانگتا ہوا رک کر بولا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔''

''اور انکل حسن۔''

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' ملازم نے نیچے سے جواب دیا، حیدر جلدی سے دو دو زینے پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔

''شاہ زین!'' حیدر دروازے پر دستک دیتے ہوئے بولا اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی حیدر نے ذرا زور سے دروازے پر دستک دی۔

''زین دروازہ کھولو۔'' حیدر نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

''شاہ زین؟''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' شاہ زین کی تھکی مگر غصے سے بھرپور آواز ابھری تھی اور کچھ دیوار کے ساتھ لگ کر ٹوٹا تھا، حیدر غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''صاحب کے کمرے کی چابیاں لاؤ جلدی سے۔'' حیدر نے اوپر سے نیچے ملازم کو آواز دی ملازم جلدی سے چابیاں لے کر تو لاک کھولا، شاہ زین کی اپنی حالت کمرے سے کہیں زیادہ ابتر تھی، وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا، دونوں بازو بیڈ سے نیچے لٹک رہے تھے۔

''ماما کہاں چلی گئیں ہیں آپ؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا، دروازے کے پاس بیئر کی بوتل ٹوٹی پڑی تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بوتل شاہ زین نے دروازے کو ماری تھی۔

''شاہ زین!'' حیدر ٹوٹے ہوئے کانچ سے بچتا ہوا اندر آیا اور شاہ زین کو سیدھا کرنے کی کوشش کی شاہ زین نے دھکا دے کر اسے خود سے پیچھے کرنا چاہا۔

''تم نے پی رکھی ہے۔'' حیدر غیر یقینی انداز میں بولا شاہ زین نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

''شاہ زین کی ماما سے کس بات پر لڑائی ہوئی؟''

''تت......تت......تم......سب......م...... میرے کچھ نہیں لگتے دو...... دو...... دشمن ہیں سب میرے۔'' شاہ زین لیٹے لیٹے چیخا۔

''شاہ زین میری بات سنو۔'' حیدر نے ذرا پیار سے شاہ زین کو سیدھا کرنا چاہا تو شاہ زین پیچھے ہٹ گیا اور بیڈ سے اٹھا تو اس کے قدم لڑکھڑا گئے لیکن وہ گرنے سے بچ گیا۔

''زین رک جاؤ۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو حیدر پیچھے سے پکارا اور شاہ زین کے پیچھے آیا، شاہ زین جلدی سے سیڑھیاں اترنے لگا، لیکن بند ہوتی آنکھوں اور چکراتے سر کی وجہ سے کب اس کا پاؤں غلط زینے پر آیا اور کب وہ زینے سے پھسلا اسے پتہ ہی نہیں چلا، اس نے خود کو گہرائی میں گرتا محسوس کیا۔

''شاہ زین!'' اسے کہیں بہت دور سے حیدر کی آواز بھی آ رہی تھی، وہ اسی کو پکار رہا تھا اس کا دماغ آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا، حیدر کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی، دماغ کے مکمل اندھیرے میں ڈوبنے سے پہلے جو احساس ہوا تھا وہ منہ کا کسی چیز سے گیلا ہونے کا تھا۔

''شاہ زین!'' حیدر جلدی سے سیڑھیاں اترتا ہوا آخری زینے کے پاس بے ہوش شاہ زین کے پاس آیا، سر سے خون بہہ کر چہرے پر پھیل چکا تھا۔

حیدر جلدی سے شاہ زین کو اٹھاتے ہوئے بولا اور باہر کی جانب بڑھا، ملازم نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو حیدر نے شاہ زین کو پچھلی سیٹ پر لٹایا۔

''تم بھی ساتھ بیٹھو۔'' حیدر کے کہنے پر ملازم پچھلی سیٹ پر شاہ زین کے پاس بیٹھ گیا، جس کی ٹانگیں سیٹ سے نیچے لٹک رہی تھیں، ملازم نے شاہ زین کا سر اپنی گود میں رکھ لیا جس سے خون بہہ رہا تھا، حیدر کی شرٹ پر بھی خون کے دھبے لگ چکے تھے۔

"یہ اس کے سر پر باندھ دو بہت بلیڈنگ ہو رہی ہے۔" چوکیدار نے گیٹ کھول دیا، وہ جتنی تیز گاڑی چلا سکتا تھا چلا رہا تھا۔

"بہت بلیڈنگ ہو گئی ہے فوراً سے پہلے بی پازیٹو گروپ کا ارینج کریں۔" ڈاکٹر کہہ کر ایمرجنسی روم کی طرف واپس مڑا۔

"میرا تو اے پازیٹو ہے میں کچھ کرتا ہوں۔" حیدر نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ جاننے والوں کو کالز کیں لیکن کہیں سے بھی خون کا انتظام نہیں ہو سکا تھا، پھر اچانک اسے شہربانو کا خیال آیا جس کا بلڈ گروپ بھی بی پازیٹو ہی تھا، اس نے ملازم کو وہیں رکے رہنے کی اور اس کی واپسی تک کسی بھی مسئلے کی اطلاع کرنے کے لئے اسے فون کرنے کی تاکید کی اور جلدی سے باہر نکل آیا اور گاڑی سٹارٹ کی، شہربانو اسے یوں اس حالت میں اپنے دروازے پر دیکھ کر بوکھلا گئی تھی، اس کی سفید شرٹ پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے لگے ہوئے تھے اماں کو بتا کر اس نے جلدی سے چادر اوڑھی اور حیدر کے ساتھ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی، حیدر نے گاڑی سٹارٹ کی، محلے والوں نے اسے کس نظر سے دیکھا اس نے غور نہیں کیا، اسے اگر فکر تھی تو صرف اس مریض کی جسے اس وقت خون کی سخت ضرورت تھی، جس کے لئے وہ زندگی کا باعث بن سکتی تھی اور مریض بھی وہ جو حیدر کا صرف بھائی ہی نہیں بہت اچھا دوست بھی تھا، حیدر نے پہلی بار اس سے کچھ مانگا تھا اگر وہ حیدر کا بھائی نہ بھی ہوتا تو بھی وہ کچھ کہے بغیر خون دینے چل دیتی، اس کے لئے حیدر کا کہنا ہی کافی تھا، وہ اس کی بہت عزت کرتی تھی، وہ ہمیشہ اس کی پڑھائی میں مدد کرتا تھا کلاس میں حیدر ہی وہ واحد لڑکا تھا جس پر شہربانو اعتماد کرتی تھی۔

☆☆☆

وہ ساتھ والے سنگل بیڈ پر لیٹی خون ڈونیٹ کر رہی تھی، خون کا قطرہ قطرہ شاہ زین کی رگوں میں زندگی بن کر شامل ہو رہا تھا، سر پر گہری چوٹ تھی، ابھی کچھ دیر پہلے ہی نرس اسے انجکشن لگا کر گئی تھی جبکہ حیدر ڈاکٹر سے نسخہ لے کر میڈیکل سٹور سے دوائیاں لینے گیا ہوا تھا، شہربانو نے گردن موڑ کر ساتھ والے بیڈ پر لیٹے شاہ زین کو دیکھا جو ہوش سے بالکل بے خبر تھا، اس بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر عجیب سا اضطراب تھا، حیدر اکثر اپنی باتوں میں شاہ زین کا ذکر کرتا تھا لیکن ملنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا، حیدر کی باتیں سن کر جیسا خاکہ اس کے ذہن میں بنا تھا شاہ زین ویسا ہی تھا، اس نے نظریں چھت پر لگے سفید پنکھے پر جما دیں، اب وہ خطرے سے تو باہر تھا لیکن ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ جتنی جلدی ہوش آ جائے گا بہتر ہے۔

"خدا جانے اسے کب ہوش آئے گا ابھی تو گھر جا کر کھانا بھی بنانا ہے، اماں کی طبیعت خراب ہے ابا بھی جلدی گھر آ جائیں گے، اماں نے بتا تو دیا ہوگا کہ میں کہاں ہوں پریشان ہیں ہوں گے لیکن اماں کھانا تو نہیں بنا سکتی نا۔" وہ پنکھے کے پر گنتے ہوئے مسلسل یہی سوچ رہی تھی جب ساتھ والے بیڈ پر ہلکی سی جنبش ہوئی، شہربانو نے گردن موڑ کر ساتھ والے بیڈ کی طرف دیکھا۔

"شہربانو!" شاہ زین کے منہ سے اپنے نام کی بڑبڑاہٹ سن کر حیران رہ گئی اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا تھا، شہربانو کو لگا کہ شاید اسے سننے میں غلطی لگی ہو لیکن نہیں اس نے شہربانو کا نام ہی لیا تھا دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا، اس کے بعد شاہ زین کافی دیر تک کچھ نہیں بولا تھا، اس نے شاہ زین کی طرف دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر کی سوچ کر اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"حیدر!" وہ بے ہوشی میں ایک بار پھر بولا، جبھی حیدر دوائیوں کا شاپر لئے اندر داخل ہوا۔

"حیدر!" آواز بامشکل اس کے گلے سے باہر آ رہی تھی۔

"مما...... حیدر...... سب کدھر...... میں شہربانو۔" وہ بے ترتیب انداز میں نام لے رہا تھا۔

"شاہ زین میں یہاں ہوں تمہارے پاس۔" حیدر نے دوائیوں کے شاپر ایک طرف رکھے اور بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"شاہ زین!" حیدر نے اس کا گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن شاہ زین ایک بار پھر خاموش ہو چکا تھا، حیدر نے سیدھے ہوتے ہوئے شہربانو کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھی، حیدر خاموشی سے ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، اس وقت کمرے میں مکمل خاموشی تھی جبھی حیدر کا موبائل بج اٹھا ماما کی کال آ رہی تھی، حیدر نے روشن سکرین پر چمکتے نام کو دیکھا اور کال کاٹ دی اور پھر فون ہی آف کر دیا، ماما نے اس سے کیا پوچھنا تھا اور پھر اسے کیا کہنا تھا وہ سب جانتا تھا۔

"کیا حیدر نے میرا ذکر شاہ زین کے ساتھ کیا؟" وہ آنکھیں بند کیے مسلسل سوچے جا رہی تھی، ڈاکٹر دو دفعہ کمرے کا چکر لگا چکا تھا، کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتا کبھی مخصوص ناموں کی بڑبڑاہٹ ہونے لگتی، فقرے اتنے بے ترتیب ہوتے کہ کچھ تو سمجھ آ جاتی اور اکثر کوئی بھی معنی سمجھانے میں ناکام رہتے، وہ جب بھی شہربانو کا نام لیتا دل میں ایک عجیب سا احساس انگڑائی لینے لگتا، خون دینے کے بعد ڈاکٹر نے اسے کچھ دیر یونہی لیٹے رہنے کی تاکید کی جب وہ فارغ ہوئی شام کے سات بج رہے تھے۔

"میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔" حیدر اٹھتے ہوئے بولا تو وہ خاموشی سے پیچھے چل دی، اس کے دل میں بار بار ایک ہی سوال مچل رہا تھا لیکن وہ حیدر سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی، حیدر نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تو وہ چادر ٹھیک کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھنے کے بعد حیدر نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی سٹارٹ کی، وہ شہربانو کی اس خاموشی میں چھپے سوال کو سمجھ گیا تھا، کافی دیر تک وہ لفظوں کا چناؤ کرتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا کہ کیسے شہربانو کو شاہ زین کی پسندیدگی کا بتائے، شہربانو شیشے کے باہر روڈ پر تیزی سے ٹریفک اور عمارتوں کو دیکھنے لگی تھی راستے میں حیدر نے کچھ موسمی پھل خرید لئے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی بلڈ ڈونیٹ کرنے سے پتہ ہے انسان کو کتنی کمزوری ہو جاتی ہے۔" حیدر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"شہربانو تھینک یو سو مچ۔" حیدر نے شہربانو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا جو اس کے مشکل وقت میں اس کے کام آئی تھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔"

"میں واقعی ہی تمہارا احسان مند ہوں۔"

"اب تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔" گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی کتنے ہی لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے، حیدر نے ہی اپنی آواز سے خاموشی میں خلل ڈالا، شہربانو نے گردن موڑ کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"وہ ایکچوئیلی مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" حیدر نے گیئر بدلا، شہربانو حیدر کے

بولنے کا انتظار کرنے لگی، حیدر نے ایک پل کے لئے سوچا اور پھر شاہ زین کے شہربانو کے لئے کیسے جذبات ہیں سب کچھ بتا دیا، وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

''شہربانو، زین بہت اچھا انسان ہے تھوڑا جذباتی ضرور ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے اسے محبت کی زبان بہت جلد سمجھ آتی ہے مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔'' حیدر کی بات پر وہ کچھ نہیں بولی تھی اسے لگا جیسے جسم کا ہر اعضاء دل بن گیا ہو۔

''اندر آؤ۔'' حیدر نے دروازے کے سامنے گاڑی روکی تو اس نے حیدر کو اندر آنے کی دعوت دی۔

''پھر کبھی ابھی شاہ زین اکیلا ہے۔''

''سنو!'' وہ جانے کے لئے مڑی تو حیدر کی پکار پر ایک بار پھر واپس مڑی۔

''مجھے تمہی اپنی بھابھی کے روپ میں دیکھ کر خوشی ہو گی شاہ زین کے بارے میں سوچنا ضرور۔'' حیدر کی بات پر وہ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کر سکی تھی، وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی، اماں صحن میں تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں، جبکہ ابا مغرب کی نماز کے بعد ابھی ابھی ہی مسجد سے واپس لوٹے تھے اور کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے سلام کرنے کے بعد وہ اماں کے پاس تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔

''لائیں میں بنا دیتی ہوں۔''

''رہنے دو میں کر لوں گی تم آرام کرو۔'' اماں ٹوکری اٹھائے کچن میں چلی گئیں اور وہ تکیے سے ٹیک لگا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گئی اور آنکھیں موند لیں، جبھی دروازے پر دستک ہوئی، ابا جو اخبار پڑھ رہے تھے دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ گئے، اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''السلام علیکم انکل!'' سامنے حیدر کھڑا تھا۔

''وعلیکم السلام انکل! یہ کچھ شاپر گاڑی میں ہی رہ گئے تھے۔'' حیدر نے شاپر ابا کی طرف بڑھائے۔

''آؤ اندر آؤ بیٹا۔''

''تھینک یو انکل لیکن اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں میرا بھائی ہاسپٹل میں اکیلا ہے۔'' حیدر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟''

''ابھی تک ہوش نہیں آیا بس آپ دعا کریں۔''

''اللہ بہتر کرے گا انشا اللہ۔'' حیدر کے جانے کے بعد ابا نے دروازہ بند کر لیا۔

اس رات شعوری اور لاشعوری طور پر وہ شاہ زین کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔

''شاہ زین بہت اچھا انسان ہے تھوڑا جذباتی ضرور ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔'' اس کی سوچوں کا منہ زور گھوڑا شاہ زین کی طرف ہی بھاگ رہا تھا۔

''اسے پتہ نہیں ہوش آیا بھی ہو گا کہ نہیں۔'' اس نے حیدر کا نمبر اوپن کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے بارہ بجا رہی تھی، اس نے فون بند کر دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی اگرچہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

رات ایک بجے بعد اسے ہوش آیا تھا، روشنی کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکا تھا، کچھ لمحوں کے بعد اس نے پھر آنکھیں کھولیں جب اسے ہوش آیا اسے اپنا گلا خشک محسوس ہوا، ہونٹوں پر خشکی کی ایک تہہ جم چکی تھی، اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھا ہی نہیں گیا، بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی، اس نے بولنے کی

کوشش کی لیکن آواز گلے میں ہی کہیں دب گئی تھی، اس نے گردن گھما کر دائیں طرف دیکھا، حیدر بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''حیدر!'' شاہ زین ایک بار پھر بڑبڑایا، پیاس کی وجہ سے حلق میں ایسے جیسے کانٹے اگ آئے ہوں، اس نے یونہی لیٹے لیٹے بیڈ کے دائیں طرف رکھی پانی کی بوتل اٹھانے کی کوشش کی لیکن پانی کی بوتل اٹھانے کے چکر میں اس کا ہاتھ دوائیوں والی ٹرے پر جا لگا اور وہ نیچے جا گری، شور سے حیدر کی آنکھ کھل گئی۔

''پانی۔'' شاہ زین محض لبوں کو ہی ہلا سکا تھا۔

''پانی چاہیے۔'' حیدر نے جلدی سے منرل واٹر کی بوتل سے پانی گلاس میں ڈالا اور شاہ زین کو پیچھے سے سہارا دیتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا، پانی حلق سے نیچے اترتے ہی اسے جیسے زندگی کی نوید مل گئی ہو۔

''تھینک گاڈ تمہیں ہوش آ گیا۔'' حیدر نے اس کا سر واپس تکیے پر رکھا، اگرچہ تکیہ نرم و ملائم تھا لیکن پھر بھی چوٹ کی وجہ سے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی وہ سسک اٹھا۔

''کیا ہوا سر میں درد ہے؟'' حیدر نے پریشانی سے پوچھا، شاہ زین نے آنکھیں بند کر لیں، پچھلے گزرے ہوئے سارے منظر ساری باتیں اسے یاد آنے لگیں، بے ہوش ہونے سے پہلے اسے جو بات یاد تھی وہ حیدر کو کمرے میں چھوڑ کر دروازے تک آنا تھا۔

''شاہ زین تم ٹھیک تو ہو نا؟'' حیدر کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی، شاہ زین نے ہاں میں سر ہلایا اور مسکرانے کی کسی حد تک کامیاب کوشش کی، اگلی صبح اسے ہاسپٹل سے چھٹی تو مل گئی تھی لیکن ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کی تاکید کی تھی، حیدر اسے لے کر واپس گھر آ گیا، حیدر نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے سہارا دیتے ہوئے گاڑی سے باہر نکالا گرنے کی وجہ سے بازو اور بائیں ٹانگ پر بھی خراشیں آئیں تھیں جبکہ پاؤں بھی سوج گیا تھا اور درد بھی کر رہا تھا سر کا زخم بھی کافی گہرا تھا، حیدر اسے سہارا دیتے ہوئے اندر تک لایا، گھر میں صبح کا ناشتہ چل رہا تھا، پاپا اور رخشندہ ناز ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔

''حیدر تم رات بھر کہاں تھے۔'' حیدر کو دیکھتے ہی رخشندہ ناز بولیں لیکن شاہ زین پر نظر پڑتے ہی خاموش ہو گئیں۔

''شاہ زین بیٹا کیا ہوا، تم زخمی کیسے ہوئے؟'' شاہ زین کو اس حالت میں دیکھ کر پاپا کرسی سے کھڑے ہو گئے اور پریشانی سے بولے، شاہ زین خاموش ہی رہا۔

''کل رات سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔'' جب شاہ زین کچھ نہیں بولا تو حیدر نے وجہ بتائی۔

''تمہیں دیکھ کر اترنا چاہیے تھا اتنی سخت چوٹیں آئیں ہیں اگر کچھ ہو جاتا تو؟''

''ابھی مرا نہیں ہوں۔'' شاہ زین تلخی سے بولا۔

''مجھے ابھی آرام کرنا ہے۔'' شاہ زین نے حیدر سے مخاطب ہوا پاپا نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے شاہ زین کے ردعمل پر خاموش ہی رہ گئے۔

(باقی اگلے ماہ)

عابی ناز

"آداب قارئین کرام! عابدو پروین ایک بار پھر آپ کو زحمت دینے کے لئے پہنچ چکی ہے۔"

"ہیں؟ کیا کہا؟ کون عابدہ پروین؟"

"ارے بھئی اتنی جلدی بھول بھی گئے ہمارے "فائیو سٹار" گروپ کو؟ یعنی کہ حد ہے بے وفائی کی، مجھے لگتا ہے آپ ہماری اتنی لمبی غیر حاضری کی وجہ سے ناراض ہو گئے ہیں جبھی منہ پھیر لیا ہماری تحریر دیکھ کر، ارے بھئی ناراض نہ ہوں ہم آ گئے ہیں اب، لیکن اس بار آپ بیتی لکھنے سے پہلے میں اپنی ہم عمر سٹوڈنٹس سے "خاصم خاص" گزارش کروں گی کہ خدارا اگر پڑھائی کا میدان ہی مارنا ہے آپ نے میری طرح تو پھر دوران سٹڈی منگنی مت کروائے گا اور اگر منگنی کروانی ہی ہے تو پلیز پہلے رسوئی گھر (کچن) کا کام لازمی سیکھنا ہے، پلیز پلیز پلیز، ہم ہاتھ پاؤں جوڑ کر گڑگڑا کر آپ سے ریکوئسٹ اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم پر جو گزری ماشاء اللہ

ناولٹ

کسی "دشمن ویری" کے ساتھ بھی نہ گزرے، حیران ہو رہے ہیں ناں؟ کہ آخر ایسی بھی کیا گزر گئی ہم پر جو ہم جیسی "ہٹلر اور کنگ فو ماسٹر" آپ حضرات کی منت سماجت پر اتر آئی۔"

تو سنیئے قارئین اور ساتھ ساتھ ہمارے غم میں چاہیں تو آنسو بہایئے اور چاہیں تو ہماری کارکردگی پر ہمیں داد دیجئے اور مسکرایئے۔

"جب سے ہمارے کلاس فیلو دانیال فاران نے ہمارے منگیتر کا شاندار عہدہ سنبھالا تھا ہم تو گویا ہواؤں میں اڑ رہے تھے، ہمارے گروپ کی دو ممبران انیتا اور عائشہ تو شادی کروا کر بالکل ہی ناکارہ ہو گئی جبکہ باقی دو شروع سے ہی ناکارہ تھیں (یہ اندر کی بات بتا رہی ہوں) زیبی اور سمیری کے منگیتر (جنہیں اللہ جلد از جلد

ان کا شوہر بنائے) وہ تھے تو سہی مگر ہمارے منگیتر میں خاص بات یہ تھی کہ وہ ہمارا کلاس فیلو تھا اور کلاس کی ٹائمنگ میں پورے چھ گھنٹے ہمیں دیدہ دلیری سے تاک سکتا تھا، جس کی کراری کراری اور دلنشین نظروں کی تپش سے ہم جیسی ''پتھر دل ہٹلر'' بھی موم اور پانی کی طرح پگھل پگھل اور بہہ بہہ جاتی ہمارے منگیتر کی اسی اضافی خصوصیت اور رعایت پہ ہماری چار عدد باقی ''جل ککڑیاں'' جل جل جاتی تھیں آخر ان کے منگیتروں اور شوہروں کو یہ ایکسٹرا فیسلٹی جو دستیاب نہیں تھی اور وہ جو خود ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس رہی ہوتی تھیں ہمارے پگھلنے اور چور نظر سے ''انہیں'' دیکھنے پر ہماری ''وکھی'' میں کہنی مار مار کر ہماری وکھی ہی اندر گھسیٹر دیتیں (ان نامرادوں کو تو اللہ ہی پوچھے مجھ غریب کو تو لگتا تھا کسی دن ان کی کہنی میرے پیٹ میں سوراخ ہی کر دے گی)۔''

خیر دو ماہ اسی طرح گزرے، لیکن آہا......

پھر۔

تو جناب اب آگے سنیئے ہوا کچھ یوں کہ ''ظالم سماج'' کی کہنیوں اور کینہ توز نگاہوں کی پرواہ کیئے بغیر ہم دانیال فاران جی کی نگاہوں میں کھوئے ہوئے بہت خوش تھے مگر ہماری خوشی کو اسی ظالم سماج کی نظر لگ گئی، ہمیں یاد ہے اس دن سنڈے تھا اور ہم پانچوں اپنے اپنے بستر پر (ہاسٹل کے اسی بوسیدہ اور کھنڈر نما کمرے میں) ٹانگیں پھیلائے، پاؤں پسارے بدمست پڑے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، جب ہمارے کمرے کے (عنقریب ٹوٹنے والے) دروازے پر دستک ہوئی، ہماری آنکھ تو کھل چکی تھی مگر ازلی سُستی کے زیر اثر ہم اپنی جگہ سے ہل کر نہ دیئے، زیبی اور سمیری تو گدھے گھوڑے اونٹ، خچر، بیل سب بیچ کر سوتی ہیں یہ تو ہمیں معلوم تھا لیکن ہم تینوں کے سوا بھی تو دو عدد اللہ میاں کی گائے اسی کمرے میں رہتی ہیں وہی اٹھ کر دروازہ کھولیں یہی سوچ کر ہم تکیے میں منہ دیئے پڑے رہیے، جب دستک کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہا تو ہم نے ادھ کھلی آنکھوں سے یہاں وہاں دیکھتی عاشی کو ایک کک رسید کی۔

''کن اکھیوں سے یہاں وہاں کیا دیکھ رہی ہو ہڈ حرام اٹھ کے دروازہ کھولو۔'' الفاظ ابھی ہمارے منہ میں ہی تھے کہ عاشی کا زبردست سا جھانپڑ ہماری کمر سا لگا گیا۔

''تمہارے ہاتھوں میں چھالے پڑے ہیں کیا؟ یا پیروں میں موچ آئی ہے جو اٹھ کر تم نہیں جا سکتی؟'' وہ بھی میری ہی گروپ فرینڈ تھی آخر لحاظ کہاں کرتی، جب تک میں کمر سہلاتی سیدھی ہوئی وہ میرے بدلے اور اپنے انجام بد کے ڈر سے فوراً چادر کھسکا کر دروازہ کھولنے لپکی۔

دروازے پر ساتھ والے روم کی قرۃ العین کو کھڑے دیکھ کر عاشی نے میرے نہ اٹھنے اور اپنے سنڈے کو بھی جلدی بیدار ہو جانے کا سارا غصہ اس پر انڈیل دیا۔

''کیا ہے کیوں بے چارے بے زبان جانور کی طرح ہمارا دروازہ پیٹ رہی ہو ابھی اس کا کوئی قبضہ وبضہ کھل کر نیچے گر گیا تو؟'' عاشی کمر پر ہاتھ رکھے اس کے لتے لے رہی تھی جبکہ اس کے برعکس عینی (قرۃ العین) خراماں خراماں چھل قدمی کرتی بہت خوشگوار موڈ میں اندر گھس آئی۔

''ہیلو گرلز ابھی تک ریسٹ ہو رہا ہے یعنی سنڈے کی چھٹی منائی جا رہی ہے گڈ۔'' ہماری پوزیشنز اور سونے کے انداز ہی ہماری چھٹی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے پھر ہم کیا بولتے۔

''آپ کی شب شب آمد اتنی سویرے خیر سے ہوئی۔'' میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر کہا۔ (تمیز تو نام کو نہیں)۔

''ارے یار میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لے کر آئی ہوں۔'' عینی نے پٹاخہ چھوڑا اور یہ اسی پٹاخے کا اثر تھا کہ ہماری چھوٹی چھوٹی اور مندی مندی سی آنکھیں پٹ سے کھل چکی تھیں وہ بھی فل سائز میں، ادھر عاشی ایک ہی جست میں زمین پر بستر بچھائے سوئی ہوئی ہستیوں کو پھاندتی ہوئی عینی کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

''کیا اس بار میری سمسٹر میں فرسٹ پوزیشن ہے۔'' ہم دونوں کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی خیال کوندا، اس خیال سے جہاں میرا چہرہ جگمگایا تھا (اف) وہیں عاشی کی صورت لٹک گئی تھی۔

''جلدی سے بولو نا عینی کیسی گڈ نیوز ہے یار۔'' مجھ سے زیادہ بے چینی عاشی کی بچی کو لگ گئی تھی۔

''آآآآ گڈ نیوز یہ ہے کہ......'' عینی نے ہمارے تجسس کو مزید ہوا دی ہم دونوں دم سادھے منہ کھولے اس کے الفاظ کا انتظار کر رہی تھیں جبکہ باقی تینوں کے خراٹوں کی آواز سے کمرہ گونج رہا تھا۔

''دانیال ہمارے ہاسٹل کے ویٹنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہا ہے وہ تم سے ملنے آیا ہے۔'' عینی نے بڑی ادا سے خوشخبری سنائی تھی اس کی بات سن کر جہاں عاشی کھلکھلائی وہیں میں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی پہلی پوزیشن کے زبردست سے تصور کے ساتھ جو جوش اور ولولے جاگے تھے سب یکدم فریزر کی جمی برف کی مانند ٹھنڈے ہو گئے۔

''تو اس میں خوشی والی کیا بات ہے دانیال کو کوئی نوٹس چاہیے ہوں گے۔'' سٹڈی کا معاملہ الگ مگر دانیال کے آنے کی خبر نے مجھے اتنا بھی مایوس نہیں کیا تھا جناب جتنا آپ سمجھ رہے ہیں، (جی ہاں ہم نے اپنے احساسات چھپا کے رکھے تھے تب بھی اور اب بھی) (ہم بڑے تیز ہیں)۔

''ارے نہیں یار وہ تم سے کچھ پرسنل بات کرنے آیا ہے آخر فیانسی بھی تو ہے وہ تمہارا۔'' عینی نے آنکھیں مٹکائیں تو ہم پر منوں ٹنوں کے حساب سے شرم آ پڑی مگر اگلے کچھ ہی پل میں ہم پھر سے اپنی ٹون میں لوٹ آئے۔

''تھینک یو فار دس کائنڈ انفارمیشن اگر آپ یاد نہ دلاتیں تو ہمیں تو بالکل یاد نہ آتا۔'' ہم نے بھی مصنوعی آنکھیں پٹپٹا کر عینی کا شکریہ ادا کیا۔

''کیا یاد نہ آتا؟'' وہ مجھ سے بھی بڑی گھامڑ تھی جبھی منہ اونچا کر کے پوچھنے لگی۔

''یہی کہ دانیال، عابدہ کا فیانسی ہے۔'' جواب میری جگہ عاشی نے دیا وہ بھی ماتھا پیٹ کر۔

''اچھا تو صبح صبح میں نے آپ کو خوشخبری بھی دے دی اور ''کائنڈ انفارمیشن'' بھی ٹھیک ہے پھر اب دانیال ویٹ ہی نہ کرتا رہ جائے تم مل لو اس سے میں چلتی ہوں۔'' عینی جتنی ڈنگر ہے اتنی ہی سیدھی بھی اس لئے ہمارے طنز پہ خوش ہوتی وہ چلی گئی، اس کے جاتے ہی عاشی نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور پیچھے پلٹی مگر یہ کیا پیچھے مڑتے ہی اس نے ایک لمبی سی چیخ مار دی۔

چیخ کیوں مار دی؟ آپ یہی سوچ رہے ہیں ناں؟ میں بتاتی ہوں جناب چیخ اس نے اس لئے ماری کہ وہ دو سیکنڈ پہلے مجھے بستر پر چت پڑا چھوڑ کر دروازہ بند کرنے مڑی تھی مگر اب دو سیکنڈ بعد جب وہ پلٹی تو میں بوتل کے جن کی طرح اس کے بالکل سامنے بلکہ تقریباً اس کے اوپر چڑھی

کھڑی تھی وہ پلٹی تو مجھ سے ٹکراتے ہی بدحواس ہو کر چیخی تھی (اب سمجھ میں آیا؟)۔

''در فٹے منہ، ہن کدھر۔'' اس نے خالص پنجابی میں پوچھا پر پہلے ملامت کرنا ہرگز نہیں بھولی۔

''دانیال سے ملنے اور کہاں؟ تم نے سنا نہیں وہ مجھ سے ملنے آیا ہے نیچے ویٹنگ روم میں میرا ویٹ کر رہا ہے۔'' میں نے ادا سے بال جھٹک کر اتراتے ہوئے اور اسے جتاتے ہوئے لہجے میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا، تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی، پانچ منٹ وہ پاگلوں کی طرح دانت ہی دکھاتی رہی جبکہ میں ہونقوں کی طرح کچھ نا سمجھی میں اسے گھور رہی تھی۔

''کیا ہے؟ کچھ بکو بھی۔'' اس کی خوفناک ہنسی مجھے سہا رہی تھی، اس نے اپنی طویل ترین ہنسی کے دوران ہی زیبی، انیتا اور سمیری کو ہلا ہلا کر بلکہ ''ہولا ہولا'' کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ یہ صبح صبح کونسا دورہ پڑ گیا اسے؟ کوئی دم درود پڑھو یا کوئی جوتا سونگھاؤ اس کو۔'' زیبی نے حراساں و پریشان ہو کر کہا تو سمیری اس کی بات کا پہلا تمام تر حصہ فراموش کر کے آخری چند الفاظ پر عمل کرنے فٹ دوڑی، اپنے دونوں جوتے ہاتھوں میں اٹھائے جب وہ عاشی تک پہنچی تو اس کی ہنسی کو بریک لگا۔

''مر جانیو جوتا مینوں نئیں اینوں سنگھاؤ شاید اینوں کجھ ہوش آجائے۔'' عاشی نے سخت برا مانتے ہوئے آخر میں میری طرف اشارہ کیا، وہ تینوں نمونے جو عاشی پر اٹھتے ہی پل پڑے تھے اب اسے چھوڑ کر مجھے تکنے لگے۔

''تو یہ میڈم صاحبہ دانیال سے ملنے جا رہی ہیں وہ بھی اس حلیے میں؟'' اس نے شروع سے لے کر ''سارا واقعہ'' ان کے گوش گزار کرنے کے بعد کہا تو وہ تینوں بھی لگیں دانتوں کی نمائش کرنے جبکہ میں دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر Pure لڑاکا عورتوں کی طرح بولی۔

''کیا ہو گیا میرے حلیے کو ہاں؟''

''او باجی خدا کے واسطے اگر تم چاہتی ہو کہ دانیال تمہیں ڈولی میں بٹھانے تک زندہ رہے تو برائے مہربانی اپنا گیٹ اپ چینج کر جاؤ۔'' عاشی نے ہاتھ جوڑے۔

''ہاں واقعی یہ نہ ہو کہ دانیال کی چیخیں ہاسٹل کے درو دیوار ہلا دیں، بھئی اپنا تو ہاسٹل بھی ماڑا (کمزور) سارا ہی ہے ایسی دہشت بھری چیخیں نہ سہار پائے گا بے چارہ۔'' سمری کو ایڈوانس میں ہی ہاسٹل کے درو بام کی فکر نے آگھیرا۔

''حد ہو گئی ہے بھئی تم لوگوں نے تو پتہ نہیں کیا سمجھ رکھا ہے میں تیار ہو کر اگر پری لگتی ہوں تو بنا تیاری کے بھی شہزادی ہی دکھتی ہوں۔'' میں نے انہیں چڑاتے اور تپانے کو بڑے ناز سے کہا۔

''اووو ہو ہو یعنی کے خوش فہمیوں کی انتہا ہو چکی ہے، بی بی کم از کم ''بوتھا'' شریف دھو کے اپنا یہ انار کلی والا ڈریس ہی بدل لو۔'' انیتا نے بھی میدان میں کودنا اپنا فرض سمجھا، بس پھر کیا تھا، وہ چار عدد بیوٹیشنز بڑی پھرتی سے میرے اردگرد منڈلانے لگیں، اگلے پندرہ منٹ تک وہ مجھے سجا سنوار کے واقعی انسانوں والے حلیے میں لا چکی تھیں، ان کے اس خلوص پر میں تو نہال ہی ہو گئی، اس سے پہلے کہ ہماری آنکھیں ان کا شکریہ ادا کرنے کو چھلک پڑتیں انہوں نے ڈپٹ کر میرے سر پر دوپٹہ سلیقے سے اوڑھایا اور مجھے چلتا کیا۔

ویٹنگ روم تک پہنچتے پہنچتے میں کوئی بیسیویں مرتبہ دوپٹہ ٹھیک کر چکی تھی، (ایک تو منگنی کروانے کا نقصان یہ بھی ہوا کہ پہلے جو دوپٹہ

چوبیس گھنٹے ہمارے کندھے کے ایک طرف پڑا اپنی حالت زار پر آنسو بہاتا رہتا تھا اب بہت غرور و تکبر سے ہمارے سر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا اور ہمیں سر جھکائے اس کے ناز سہنے پڑتے) کمرے کے اندر جانے سے پہلے ہم نے ایک بار پھر دوپٹہ سیٹ کر کے جمایا اور اوپر نگاہیں اٹھائیں، پتہ نہیں کیوں وہی دانیال جس کو ہم اپنے جیسی دبنگ ہٹلر کے سامنے کچھ بھی نہ جانتے تھے آج وہ بلا مقابلہ ہی خود پہ حاوی نظر آ رہا تھا۔

(منگنی کا ایک اور نقصان) خیر ہم دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالے اندر چلے گئے، ازلی اعتماد اور وقار کو اپنے اندر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہماری بینائی دھندلا رہی تھی، دانیال سامنے ہی صوفے پر بیٹھا ہوا ملا، He was looking so handsome اورنج سی شرٹ بلیک پینٹ اور ساتھ بلیک ہی کوٹ میں وہ کسی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا؟ (اامم م، یاد نہیں)

بہرحال ہم اسے دیکھ کر یکدم بہت شرما سے گئے، (اُف)۔

''اوہو کیا ہو گیا ہے تجھے عابدہ؟ اگر وہ آج کل کی فلمز کا ہیرو لگ رہا ہے تو تم کیوں پندرھویں صدی کی ہیروئن بن رہی ہو اکیسویں صدی کی لائق فائق ''چنگی بھلی'' سٹوڈنٹ ہو کر ایسی حماقتیں؟ No way بی بولڈ اینڈ کانفیڈنٹ۔''

ہم نے جھٹ اپنے آپ کو خوب ساری جھاڑ پلائی مگر دل نگوڑا پھر بھی دھک دھک ہی کرتا رہا، (یہ بھی منگنی کی ہی کارستانی لگتی ہے)

''السلام علیکم!'' ہم تو چپ چاپ کسی روبوٹ کی طرح جا کر وہاں بیٹھ گئے تھے اور زبان بھی شاید کہیں کمرے میں ہی بھول آئے تھے اسی لئے ہمارے احترام میں کھڑے ہوئے دانیال نے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کیسے ہیں۔'' جواباً ہم بھی منمنائے آخر۔

''ٹھیک ٹھاک آپ کیسی ہیں؟'' اس نے بھی آداب مہمان نبھائے۔

''جی ٹھیک۔'' ہم لاکھ کانفیڈنٹ سہی مگر ایک مشرقی اور روایتی لڑکی ہونے کا فرض خوب خوب نبھا رہے تھے، دانیال مجھے کافی دیر تک بس دیکھتا ہی رہ گیا تو جہاں ہم پھولے نہیں سما رہے تھے وہیں پسینے میں بھی نہا رہے تھے، (پتہ نہیں ایسا کیا تھا ان کی نظروں میں ہمیں آج تک سمجھ میں نہیں آیا)۔

''کیا لیں گے آپ؟ چائے، کافی یا پھر کولڈ ڈرنک۔'' آخر کار ہمیں پانچ منٹ کی سوچ بچار کے بعد خیال آہی گیا تو گلا کھنگار کر پوچھا۔

''سبھی کچھ لیں گے جناب مگر باری باری، پہلے کولڈ ڈرنک ہو جائے پھر آپ کے ہاتھ کی چائے اس کے بعد آپ کے انہی کومل ہاتھوں سے بنا ہوا healthy سا لنچ اور اس کے اینڈ پہ کافی۔'' اس نے بے وجہ ہی دانت دکھاتے ہوئے کہا تو ہمارے تو چھکے ہی چھوٹ گئے۔

''یا اللہ یہ کیسا نیا امتحان ہے۔'' ہم نے بھی اس کی بات سراسر مذاق سمجھ کر مسکرانے کی کوشش کی (پر اوس ٹائم ہنسی کتھوں؟) ہمیں تو نئی فکر پڑ گئی۔

''یہ کیسی بات کی آپ نے؟'' ہم کچھ نہ سمجھی میں بولے۔

''کیوں؟ کیسی بات کی میں نے؟'' وہ الٹا ہمی سے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ اتنی دیر یہاں رکیں گے؟'' ہم نے شرم ورم کا لبادہ جھٹ اتار دیا۔

''ارے یہاں کیوں رکیں گے ہم سب تو آج عائشہ کے گھر انوائیٹڈ ہیں ناں؟'' وہ مجھ

www.paksociety.com

سے پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا؟ (میں سمجھی نہیں) عاشی کے گھر؟ نہیں تو آپ سے کس نے کہا؟'' مجھے اس کے انداز سے اندازہ ہوا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا کہیں کوئی گڑبڑ تو ہے۔

''عائشہ نے کل مجھے فون کر کے کہا تھا کہ اس ویک اینڈ پہ آپ کا پورا گروپ اس کے گھر چھٹی منانے جائے گا اور یہ کہ آپ ضد کر رہی تھیں کہ میرے بغیر آپ نہیں جائیں گی، ان فیکٹ اسی نے کل مجھے بتایا کہ آپ کا ارادہ مجھے اپنی کوکنگ کوالٹیز سے روشناس کروانے کا ہے، یعنی آپ چاہتی ہیں کہ مجھے لنچ پہ انوائیٹ کریں اور خود اپنے ان خوبصورت ہاتھوں سے میری فیورٹ ڈشز بنا کر......'' وہ تو شروع ہو گیا تھا ابھی اور بھی جانے کیا کیا انکشافات کرتا مگر ہم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا۔

''دیکھئے ان لوگوں نے آپ کو فول بنایا ہوگا کیونکہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' میں نے جان چھڑائی۔

''کیا؟ مگر یہ کیسا مذاق ہے؟'' وہ کچھ سراسیمہ اور کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

''یہ کوئی مذاق وزاق نہیں ہے دانیال بھائی مذاق تو یہ اب کر رہی ہے آپ کے ساتھ۔'' اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی وہ آفت کی پرکالائیں اور لومڑی کی خالائیں ٹپک پڑیں۔

''ہم واقعی آج بلکہ ابھی جا رہے ہیں عاشی کے گھر دیکھئے ہم لوگ بالکل تیار ہیں اور یہ بھی۔'' زیبی نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر کہا۔

''زیبی کیا کہہ رہی ہو تم۔'' ہم نے الفاظ کے ساتھ ساتھ دانیال سے آنکھ بچا کر زیبی کو گھورا۔

(ہمارے بس میں ہوتا تو اس وقت اس کچا چبا جاتے بس ذرا دانیال کا لحاظ کرنا پڑا۔)

''اب بس بھی کرو ناں یار دیکھو تو دانیال بھائی کیسے پریشان ہو گئے تمہارے اس مذاق سے۔''

سمیری بھی زیبی کی طرح مکاری دکھاتے ہوئے اسی کا پلہ بھاری کرنے لگی، ان کی چالاکی دیکھ کر میرے اندر بھانبڑ جلنے لگے تھے مگر بظاہر میں بہت صبر سے بیٹھی رہی۔

''تو اور کیا اگر تم نے جانا نہ ہوتا تو اتنی صبح صبح اتنا اچھا تیار ہو کر کیوں آتیں؟'' انہوں نے ایک اور پوائنٹ اٹھایا تو میری بولتی بند ہو گئی۔

''اچھا تو یہ تھی ان کمینیوں کی سازش اور میں خواہ مخواہ ہی ان کے واری صدقے جا رہی تھی۔'' مجھے خود پر جی بھر کے غصہ آیا۔

''بھلا جس کی دوستیں ان جیسی ہوں انہیں دشمنوں کی کیا ضرورت۔'' میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت بھی، آنکھیں گویا ابل ابل کر باہر آنے کو تھیں مگر ان چڑیلوں پر ہماری ان گھوریوں اور آنکھوں کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا، میں دانیال سے نظر بچا کر انہیں کے دکھاتی اور دانت پیستی ہی رہ گئی۔

''چلیں دانیال بھائی دس بج چکے ہیں، آپ گاڑی لائے ہیں ناں۔'' عاشی بیگم گھڑی پر نظر ڈال کر عجلت میں بولیں جیسے ٹرین چھوٹ رہی ہو۔

''لیں میڈم آپ نے کہا تھا تو بھولتا کیسے؟'' دانیال خوشدلی سے مسکرا کر بولا۔

یقیناً وہ ان ڈائنوں کے سفید جھوٹ سے مطمئن ہو گیا تھا، اب میری اکیلی کی بات کیا وزن رکھتی؟ اس لئے میں نے دانیال سے کچھ کہنے کی بجائے ان چاروں سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

''ایک منٹ میں اپنا بیگ لے آؤں۔''

میں بھی کم چالاک نہیں تھی جو چپ چاپ ان کے جلنے دیتی فوراً بہانہ گھڑا اور کمرے سے باہر نکل آئی، آخر ماجرا کیا ہے، ان شاتر لومڑیوں کے ذہن نے یہ کیسا پلان گھڑا کب؟ کیوں اور کیسے؟ جیسے بہت سے سوال میرے دماغ کی دہی کر رہے تھے، مجھ سے رہا نہ گیا تو کمرے کے باہر سے ہی زیبی کو آواز دی، اندر بیٹھی زیبی نے میری آواز سن کر بھی ان سنی کر دی تو ناچار مجھے ایک بار پھر اندر جانا پڑا۔

''ایکسکیوزمی میڈم اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا مجھے روم کی چابی مل سکتی ہے یا میں ایسے لاک دروازے سے ہی بیگ لانے کا جادو جانتی ہوں۔'' میرا طنز تو بہت کٹیلا تھا مگر ادھر کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ چاروں دانت دکھاتی رہیں، شاید میری حالت زار سے حظ لے رہی تھیں، یہ ساری پلاننگ یقیناً عاشی بیگم کے شاطر دماغ کی ہی تھی جبھی وہ آج ہمارے گروپ کی لیڈر بنی بیٹھی تھی، روم کی چابی بھی اسی نے پاکٹ سے نکال کر دی، اس دوران سمری، زیبی اور انیتا مجھے ٹوٹلی اگنور کرتے ہوئے دانیال سے یوں بات چیت کر رہی تھیں گویا وہ ان کا سگا بھائی یا کزن ہو، وہی دانیال فاران جسے وہ میرے منگیتر کا اعتزاز پانے سے پہلے ''دانی کا بچہ'' کہا کرتی تھیں اب ''دانیال بھائی'' ہو چکا تھا کہاں تو اس قدر جیلس ہو رہی تھیں یہ ہم دونوں کے رشتے سے اور کہاں اب یہ سارا ڈرامہ، بات مجھے کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی کمرے میں آ کر بیگ تو کیا لینا تھا سوچ بچار کر کر کے ہمارے دماغ کی شریانیں پھولنے لگی تھیں۔

''ہو نہ ہو یہ لوگ کوکنگ کے حوالے سے دانیال کے سامنے میری بے عزتی کروانا چاہتی ہیں، لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔''

بالآخر میرے چھوٹے سے مگر تیزی کے ساتھ چلتے دماغ نے نقطہ پکڑ ہی لیا، یہ سب جانتی تھیں کہ پڑھائی لکھائی، زبان درازی، چٹورے چسکے کھانے پینے اور لڑنے بھڑنے میں میں جس قدر ماہر تھی، کوکنگ کے معاملے میں اسی قدر پھوہڑ اور جاہل تھی، بس میری اسی کمزوری کا یہ لوگ فائدہ اٹھا کر اپنی جیلسی کا بدلہ لینا چاہ رہی تھیں، میں جلے پیر کی بلی بنی پورے کمرے کے چکر پہ چکر کاٹ رہی تھی۔

''او ماں کیا کروں؟ ماں؟ ارے ہاں کب کام آئے گی آخر اپنی ماں۔'' ذہن کی بتی جلی تو امید کی کرن پھوٹ پڑی میں بڑے مطمئن انداز میں بیگ لئے بنا ہی نیچے چلی آئی۔

''ایکسکیوزمی گرلز آپ لوگوں کو پتہ ہی ہے کہ میں ماما کی پرمیشن کے بغیر کہیں نہیں جاتی تو میں نے اب تک ماما سے اجازت نہیں لی۔'' اپنے آپ پر فدا ہوتے دانیال کو اور بھی چاروں شانے چت کرنے کے لئے ہم نے فرمانبردار بیٹی والا کردار بھی نبھایا۔

''تو؟'' سمری نے میری بات اچک لی۔

''تو یہ کہ ابھی میں نے ماما کو فون کیا ہے تا کہ ان سے پوچھ سکوں ماما نے کہا ہے کہ اگر چھٹی منانی تو اپنے گھر آؤ، ساتھ بے شک ان سب کو بھی لے آنا مگر کسی اور کے گھر دانیال کے ساتھ جانے کی پرمیشن نہیں۔'' میں نے بہت سوچ سمجھ کر تیر چھوڑا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دی، وہ سب میری بات سن کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تو میں سمجھ گئی کہ اب یہ محترمائیں اپنا پلان چوپٹ ہونے پر بغلیں جھانک رہی ہیں، دانیال کے سامنے بھی میں معتبر کی معتبر۔ (واہ عابدہ واہ)

اس سے پہلے کہ میں اپنا کندھا تھپکتی دانیال

بولا۔

''لیکن آنٹی سے تو ابھی ہماری بات ہوئی ہے۔''

''دھت تیرے کی۔'' میرے منہ کا زاویہ جو دس بج کر دس منٹ پہ ہی فٹ ہو گیا تھا یکدم آٹھ بج کر بیس منٹ دکھانے لگا۔

''جی سویٹ فرینڈ جی، ہم جانتے ہیں کہ آپ اپنی ماما کی پرمیشن کے بغیر کبھی کہیں نہیں جاتیں اسی لئے ہم نے دانیال کے سامنے ابھی آپ کی ماما سے بات کر کے اجازت نامہ وصول کر لیا ہے، ہمیں تو آنٹی نے ایسا کچھ نہیں کہا؟'' عاشی کی بچی ہشیار کیا ڈیڑھ ہشیار نکلی، اب بغلیں وہ نہیں میں جھانک رہی تھی۔

''لیکن میں...... وہ......'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن سکا تو دانیال اٹھ کھڑا ہوا۔

''دیکھئے اگر آپ میرے ساتھ جانے کی وجہ سے کوئی پرابلم ہے یا آپ مجھ لنچ نہیں کروانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں چلا جاتا ہوں، اصل میں آپ کی فرینڈز نے آپ کے ہاتھ کے ٹیسٹ اور کھانوں کی اس قدر تعریف کی کہ میرا خود بھی دل چاہنے لگا کہ ایک بار آپ کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں، یہاں ہوٹلز اور میس کا کھانا کھا کھا کر دل اوبھ گیا تھا سو چا منہ کا ذائقہ بھی بدل جائے گا اور آپ کے ہاتھوں کے پکے کھانے کا ٹیسٹ چیک کرنے کی سعادت بھی حاصل ہو جائے گی مجھ غریب کو، لیکن اگر آپ نہیں چاہتیں تو......'' مسکین سی شکل بنا کر وہ جانے کے لئے بڑھا تو ہم سے رہا نہیں گیا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں، چلئے میں چلتی ہوں۔'' میں نے اس کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھر ہی لیا، چند منٹ بعد میں بیگ لے کر نیچے آ چکی تھی، تب تک یہ ہجوم ہاسٹل سٹاف کو مطلع کر کے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا، دانیال فرنٹ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا جبکہ یہ چاروں ''پھاپھے کٹنیاں'' پچھلی سیٹوں پر چڑھی پھنس پھنسا کر بیٹھی ہوئی تھی میرے لئے دانیال کے برابر والی فرنٹ سیٹ خالی چھوڑی گئی۔

''صد شکر کہ ان گھامڑوں کو اتنا لحاظ تو رہا میرا۔'' میں نے کلس کر سوچا اور پھر مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی، پورا راستہ یہ لوگ خوب چہکتے اور انجوائے کرتے آئے مگر میں ایک ہی بات سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ۔

کاش ہم نے اماں کی بات پر کان دھرے ہوتے کاش پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوکنگ کا بھی کچھ سیکھ لیا ہوتا تو آج میری ''بوتھی'' اس طرح نہ لٹک رہی ہوتی، اماں کی باتیں اب ایک ایک کر کے ذہن میں گھوم رہی تھیں اب دو ہفتے پہلے جب ہم چھٹیوں میں اپنے اپنے گھر گئے تھے تو اماں نے مجھے ''چرتے'' دیکھ کر کتنا ڈانٹا اور سمجھایا تھا کہ؟ ''اونٹ جتنا قد کر لیا ہے تو نے، پڑھنے پڑھانے میں بھی تیز ہو اور منہ چلانے میں بھی مگر رسوئی کے کام کا کچھ آتا نہیں، ارے اب تو تیری منگنی ہو گئی سال بھر میں شادی بھی ہو جائے گی، کیا کتابیں پکا پکا کر دے گی شوہر کو؟'' اور اماں کی اس سادا اور محبت بھری ڈانٹ پہ پہلے تو ہم خوب ہنسے پھر بولے۔

''ہاں ماں جی، آپ کی بیٹی ایسا ہی کوئی کارنامہ کرے گی، ہم ''فرائیڈ بکس'' کے نام سے ایک نئی ڈش ایجاد کریں گے یاہو۔'' ہاتھ اونچا کر کے نعرہ لگاتے ہوئے ہم کچن سے سلاد کی پلیٹ اٹھا کر باہر نکلے تھے تو اماں کتنا ''دکھی'' تھیں، اگر اس دن ہی ہم نے کم از کم ایک ہی ڈش سیکھ لی ہوتی تو اتنی سبکی تو نہ ہوتی آج، اس سے پہلے کہ ہم دھاڑیں مار مار کر رونا شروع

کرتے اور ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر فرمائش کرنے لگتے کہ ''ہمیں ابھی اسی وقت اپنی اماں کے پاس جانا ہے'' صد شکر ہوا کہ عاشی کا گھر آ گیا اور وہاں اس کے میاں یعنی (ابوبکر بھائی) کو استقبال کے لئے کھڑے دیکھ کر ہمارے موٹے موٹے آنسو جو آنکھوں میں بھرے چھلکنے کو بے تاب تھے وہ دوبارہ سے اندر ہی جذب ہو گئے۔

''کیا تھا اگر اللہ تعالیٰ مردوں کے دل تک جانے کے لئے معدے کا راستہ ہٹا کر دماغ کا راستہ یا پھر کوئی بھی اور راہ بنا دیتے۔''

(ویسے اگر معدے کی بجائے دماغ کا راستہ مرد کے دل کو جاتا تو ایک بات تو طے ہے کہ ''کڑیاں ساریاں فیل ای ہوندیاں، ''شکر ہے معدے کے راستے بنا کر اللہ نے عورت کے لئے آسانی پیدا کی۔'' احساس ہونے پر ہم جھٹ مشکور ہوئے) کوکنگ سیکھنے سے زیادہ مشکل ہے عقل سیکھنا، لیکن فی الحال تو میرے لئے امر محال تھا دانیال کے لئے کوئی ڈش بنانا، میں اسے تھیوری، فلسفہ، فارمولے، فیثا غورث کے مسئلے سبھی کچھ کر کے دکھا سکتی تھی مگر کھانا پکانا، اف ناممکن، میں نے دانیال اور پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹھسی بیٹھی ان چار عدد بھیڑ بکریوں کو نعرہ مار کر اترتے دیکھا، دانیال بہت خوشدلی سے ابوبکر کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا، جبکہ پیچھے پوری پلاٹون دانت نکوستے ہوئے ہیلو ہائے بولتی آگے نکل گئی، ناچار ہمیں بھی نیچے اتر کر ابوبکر بھائی سے سلام دعا کرنا پڑی، جی چاہ رہا تھا وہیں سے الٹے پیروں اپنے گھر کو دوڑ لگا دیں یا کسی سلیمانی ٹوپی کی بدولت ایسا غائب ہوں کہ ہمیں کچن جیسی مشقت سے رہائی مل جائے۔

☆☆☆

دوست دوست نہ رہا ، پیار پیار نہ رہا
زندگی ہمیں تیرا اعتبار نہ رہا

خوش گپیوں کے دوران سبھی کولڈ ڈرنکس اور سنیکس بسکٹس کے ساتھ خوب انصاف کر رہے تھے بس ایک ہم ہی تھے جو اپنی دوستوں کو خوب جی بھر کر کوس رہے تھے۔

بھلا اس سب ڈرامے سے انہیں کیا مل جانا ہے، اب تک مجھے اکیلے میں ان سب سے بات کرنے کا موقع نہ ملا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ''مصیبتیاں'' جان بوجھ کر مجھے ایسا موقع نہیں دے رہی تھیں، میں نے اشاروں کنایوں میں انہیں الگ ہو کر بات سننے کے لئے کہنا چاہا مگر مجال ہے جو انہوں نے دھیان دیا ہو، جب کولڈ ڈرنکس ختم ہو چکیں تو برتن اٹھا کر اندر جاتی عاشی پر جیسے ہی ہماری نظر پڑی ہم پلک جھپکتے ہی اس کے پیچھے لپکے۔

''یہ کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے تم لوگوں نے میں کسی کے لئے کوئی ڈش وش نہیں بناؤں گی، تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے کچھ بھی پکانا نہیں آتا صرف ایک چائے کے سوا، وہ بھی ایسی بنتی ہے کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا اسے پینے کا حوصلہ نہیں رکھتا، انڈہ بوائل کرتی ہوں تو وہ کبھی ربڑ بن جاتا ہے تو کبھی چھلکتا ہوا مواد اسی طرح کچا باہر آ گرتا ہے، پھر ایسے میں، میں کوئی کھانے والی چیز کیسے بناؤں گی، وہ بھی دانیال کے لئے Never۔'' میں نے اندر کا زہر اگل دیا۔

''تو محترمہ جب اس کے سامنے مٹک مٹک کر اپنی تعلیمی قابلیت اور ناز و انداز دکھاتی ہیں تو اپنی یہ نااہلی بھی بتا دیا کریں اسے پھر دیکھتی ہوں کیسے کرتا ہے وہ تم سے شادی؟'' اس نے کمر پر دونوں ہاتھ جما کر ''اپنا ساز'' نکالا۔

''ارے مرد تو اس عورت کو عورت ہی نہیں سمجھتے جسے کچھ رسوئی کا کام نہ آتا ہو، آدمی کا معدہ

خوش ہو تو ہی وہ خوش ہوتا ہے۔" اس نے سیانی بڑھیا کی طرح "بھاشن" دینا شروع کر دیا۔

"میں کچھ نہیں جانتی مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ یہ گھر تمہارا ہے اور ہم تمہارے مہمان، سو تو تمہیں ہی کرنا پڑے گا، کوکنگ کا سب کام تم ہی کرو گی اکیلی، میں کچھ نہیں پکاؤں گی کسی کے لئے۔" میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر گویا بات وائنڈ اپ کی۔

"اچھا نہیں پکاؤ گی؟ تو ٹھیک ہے ابھی یہ بات خود جا کر دانیال سے بول دو، کہ تمہیں کچھ بھی پکانا نہیں آتا اور یہ بھی کہ تم اس کے لئے کچھ نہیں پکاؤ گی۔" اس نے بھی معاملہ ختم کیا۔

(بڑی تیز ہے جانتی تھی کہ میں اپنی نا اہلی اور کمزوری کا ڈھونڈورا یوں سر عام نہیں پیٹ سکتی اور اپنے منگیتر کے سامنے تو ہرگز نہیں)۔

"یار ترس کھاؤ میرے حال پہ، کیوں میری جان کی بلکہ میری عزت کی دشمن بنی ہوئی ہو۔" ساری اکڑفوں ناک کے راستے بہہ گئی تو میں نے ایموشنل ہو کر کہا۔

"اچھا جی تم ہمارے سامنے ہماری ہی کلاس میں ہمیں بھول بھال کر اپنے منگیتر سے "آنکھ مٹکے" کرو اور ہم چپ چاپ سب دیکھ کر برداشت کریں بدلہ بھی نہ لیں۔" اسے زیادہ غصہ دوستوں کو فراموش کرنے کا تھا یا "آنکھ مٹکا" کرنے کا مجھے سمجھ نہیں آیا۔

"دیکھ لے میری چنگی سوہنی پین (بہن) ایں ناں؟ چلو ہم سب مل کے پکاتے ہیں۔" میں نے اسے بہلایا کیونکہ سانپ ابھی تک اسی پٹاری میں تھا۔

(یہ نیا محاورہ خود میں نے ایجاد کیا ہے سمجھ تو گئے ہوں گے آپ)۔

"جی نہیں میں اور اینا تو آل ریڈی اپنے اپنے شوہروں کے لئے کھانا پکاتی ہیں (جب بھی چھٹیوں میں گھر جاتی ہیں ورنہ تو ہاسٹل میں موجیں ہی کرتی ہیں) رہی زیبی اور سمری تو زیبی کوکنگ ایکسپرٹ ہے جانتی ہو ناں، سمری بھی اتنا تو پکا ہی لیتی ہے کہ بندہ "چنگی طرحاں رج جائے۔" (پیٹ بھر کر کھا لے) اب آ جا کے ایک تم ہی بچی ہو جو کھانے کی چٹوری مگر پکانے کے ہنر سے بالکل ہی نابلد اور کام چور ہے۔"

"تو پھر یہ سب جانتے ہوئے بھی تم اسے کھانا بنانے کا کہہ رہی ہو عاشی کس قدر احمق ہو تم، لگتا ہے آج ہم سب کو بھوکا رکھنے کا ارادہ ہے تمہارا۔" اینا، سمری، زیبی تینوں نجانے کب سے دروازے کے ساتھ چھپکلی کی طرح چپک کر کھڑی تھیں اندازہ ہی نہ ہوا، اب سمری ندیدی پیٹ پکڑے خود ترسی کا شکار لگ رہی تھی۔

(بے چاری ایڈوانس میں ہی بھوکے رہنے کے تصور سے نڈھال ہو گئی تھی۔)

"ہاں تو، یہی تو میں کہہ رہی ہوں اسے کہ مجھ سے نہیں ہو گا یہ سب۔" میں سمری کا طنز نہ سمجھ کر بڑی سادگی سے کہہ گئی۔

"تو بچو ووو، اب نہیں سیکھو گی تو کب سیکھو گی؟ کرنا تو پڑے گا جانی۔" زیبی نے بڑے دلار سے میرے گلے میں بازو ڈال کر پانسہ پھر وہیں پھینک دیا تھا۔

"زیبی تم آج سکھاؤ ناں مجھے میں کل پرسوں بنا کر تم سب کو کھلاؤں گی پرامس، مگر آج تم بناؤ گی پلیز۔"

میری جان "پھاہ" میں آئی ہوئی تھی، کسی طرح تو بچانا تھا نا خود کو، الغرض آدھے گھنٹے کی بحث و تکرار اور قول و قرار کے بعد (کہ آئندہ دانیال کے مقابلے میں میں دوستوں کو کبھی بھی اگنور نہیں کروں گی) وہ اس بات پر راضی ہو ہی گئیں کہ کھانا سب مل کر پکائیں گی۔

(آخر دوستی کس دن کام آنی تھی، یہ الگ بات کہ یہ سب انہی دوستوں کا کیا دھرا تھا مگر اب اس دلدل سے نکالنے والی بھی وہی دوستیں تھیں، شاید میرے وہ ڈھائی ڈھائی من کے آنسو ان سے سہے نہیں گئے تھے جو انہیں مناتے اور اپنی پچھلی غلطیوں پہ توبہ مانگتے ہوئے ہم نے گرائے تھے۔)

☆☆☆

"تو آج آپ ہمارے لئے کیا بنا رہی ہیں؟" دانیال نے ڈائریکٹ مجھ سے سوال کر ڈالا تو ہمارے ہاتھوں پیروں کو طوطے ایک بار پھر سے اڑنے لگے، حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اپنے گروپ کو منا کر ٹی وی لاؤنج میں پہنچے تھے، جہاں ابوبکر اور دانیال بیٹھے تھے۔

"آآآآ......وہ......مینیو معلوم نہیں ابھی، آپ ہی بتا دیجئے کہ کیا بنائیں۔" میں نے بمشکل بات سنبھالی اور ساتھ ہی اپنی دوستوں کی تائید چاہی۔

"کیوں عاشی؟"

"ہاں ہاں جو آپ کہیں گے وہی ملے گا، بس آپ لوگ آرڈر کریئے۔" اس نے اپنے میاں کو بھی بیچ میں گھسیٹا۔

"آج کی دعوت کچھ الگ ٹائپ کی ہو گی بھئی آج ہم اپنی بیگم کو کام نہیں کرنے دیں گے، آپ چاروں کچن میں جائیں گی اور اپنی اپنی مرضی کی ڈشز بنائیں گی۔" عاشی کا شوہر تو ایک نمبر کا "رن مرید" نکلا۔

(کیسے اپنی بیوی کو بچا رہا ہے ہونہہ) ہم سب نے جل بھن کر یہی سوچا تھا۔

"بالکل صحیح کہا ابوبکر صاحب آپ نے، آج آپ کی بیگم سمیت ان تینوں کی بھی چھٹی آج کا کھانا صرف اور صرف میری ہونے والی بیگم عابدہ پروین ہی کے خوبصورت اور خوش ذائقہ ہاتھوں سے بنے گا کیوں؟" دانیال صاحب نے بے وجہ ہی گردن اکڑا کر کہا تو مجھے پہلی بار (منگنی کے بعد) اس پہ اتنا غصہ آیا تھا کہ جی چاہا خون ہی پی جاؤں اس کا۔ (گستاخی معاف دانیال جی)

"جی نہیں، میں اپنے گروپ کے ساتھ ہی کام کرتی ہوں، ان کے بغیر کچھ کرنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔" میں نے فوراً چیخ کر جواب دیا۔

"اس کا مطلب شادی کے بعد مجھے آپ کے گروپ کو بھی ساتھ لے جانا پڑے گا؟" دانیال نے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو باقی سب کی ہنسی چھوٹ پڑی۔

"آپ کچھ بھی کہیے بہر حال میں اپنی دوستوں کے بغیر کھانا نہیں بناؤں گی۔" میں نے پھولے ہوئے منہ کو اور بھی پھلا لیا، (دوستوں کا ساتھ ملا تھا تو پہلے والا اعتماد عود کر آن پہنچا۔)

"لگتا ہے آپ کو اکیلے کھانا بنانا نہیں آتا۔" دانیال نے قیافہ شناس ہونے کا ثبوت دیا مگر ہمارے ہوتے ہوئے اس کے قیافے کہاں چلنے تھے بھلا؟

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا اور کام کرنا اچھا لگتا ہے بولو نا اینا۔" میں نے ہاتھ چھپا کر ساتھ بیٹھی اینا کی کمر پر زوردار چٹکی کاٹی تو وہ بولی کم اور چیخی زیادہ۔

"جی جی جی، صحیح کہہ رہی ہے یہ۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ہمیں بے دریغ گھورا، تو ہم نے چہرے پہ دنیا جہان کی معصومیت طاری کر لی۔

"ٹھیک ہے تو پھر ایسا کرتے ہیں کھانا آپ سب مل کر بنا لو مگر اس کے بعد میری پسند کے گول

گپے اکیلی ''مس عابدہ'' بنائیں گی۔'' دانیال نے اعلان کیا تو ''گول گپوں'' کا نام سن کر ان سب نے بلاتوقف تالیاں پیٹنا شروع کردیں۔

(نادیدیاں خوشی میں یہ بھی بھول گئی کہ مینوں گول گپے بنانے وی تے نہیں آوندے (کہ مجھے گول گپے بنانے بھی تو نہیں آتے)۔

میرا منہ ایک بار پھر کھلا دیکھ کر دانیال نے فٹ ٹوکا۔

''پلیز اب پھر سے کوئی بہانہ مت گھڑیئے گا، میں صرف اور صرف آپ کے ہاتھ کا ذائقہ چکھنا چاہتا ہوں اور ایک بات یاد رکھیے گا کہ میرا ٹیسٹ سینڈرڈ بہت ہائی ہے، مطلب میں کھانے میں ذائقے کا قائل ہوں، اب دیکھتے ہیں کہ آپ کے جادوئی ہاتھ کون سا جادو دکھاتے ہیں۔''

''یوں بھی آپ بھی تو ان سب سے یہی ضد لگا کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ آپ خود مجھے میری پسند کا کھانا بنا کر کھلائیں گی اب کم از کم ایک ڈش تو پیورلی آپ کے ہاتھ کی ہو۔'' وہ اور بھی نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا ہم تو بس ان نمونوں کو باری باری گھورنے جارہے تھے، جواب خفت زدہ سی ہم سے نظریں چرارہی تھیں۔

☆☆☆

کبھی ڈھکن اٹھالیا
کبھی چمچہ گرادیا
تیرے کھانے اف یہ کھانے
باورچی رے......
سب کچھ جلادیا
اوتونے......
سب کچھ جلادیا

زیبی بلند و بانگ دہائیاں دیتے ہوئے شاہ رخ خان کی فلم ہم تمہارے ہیں صنم کے سونگ ''کبھی بندھن بنا لیا، کبھی دامن چھڑا لیا'' کا ستیاناس مار رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کچن کا بھی۔

''مٹن اور قورمہ بنانے کی ذمہ داری اس کی تھی جبکہ عاشی، انیتا اور سمری بالترتیب بریانی، بوائلڈ رائس، چکن جلفریزی، چکن فرائیڈ رائس، چائنیز رول اور چپاتیوں کے ساتھ پتہ نہیں کون کون سی الا بلا تیار کررہی تھیں جن کے مجھے نام تک ٹھیک سے یاد نہیں، (بس اتنا پتہ ہے کہ اس ڈش کا ٹیسٹ ایسا ہوتا ہے اور اس کا کلر ایسا)''

میرے ذمے چٹنی تیار کرنا سلاد بنانا اور برتن دھو دھو کر انہیں فراہم کرنا تھا، ساتھ ساتھ ''ٹسوے'' بہانے کی ذمہ داری ہم نے بقلم خود اٹھائی ہوئی تھی۔

''گول گپے سر پر ایسے سوار تھے کہ ہمیں ان کے باتوں اور چٹکلوں کی کچھ سمجھ نہ آرہی تھی۔''

''ارے رونے سے گول گپے نہیں بنتے جانم اس کے لئے ہاتھوں کو زحمت دینا پڑتی ہے، پریکٹس کرنی پڑتی ہے پریکٹس۔'' جب بیس پچیس منٹ کی آہ وزاری کے بعد بھی ہمارے رونے اور دھونے میں کوئی فرق نہ آیا تو عاشی نے ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت کی۔

''شٹ اپ، یہ سب کیا کرایا تم لوگوں کا ہی ہے اب میں روؤں یا ہنسوں تمہیں کیا۔'' میں تو اسے کاٹ کھانے کو چڑھ دوڑی۔

(کب سے بھری بیٹھی تھی آخر بھڑاس تو نکالنی تھی)۔

''غصہ نہ کر سوہنی، گول گپے ہم سکھائیں گے نا تمہیں، یہ کون سا مشکل کام ہے ایک کاپی پنسل لاؤ اس کے سارے ان گریڈینٹس اور طریقہ کار ہم بتاتے ہیں تم نوٹ کرلو اور پھر بنالینا۔'' انیتا دور کی کوڑی لائی تھی، چٹکی بجاتے ہی اس نے مسئلے کا حل پیش کیا تو ہم نے فرط مسرت سے اس

کے رخ انوار کو چوم لیا۔

(جی جی یاد ہے ہمیں کہ انوار انیتا کے شوہر کا نام ہے اب آپ رخ انوار سے انوار صاحب کا رخ مراد مت لے لیجئے گا، ہم تو انیتا کے چہرے کی بات کررہے تھے، اس کے شوہر نامدار کی نہیں۔'')

پھر کیا تھا قارئین کرام ہم فٹافٹ کاپی پنسل تھامے ان کے پاس پہنچے۔

''ہاں بتاؤ کیا طریقہ ہے۔'' پھولے ہوئے سانسوں کو ہموار کرنے سے پیشتر ہم بولے، ہم جتنے اتاولے ہورہے تھے۔

دوسری جانب اتنی ہی ست روی اور بے نیازی کا مظاہرہ ہوا۔

''ہم بتائیں گے لیکن چند شرائط وضوابط کے بعد۔'' سمری نے پھلجھڑی چھوڑی۔

''ہیں شرائط وضوابط؟ کیسی شرائط اور کیسے ضوابط؟'' ہمارے تو سر کے اوپر سے ہی گزر گئی۔

''شرط نمبر ایک کہ آج کے بعد تم ہم پر رعب نہیں جھاڑو گی۔'' عاشی نے میری کرسی کے گرد ایک چکر لگایا اور ایک شرط گنوائی۔

''شرط نمبر دو کہ تم ہمیں آئندہ کبھی گالی نہیں دو گی۔'' زیبی نے بھی اسی کے انداز میں چکر کاٹتے ہوئے دوسری قدغن لگائی۔

''شرط نمبر تین کہ تم ہمیں اپنی میتھ کی اسائنمنٹ دو گی وہ بھی پورے دو دن کے لئے۔'' یہ انیتا تھی، جس کی نظر بلکہ چھچھوری نظر کب سے میری میتھ ٹیسٹ کی اسائنمنٹ پر تھی۔

''شرط نمبر چار تم ہمارے خلاف کوئی انتقامیہ کاروائی نہیں کرو گی اور نہ ہی کسی سے ہماری شکایت کرو گی۔'' سمری کیونکر پیچھے رہتی وہ بھی انہی کی طرح وانٹڈ مووی کے ولن والا انداز اپنائے کہہ رہی تھی، جبکہ میں (بے چاری) اکیلی اس وقت ان کے ہتھے چڑھی ہوئی تھی اس لئے ان کی ہر شرط پر زسری یا پلے گروپ کے کسی معصوم سے بچے کی طرح دھڑا دھڑ اپنا پینتیس کلو کا سر کبھی دائیں بائیں تو کبھی اوپر نیچے ہلا ہلا کر قبول ہے سگنل دے رہی تھی، (حالانکہ دل ہی دل میں اس وقت انہیں کتنا کچھ سنا رہی تھی اگر وہ جان لیتیں تو......)

''اور ایک آخری شرط۔'' ان سب نے سسپنس پھیلایا تو سسپنس کے ساتھ ساتھ میری چھوٹی چھوٹی بلکہ ننھی منی اور چنی سی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

''کہ تم ہمیں دانیال کے سامنے کبھی اگنور نہیں کرو گی، منگیتر کو دوستوں پر کبھی ترجیح نہیں دو گی۔'' آخری شرط پر بھی میں نے نتھے ہوئے بیل کی طرح ''منڈی'' ہی ہلائی تو زیبی نے دھپ رسید کی۔

''بوتھی وچ زبان نہیں ہے؟'' (منہ میں زبان نہیں؟)

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔'' میں نے فی الفور فرمانبرداری دکھائی تو اگلا پراسس شروع ہوا، سارا سامان لکھوا کر طریقہ کار نوٹ کروایا گیا، تو میں نے اسے بھی کیمسٹری اور بیالوجی کی طرح رٹنا شارٹ کردیا۔

''اوئے کھوتی، اینوں رٹنا نہیں پریکٹیکلی کرنا ایں۔'' (اوئے گدھی اسے رٹنا نہیں پریکٹیکلی کرنا ہے) زیبی نے ماتھا ہی تو پیٹ لیا۔

''یہ کوئی فارمولا ہے جسے رٹ رہی ہو؟'' وہ عاجز ہوچکی تھیں اور میں بھی۔

☆☆☆

دوست ہماری ہم سے ایسے لڑتی ہے یارو جیسے میدان میں کوئی لڑاکا مرغا لڑتا ہے دانیال کو بلا لیا ہم نے لنچ پر یہی سوچ کر کہ

مل بیٹھ کر کھانے پینے سے پیار بڑھتا ہے ہمیں کیا خبر تھی کہ اسی بات پر عابدہ بیگم کو پیار آنے کی بجائے غصہ چڑھتا ہے ایک بات تو طے ہے لوگو کہ منگنی کے بعد پکانا آئے یا نہ آئے کھانا پکانا پڑتا ہے کھانا کھا چکنے کے بعد سمری کچن کے دروازے میں لہک لہک کر اپنی بھونڈی اور بے ہودہ غزل مجھ تک پہنچا رہی تھی، (پیٹ کا دوزخ جو بھر چکا تھا) باقی سب کی کمی کمی پر ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہوا تو پاس پڑا چمچ اٹھا کر کمال پھرتی سے اس کو دے مارا، سمری عین وقت پر کسی "چھلاوے" کی طرح چھلانگ لگا کر بال بال بچ گئی مگر یہ کیا؟ چمچ ابوبکر بھائی کے منہ پر اپنی باقیات چھوڑتا ہوا زمین بوس ہو چکا تھا۔

"اوئی ماں...... سوری بھائی، آئی ایم سوری، میں وہ...... مجھے...... آپ کچن میں کیوں آ رہے تھے؟" لو بھلا اب کوئی تک بنتی ان سے یہ سوال کرنے کی جو ہم نے جلدی میں ان سے کر ڈالا، بھئی گھر ان کا کچن ان کا جہاں چاہے وہ آئیں جائیں، (میں بھی ناں)

"تیرا خانہ ای خراب میرے بندے دا منہ کیوں سجان لگیاں او۔" (مطلب تمہارا خانہ خراب میرے شوہر کے منہ کا نقشہ کیوں بگاڑ رہی ہو) عاشی ابھی ابوبکر بھائی کے ساتھ کھانے کے برتن اٹھائے ہوئے تھی جھٹ برتن پٹخ کر بولی۔

"یہ میری ہیلپ کروا رہے تھے، کھانے کے جھوٹے برتن اور وہ لوازمات جو تم لوگ ڈنگروں کی طرح کھا پی کر ٹیبل پر ہی چھوڑ آئی تھیں وہ میرے ساتھ لا رہے تھے۔" وہ نجانے اور بھی کتنی سنا کر ہم لوگوں کی عقل ٹھکانے لگاتی کہ ابوبکر بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹھنڈا کیا۔

"کوئی بات نہیں عاشی کیوں غصہ کر رہی ہو اتنا Its ok۔" بڑے میٹھے لہجے میں کہہ کر وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔

"آپ بھی اب شرمندہ مت ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔" ہمارے خفت زدہ لٹکتے چہرے دیکھ کو انہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"اور اب آپ ایک اور چمچ ریڈی رکھیں کیونکہ ہو سکتا ہے دوسرا چکر میری جگہ دانیال لگائے۔" مسکراتے ہوئے وہ کہہ کر برتن سنک میں رکھ کر چلے گئے۔

"ہائے عاشی تیرا ہزبنڈ کتنا اچھا ہے اور ایک تم ہو...... ہونہہ...... تم تو ڈیزرو ہی نہیں کرتی اتنا چنگا شوہر۔" زیبی نے بے عزتی کا بدلہ تو لینا ہی تھا، (عاشی، زیبی اور انیتا تینوں اب برتن اٹھانے جا چکی تھیں، چند سیکنڈ بعد واقعی دانیال صاحب کچن کے دروازے سے اپنا منہ نکالے اندر جھانک رہے تھے۔

"ہیلو گرلز، یہ آپ کے برتن۔" ایک آدھ پلیٹ تھامے وہ جناب صاحب بھی کام میں اپنا حصہ ڈالنے کی مشقت میں مبتلا تھے۔

"ویسے کھانا بہت مزے دار تھا، ایک سے بڑھ کر ایک ڈش اور ایک سے بڑھ کر ایک ٹیسٹ، ایوری تھنگ واز دی بیسٹ (Every thing was the best)۔" میں نے برتن اس کے ہاتھ سے لئے تو وہ تعریف میں رطب اللسان ہوا یہ جانے بغیر کہ اس کوکنگ کی محنت میں میرا حصہ کتنا تھا۔

"تھینک یو، تھینک یو۔" میری جگہ سمری نے باچھیں کھلائیں۔

"ارے اصل مزہ تو آپ کو اب آئے گا جب ہماری فرینڈ خالصتاً اپنے ہاتھوں سے گول گپے تیار کرے گی۔" انیتا پتہ نہیں کیوں اتنی جلدی برتن لے کر پہنچ بھی گئی تھی۔

"جی جناب ہم تو بہت بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں ان "گول گپوں" کا جو یہ خود تیار کریں گی۔" دانیال نے ہاتھ سینے پر رکھ لیا، (بے وجہ ہی، ہونہہ)

"اچھا آپ لوگ اب یہ برتن ورتن سب چھوڑیئے اور چلیے ہمارے ساتھ ہم سب اب مل کر انجوائے کریں گے تھوڑی دیر، کوئی شطرنج، لڈو یا کچھ بھی اور کھیلتے ہیں۔" وہ ہم لوگوں سے مخاطب تھا۔

"یاہو۔" یہ نعرہ ضروری میری طرف سے ہوتا اگر صورتحال ایسی نہ ہوتی تو۔

"آپ لوگ جاؤ میں کچن میں ہی رہوں گی۔" یہ جملہ میرے ہی منہ شریف سے نکلا تھا، خود مجھے بھی یقین نہیں آیا کہ یہ میں نے کیا کہا پھر دوسروں کو کیسے آتا۔

"ہائے اللہ میں مر جاواں۔" زیبی نے کلیجہ پکڑ لیا، انیتا نے بھی دونوں کانوں کو صاف کیا، عاشی سر جھٹک جھٹک کر خود کو حقیقت تسلیم کرنے کے لائق بنا رہی تھی۔

"ہاں میں یہیں رہوں گی۔" دوسری بار بھی میرے منہ سے یہی الفاظ نکلے تو دانیال مسکرایا۔

"لگتا ہے میری فیوچر کی مسز کو کھانے پکانے سے خصوصی لگاؤ ہے، ذوق اور شوق تو بہت اچھا ہے بھئی۔" وہ خاصا امپریس نظر آنے لگا حالانکہ میری جان پہ "وکھری" ہی بنی ہوئی تھی، (یہ سب منگنی کروانے کا ہی گناہ ہے قارئین جس کی ایسی اذیت ناک سزا ہمیں بھگتنا پڑی اسی لئے آپ سے درخواست گزار ہوں کہ وہ لڑکیاں جو میری طرح کے شوق رکھتی ہوں کھانا پکانا سیکھنے سے پہلے منگنی مت کروائیں، مجھ سے نصیحت پکڑیں، کہاں میں بے چاری ایسے موقعوں یعنی انجوائے منٹ کے وقت سب سے "اگلی صفوں" میں ملتی تھی اور کہاں آج)۔

"آہ...... یا میرے اللہ عزت رکھنا میری۔" وہ لوگ مجھے کچن میں اکیلا چھوڑ کر جا چکے تھے، یعنی میدان صاف تھا، اب ہم تھے اور کچن میں اتنی دیر میں ایک بار گول گپے بنانے کی پریکٹس کر سکتی تھی، یہی سوچ کر میں نے تیاری شروع کر دی، سب سے پہلے تو دوپٹے کو سر پر لپیٹ کر دونوں اطراف سے کمر کے گرد کس کر باندھ لیا، تاکہ کسی قسم کی اریٹیشن نہ ہو، اب آنکھوں کے ساتھ ساتھ ہم نے ہر چیز یعنی ہاتھ، پاؤں، کان، ناک کو بھی ایکٹیو کر لیا، ہم کسی طور بھی ذرا سی کوتاہی کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

"سب سے پہلے چنے بوائل ہونے کے لئے رکھتی ہوں۔" میں نے چٹکی بجائی اور...... (جناب یہ نہ سمجھیں کہ چٹکی بجائی اور کسی جن بھوت نے حاضر ہو کر فٹ سے چنے ابلنے رکھ دیئے ایسا کچھ نہیں ہوا، چٹکی بجا کر بھی ہمیں چنے خود ہی رکھنے پڑے تھے) چنانچہ چنوں کو صاف کرنے اور دھونے کی مشقت اٹھائے بغیر ہم نے ڈائریکٹ ہی اوپر رکھ دیئے، (ارے بھئی اوپر شلیف پر نہیں بلکہ چولہے پر وہ بھی پریشر کوکر میں ڈال کر، اب اتنا تو ہمیں پتہ ہی تھا، آپ بھی ناں کچھ زیادہ ہی پھوہڑ سمجھ بیٹھے ہیں ہمیں)۔

"جی تو اب...... اب...... اب کیا کرنا ہے؟" ہم نے ذہن پر زور ڈالا۔

"لو جی اینویں ای کھپ رہی ہوں بھلا کاغذ پر لکھا ہوا نسخہ کب کام آئے گا؟" ہم نے اپنے سر پر چپت لگائی (لاڈ سے) اور ہنستے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے وہ کاغذ پر نوٹ کیا ہوا طریقہ محفوظ کر رکھا تھا۔

"ہائیں یہ کیا وہ کاغذ کہاں گیا؟" رائٹنگ پیڈ اور پین تو وہیں رکھے تھے مگر نسخہ ندارد۔

"یہاں دیکھ، وہاں دیکھ ادھر ڈھونڈ، ادھر ڈھونڈ، الماریاں، ٹیبل، شیلف، کیبنٹ غرض ہر جگہ ہم نے چھان مارا مگر کاغذ دکھائی نہیں دیا۔"

"اوہ خدایا اب کیا ہوگا؟" ہمارا تو سر ہی چکرانے لگا۔

"کہاں رکھا تھا ہم نے؟" سر کھجا کھجا کر ہمارے سر میں زخم بن گئے مگر یہ یاد نہ آیا کا "موا" کاغذ کہاں رکھا تھا۔

"اگر کاغذ نہ ملا تو۔" آگے ہم سے سوچا ہی نہ گیا، پھر کیا تھا ہم نے بھل بھل رونا شروع کر دیا، جی چاہا حلق کے بل چیخ کر ان سب کو یہاں اکٹھا کرلیں مگر جلد ہی ہم نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور سکون سے ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگے کہ طریقہ کیا تھا، (آخر ہم نے رٹا بھی تو لگایا تھا اس کا)۔

"تھوڑا سا میدہ لے کر اس میں تھوڑا سا زیرہ، تھوڑا سا گھی اور تھوڑا سا...... تھوڑا سا...... کیا تھا وہ۔"

"ہائے بھول گئی ناں۔" (آنسو پھر سے جاری ہو گئے)۔

"آئندہ میری ماں کو بھی توبہ اگر جو میں منگنی یا شادی کے بارے میں سوچوں وہ بھی بغیر رسوئی کا کام سیکھے۔" میں نے کان پکڑ کر اللہ اور پھر اپنی اماں سے تصور میں ہی معافی مانگی۔

"آپ ٹھیک ہی کہتی تھیں اماں کہ مجھے اب تو ضرور کچن کا سب کام سیکھنا چاہیے۔" ہم اماں کے تصور سے مخاطب تھے۔

"ارے کیوں نہ فون کر کے اماں سے ہی طریقہ پوچھ لوں، وہ بھی تو اتنے اچھے گول گپے بناتی ہیں۔" دماغ کا بلب جلا تو یکا یک ہمیں دو سو واٹ کا جھٹکا لگا (یہ جھٹکا خوشی کا تھا) لیک پھیک آنسو پونچھتے ہوئے ہم اماں کا نمبر ملانے لگے لیکن اس سے پہلے ہی ہمارے ہاتھ اور آنکھیں ایک جگہ ساکت ہو گئیں، (دھوکا نہ کھائیں قارئین)۔

"اصل میں ہمیں موبائل کے ساتھ رکھا ہوا وہ کاغذ نظر آ گیا تھا جس پر پوری ترکیب پوری ترتیب کے ساتھ لکھی ہوئی تھی۔"

"شکر ہے میرے مولا۔" فون کرنا بھول بھال کر ہم نے جھپٹ کر کاغذ اٹھایا اور اس سامان کی طرف بھاگے جو گول گپے کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

مطلوبہ سامان اوپر لکھی گئی مقدار کے مطابق لے کر ہم نے پوری دلجمعی سے مکس کرنا شروع کر دیا، پہلے تو ہم اس مکسچر میں پانی ڈالنا ہی بھول گئے، پھر جب اس خشک سے پاوڈر نما ملغوبے کو دیکھا جو پچیس منٹ مکس کرنے کے بعد بھی جوں کا توں ہی تھا تو یاد آیا کہ پانی تو ہم نے ڈالا ہی نہیں، ڈرتے ڈرتے بہت تھوڑا سا پانی ہم نے اس میں شامل کیا تو کچھ بات بنتی نظر آئی، لیکن مکسچر ابھی تک بے حد سخت تھا، اب کی بار ہم نے ذرا کھلے ہاتھ سے پانی ڈالا (بس پھر وہی ہوا جو آپ سوچ رہے ہیں) پانی کچھ زیادہ ہی کھلے ہاتھ کا پڑ گیا۔

"وہ سخت مواد اب بے حد پتلا اور ہاتھوں کے ساتھ چپکنے والا ہو چکا تھا۔"

"اب کیا کروں؟ ایسا کرتی ہوں سارا سامان اسی مکسچر میں ایک بار پھر اتنی ہی مقدار میں ڈالتی ہوں، جتنا کہ پہلی بار ڈالا تھا، اس طرح پانی بھی پورا ہو جائے گا اور کچھ خراب بھی نہیں ہوگا۔" میں نے فوراً ذہن لڑا کر حل نکالا اور پھر اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے میں تامل بھی نہیں کیا، دوسری بار اسی مقدار میں سارا سامان ڈال کر جب اس مکسچر کو تیار کیا تو ہم خود کو شاباشی دیئے بغیر نہیں رہ

سکے، آٹے کی طرح اس تمام سامان کو (جس کا مجھے نام نہیں آتا، بھئی صاف بتا رہی ہوں کہ مجھے ان چیزوں کا آج بھی نام تک یاد نہیں کہ اس میں ڈالا گیا تھا، اسی لئے تو بار بار یہاں سامان سامان لکھ رہی ہوں ورنہ ان اشیاء کے نام نہ لکھتی بھلا؟) اچھی طرح گوندھ گوندھ اور ہاتھوں سے مسل مسل کر جب ہمارے بازو بے جان ہونے لگے، تب جا کر ہم نے اس کی جان چھوڑی۔

"ہائے اوئے ربا چنے تو ہم بھول ہی گئے۔" قارئین ہم اس سامان کو تیار کرنے میں اس قدر مگن ہوئے کہ ذہن کے کونے کھدرے سے بھی نکل گیا کہ ہم نے پریشر میں چنے رکھے ہوئے تھے۔

"کھاؤں کھاؤں کھاؤں۔" (ارے یہ ہم کچھ کھانے کی بات نہیں کر رہے، بلکہ پریشر کو کر کھولتے ہی کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا، بس پر کھاؤں کھاؤں کھاؤں اسی کھانسی کی آوازیں گونج گونج کر آپ تک آ رہی ہیں قارئین کرام) پریشر سے اٹھتی ہوئی بدبو کے بھبھاکے بتا رہے تھے کہ اندر چنے نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کوئلے ہی رہ گئے تھے، سب سے پہلے ہم نے دوڑ کر کچن کا دروازہ بند کیا تاکہ جلنے کی بو کہیں لاؤنج میں بیٹھے حضرات تک نہ پہنچ جائے۔

"کھاؤں کھاؤں کھاؤں۔" بے تحاشا کھانستے ہوئے ہم نے لائیٹس آن کیں اور پھر گرتے پڑتے پریشر تک پہنچے پورے کچن میں اس وقت دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا، ہمیں لگا اگر ہم مزید دو منٹ اسی جگہ کھڑے رہے تو ضرور بہ ضرور دم گھٹنے سے اپنے اللہ میاں کو پیارے ہو جائیں گے، (ہائے ہائے میری اماں کو اتنی خوبصورت، جوان اور لائق فائق بیٹی کوئی کہاں سے لا کر دے گا پھر؟)

یہی سوچ کر ہم منہ پر دوپٹہ رکھ کر ایک ہاتھ میں پریشر پکڑے کسی پاگل سانڈ کی طرح سنک کی طرف دوڑے اور پریشر ٹونٹی کے نیچے رکھ کر فل رفتار سے پانی کھول دیا۔

"چھس چھس س س۔" کی آوازیں ابھریں اور دیکھتے ہی دیکھتے برتن پانی سے بھر گیا، ہم ابھی تک منہ کو اتنی سختی سے لپیٹے ہوئے تھے کہ سانس بھی بمشکل نکل پا رہا تھا کوئی آدھے گھنٹے بعد کمرے سے دھواں دھند اور غبار چھٹا تو ہماری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں، (اب تک ہم آنکھیں ناک، منہ اور کان سختی سے بند کیے کچن کے فرش پر گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"اوئے اندر آگ تو نہیں لگ گئی، دروازہ کھولو عابدہ، اندر سب ٹھیک تو ہے ناں؟ عابدہ کچھ بولو تو سہی، یار دروازہ کھولو۔" یقیناً دھواں لاؤنج تک میری شکایت کرنے پہنچ چکا تھا، جبھی تو ان سب نے کچن کے دروازے پر دھاوا بول دیا۔

"ارے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے اس نے، کہیں ہم سے تنگ آ کر خود پر تیل ہی نہ چھڑک لیا ہو عاشی تیرے کچن میں تیل تو نہیں تھا؟" زیبی کی متفکر آواز ابھری۔

"چپ کر خبیث۔" عاشی نے گھرکا۔

"اوئے وہ ہے بھی تو ایسی ہی ڈنگر، کوئی بھروسہ نہ کرنا اس کا۔" سمری (میری ویری دشمن) نے بھی زیبی کی تائید کی تو ابوبکر اور دانیال نے اور بھی زوروں سے دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا، اس سے پیشتر کہ وہ دروازہ توڑ دیتے میری باریک سی آواز ابھری۔

"میں ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا کچن میں،

بس ذرا چنے جل گئے۔''

''ذرا چنے جل گئے؟'' انیتا نے ذرا پر خاصا زور دیا۔

''پلیز تم دروازہ تو کھولو۔'' دانیال پریشان تھا، (میں تو ایسے کہہ رہی ہوں جیسے باقی سب تو خوشی سے شادیانے بجا رہے تھے اکیلا دانیال ہی پریشان تھا)۔

''نہیں میں دروازہ نہیں کھولوں گی، آپ لوگ جاؤ، آپ کو کھانسی آنا شروع ہو جائے گی، میں نے کہا نا میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے فرش سے اٹھ کر کپڑے جھاڑے مگر دروازہ کھولنے کی نیت ہرگز نہ تھی۔

''عابدہ دروازہ کھولو یار ہم تمہاری مدد کر دیتی ہیں۔'' انیتا کو اپنی نرم دلی کے باعث رحم آ گیا تھا۔

''نہیں مجھے اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے تم لوگ جاؤ، میں خود ہی کرلوں گی۔'' مجھے اس کی آفر سرتا پیر جھلسا گئی۔

''جب میں منتیں کر رہی تھیں تب تو شرم نہیں آئی اب کیسا احساس جاگ رہا ہے، جائیں بھاڑ میں، کچھ ایسا مشکل بھی نہیں صحیح نہ صحیح غلط ہی صحیح لیکن اب میں اکیلی خود ہی کروں گی۔'' اندر کا تکبر اور تمکنت عود کر آیا تو میری اکڑی گردن مزید اکڑ گئی۔

''یا اللہ اس میں کون سا بھوت پریت سما گیا ہے، یہ ہماری عابدہ تو نہیں لگتی۔'' زیبی نے گال پیٹ ڈالے۔

''ہائے عاشی تیرے گھر میں کوئی سایہ وایہ تو نہیں؟'' زیبی کو ایک نئی فکر لاحق ہوئی۔

''لاحول ولا قوۃ الا باللہ، کیسی واحیات باتیں کر رہی ہو۔'' عاشی نے اندر کا خوف دبا کر کہا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ڈر وہ بھی گئی تھی۔

''عابدہ پلیز یار غصہ تھوک دو، ہم سے غلطی ہوگئی ہم تمہاری ہیلپ کرتے ہیں ناں کہہ تو رہے ہیں بس دروازہ کھولو۔'' سمری بھی روہانسی ہو کر بولی۔

''دروازہ نہیں کھلے گا جب تک گول گپے تیار نہیں ہوتے، آپ لوگ بے فکر ہو جاؤ، تھوڑے سے چنے ہی جلے ہیں زیادہ نقصان نہیں ہوا، جا کر انجوائے کرو تم سب۔'' بات کے اختتام پر میرا لہجہ آپ ہی آپ تھوڑا طنزیہ ہو گیا تو لاشعوری طور پر شکل کا زاویہ بھی بگڑا (یعنی نقل اتار کر کہا)۔

''بہت ڈھیٹ ہے جو کہہ رہی ہے اب وہ ہی کرے گی، نہیں کھولے گی دروازہ چلو۔'' زیبی کی آواز مجھے صاف سنائی دی اور پھر ان سب کے قدموں کی، جب ان کے جانے کا یقین ہو گیا تو ہم نے پھر سے کمر کس لی اور قمیض کی آستین اوپر تک فولڈ کر کے میدان میں اتر آئے، پریشر میں جلے ہوئے ان ننھے منھے سے کوئلوں (چنوں) کو چھری چمچ اور کانٹے کی مدد سے کھرچ کھرچ کر اتارنے کے بعد پندرہ بیس منٹ تک پوری محنت اور قوت لگا کر رگڑ رگڑ اور کھرچ کھرچ کر صاف کیا، ہمارے خوب چٹے گورے ہاتھ اب ''کالے بمب'' ہو رہے تھے اور بازو بے دم، خیر ایک بار پھر چنے لے کر انہیں ابلنے کے لئے رکھ کر ہم نے اپنا دھیان کہیں اور بھٹکنے نہیں دیا بلکہ پوری توجہ اور لگن کے ساتھ ایک ایک منٹ گھڑی سے دیکھ کر ٹائم نوٹ کرتے رہے پورے پندرہ منٹ بعد ہم نے پریشر کو کھول چنوں کو ٹٹولا۔

ہائیں چنے تو ابھی بھی بے حد سخت ہیں، ہم نے انہی چنوں میں مزید پانی ڈال کر پھر سے پندرہ منٹ پکنے رکھا، لیکن چنے پھر سے سخت، اب کی بار ہم نے دو چمچ نمک اور تھوڑا سا بیکنگ پاؤڈر

ڈال کر پھر پریشر بند کیا اور پانی ڈالنا ہرگز نہ بھولے، اگلے پندرہ منٹ تک چنے خوب خوب گل چکے تھے، بلکہ یوں کہیے کہ ضرورت سے زیادہ ہی گل چکے تھے، کیونکہ سارے چنے پھٹ کر چھلکے الگ اور دال الگ ہو رہی تھی۔

''اف......؟'' ہم نے برا سا منہ بنایا، کاش ہم نے ان سب کی آفر قبول کر لی ہوتی، کوکنگ اتنا آسان کام بھی نہیں، اپنی ہٹ دھرمی میں ہم نے ایک اچھا موقع گنوا دیا، بہرحال ''اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' ہم نے اس مسکچر کو اتار کر ایک طرف رکھا اور خود اس آٹے یا میدے (وہ جو بھی تھا) کا تھوڑا تھوڑا پیں لے کر پیڑے کرنے شروع کر دیئے، چند منٹ بعد ہم ان پیڑوں کو بیل بیل کر چھوٹی چھوٹی سی چپاتیاں بنا رہے تھے، (گو کہ بڑی بڑی چپاتی ہم سے آج تک نہیں بن سکی تھی مگر اتنی چھوٹی روٹی بیلنا تو بے حد آسان تھا، ہماری امید ایک بار پھر جاگ اٹھی کہ اب ہم کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے، اس دوران عاشی اور ابوبکر، زیبی اور دانیال ایک ایک چکر لگا کر بند دروازے سے ہی ہماری خیر خیریت دریافت کر چکے تھے۔

''لو جی اتنے سے کام کے لئے لوگ مستری بلا لیتے ہیں بلکہ نہیں کیک منگوا لیتے ہیں ہونہہ۔'' چپاتیاں بہت اچھی بنی تھیں اسی لئے خوش ہو کر ہم نے اپنے فرضی کالر سے نادیدہ گرد جھاڑی، اگلا مرحلہ ان چپاتیوں کو گھی میں فرائی کرنے کا تھا، چنانچہ ہم نے بڑی کڑاہی میں ڈیڑھ دو کلو گھی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا، اب ہم اپنے کارنامے سے بہت مطمئن تھے، گو کہ چنے تھوڑے زیادہ گل گئے ہیں تو کیا ہوا ''گول گپے'' تو بن گئے ناں، تصور ہی تصور میں ہم دانیال کے سامنے پہنچ گئے جہاں ہم کچھ کچھ شرماتے ہوئے بلکہ بہت سارا شرماتے ہوئے اسے گول گپے پیش کر رہے تھے اور وہ کبھی ہمارے ہاتھوں کو چومتے اور کبھی ہمارے بنائے گول گپوں کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے، ہم نے کڑاہی کے سامنے کھڑے کھڑے ہی بے تحاشا لجا کر منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''ہائے اللہ دانیال کیا کہیں گے بھلا؟'' میں پھر سے سوچ میں پڑ گئی۔

''اور جب وہ میری تعریف کریں گے تو ان ''کلموہیوں'' پر کیا کیا گزرے گی، کیسے شرطیں منوا رہی تھیں مجھ سے ہونہہ، اب دیکھنا میں ان جل ککڑیوں کو اور کتنا جلاتی ہوں؟'' میں نے شیطانی خیال کے زیر اثر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مکہ مارا، کڑاہی میں گھی گرم ہو ہو کر اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور یہاں ہم تھے کہ خیالی پلاؤ پکانے میں ایسے مصروف ہوئے کہ گھی کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔

(بس قارئین کرام کہتے ہیں نا کہ بندے کو اپنی اوقات کبھی نہیں بھولنی چاہیے، بک ہاں ہم بھی یہی غلطی کر بیٹھے تھے، اوقات بھولنے والی بھئی اور کون سی)۔

خیالات کی دنیا سے ہم اس وقت باہر نکلے جب دھواں ایک بار پھر سانسیں بند کرنے لگا، پھر کیا تھا ہم نے جھٹ دو تین چپاتیاں ایک ساتھ اٹھائیں اور کھولتے ہوئے گھی میں ڈال دیں۔

''شرشرررر۔'' ایک دم کڑاہی سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہوئیں اور پھر چند دھماکوں کے بعد دھواں بڑی سرعت سے چاروں اور پھیل گیا، دھوئیں کے ساتھ ساتھ گھی بھی اچھل کر باہر آ رہا اور ہم جو بڑی ادا اور اطمینان سے چپاتیاں اس میں پھینک رہے تھے، گرم کھولتا ہوا گھی اپنے ہاتھ کی پشت پر پڑتا محسوس کر کے زوروں سے

چلائے۔

"ہائے او ربا مرگئی، اماں جی۔" گرم گھی ہاتھ کی پشت پر یوں چپکا محسوس ہو رہا تھا گویا کسی کیکڑے نے جکڑ رکھا ہو ہاتھ کو اور زوردار ڈنگ مار رہا ہو یا پھر اپنے سخت نوکیلے پنجے گاڑ دیئے ہوں، آپا دھاپی میں ہم نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا چمچ پٹخا تو وہ بھی "موا" سیدھا کڑاہی میں ہی جا کر گرا، (ایسا تاک کر نشانہ تو نہیں لگایا تھا ہم نے پھر بھی) باقی ماندہ کسر اس چمچ کے چھلکارے سے اچھل کر ہمارے پیروں پر پڑنے والے گھی نے پوری کر دی۔

"او مر گئی لوگو مر گئی، بچاؤ بچاؤ۔" ایک طوفان تھا جو کچن میں مچ چکا تھا، ہم نے تھے بیل کی طرح ادھر سے ادھر چکریاں کاٹتے اور شور مچاتے رہے ذہن اتنا بھی کام نہیں کر رہا تھا کہ باہر جو بے چارے پانچ چھ نفوس ہماری دہائیاں اور آہ و بکا سن کر گھنٹے بھر سے دروازہ کوٹ پیٹ رہے ہیں وہ بند دروازے سے اندر تھوڑی آسکتے ہیں، دروازہ کھلے گا تو ہی وہ کچھ کر سکیں گے ناں چھت سر پر اٹھانے بلکہ جناب آسمان سر پر اٹھا اٹھا کر بھی جب ہمارا کچھ نہ بنا تو بالآخر ہمیں دروازہ کھولنے کا خیال آ ہی گیا۔

"ہائے میں مر جاواں اے کی ہو گیا (ہائے میں مر جاؤں یہ کیا ہو گیا)۔" عاشی نے چھوٹتے ہی ایک نظر میرا جائزہ لینے کے بعد کڑاہی کے نیچے جلتے چولہے کو بند کیا، جس میں سے ابھی بھی وقتاً فوقتاً "چٹاخ پٹاخ" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اگر چند منٹ مزید وہ چولہا بند نہ کرتی تو کڑاہی میں ضرور آگ لگ جاتی اور پھر شاید صرف کڑاہی نہیں پورا کچن کے ساتھ ہم بھی جل کر خاک ہو چکے ہوتے، (جنہیں جلانے کا ہم سوچ رہے تھے وہی ہمیں بچا رہے تھے وہ اپنی دوستی نبھا رہے تھے اور ہم اپنی غلط سوچ کی سزا پا رہے تھے) آگے کیا ہوا اور کس نے کیا کیا؟ ہمیں کچھ خبر نہیں قارئین۔

☆☆☆

"ہمیں معاف کر دو عابدہ ہم سب نے تمہارے ساتھ غلط کیا یہ پلان تو سارا عاشی کا تھا مگر اس نے آنٹی (یعنی تمہاری ماما کی شکایت پر یہ سب کیا تھا، چند دن پہلے تمہاری ماما کی کال آئی تو انہوں نے ہم سے تمہاری شکایت کی کہ تم گھر کا یا کھانے پکانے کا کوئی سلیقہ سیکھنے پر آمادہ ہی نہیں تو عاشی نے یہ بیڑا اپنے سر اٹھایا کہ ہم تمہیں ایسا سبق سکھائیں گے کہ تم گھر داری سیکھ لو، بس پھر ہم نے اس پلان میں دانیال اور ابوبکر بھائی کو بھی شامل کر لیا۔" سمری ٹپاٹپ آنسو گراتے ہوئے مجھ پر انکشاف کر رہی تھی، وہ سب اس وقت میرے بیڈ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے، میرے ہاتھوں اور پیروں پر مرہم لگا کر ڈاکٹر جا چکا تھا۔

"یعنی تم سب مجھے بدھو بنا رہے تھے؟" میں نے بے یقینی اور تاسف کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

"نہیں میری جان بدھو نہیں ہم تو تمہیں کک بنا رہے تھے، شیف کوکنگ ماسٹر۔" زیبی نے پہلے مجھے گلے لگایا پھر کراٹے ماسٹر کا سٹائل بنا کر "شیف کوکنگ ماسٹر" کہا تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تم لوگوں کی مجھ پر ذرا ترس نہیں آیا۔" میں نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کر مسکین سی صورت بنائی۔

"اجی ان کو تو بہت ترس آ رہا تھا آپ پر جانتی ہیں کتنی ہی بار یہ کچن کے چکر لگا چکی تھیں تاکہ آپ کی ہیلپ کر سکیں، لیکن ہم نے ہی ہر بار انہیں منع کر دیا۔" جواب ان کی بجائے دانیال کی

طرف سے آیا، تو ہم نے گردن موڑ کر بائیں جانب بیٹھی اس ہستی کی خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"سوری لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ تو کھونا پڑتا ہے ناں، یہی سوچ کر ہم نے آپ کی اصلاح اور بہتری کی خاطر ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔"

"ہونہہ یہ خاک بہتری تھی ہماری، آپ اگر ویسے بھی ہمیں کھانا پکانے سیکھنے کا کہتے تو ہم کر ہی لیتے شاید ہم ابھی تک منہ پھلائے ہوئے تھے (گول گپے تو پھولے نہیں منہ ضرور پھول چکا تھا)۔"

"او کے او کے، رئیلی ویری ویری سوری، لو ہاتھ جوڑے، لو کان پکڑے، اب تو کر دو معاف ہمیں۔" وہ لوگ کورس میں بولتے ہوئے واقعی کان پکڑ کر ہاتھ جوڑ رہے تھے، ہمیں ہنسی آ گئی، مگر بظاہر منہ میں ہوا یونہی بھری ہوئی تھی، جیسے غبارے میں۔

"آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی، ہماری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑتی، سوری۔" وہ سچ مچ سنجیدہ تھے، ہمیں احساس ہوا تو فوراً اپنی غلطی بھی تسلیم کی۔

"غلطی تو میری بھی ہے کہ ماما کے اتنی بار سمجھانے پر بھی ہمیں عقل نہیں آئی، اگر ایسا نہ کرتے آپ لوگ تو شاید واقعی ہم کبھی کچھ نہ ہی سیکھتے، جانتے ہیں اس دوران ہم نے کتنی بار سچے من سے توبہ کی ہے؟ اب ہمیں یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ گھر کا کام سیکھے بغیر عورت کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتی، خواہ وہ باقی سب میدان کیوں نہ مار لے، جب تک اپنے گھر اور گھر والوں کے کام کی نہیں تو وہ کسی کام کی نہیں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہاں سے گھر جاتے ہی ماما کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی حصہ لیں گے، لگایا، (ہر ہر رراہ)

☆☆☆

تو یہ تھی ہماری آپ بیتی اور کارگزاری بس قارئین کرام اب آپ سے یہی گزارش ہے کہ آپ بھی میری طرح "سیانے" ہو جائیں، ورنہ آپ کو بھی کوئی ایسے ہی سبق سکھائے گا، عقلمند وہی ہے جو دوسروں کی غلطیوں سے ہی سبق سیکھ لے اور امید کرتی ہوں کہ آپ کافی عقل مند ہوں گے، اب اجازت دیجئے اللہ حافظ۔

ایکسکیوزمی قارئین ہم نے قلم عابدہ سے لے لیا تھا، ہم کون؟ بھئی ہم زیبی ہیں، تو جناب اس نے ہماری شکایتیں تو مرچ مسالے کے ساتھ "رچ رچ" کے لگائی ہیں آپ کو لیکن یہ نہیں بتایا کہ پھر ہم نے اسے منایا کیسے؟ اسے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا تھا مگر "بوتھا شریف" پھر بھی سوجا ہی رہا ہم سے جب تک ہم نے اسے "باربی کیو، چپس اور پاپ کارن نہیں بنا کر کھلائے تب تک سوجن نہیں اتری، ادھر دانیال بیچارہ خود گول گپے تو نہ کھا سکا مگر اسے منانے کو اس نے گول گپے بنا کر اسے کھلائے اور پھر ہاسٹل میں بھی جب تک اس کا ہاتھ اور پاؤں پوری طرح صحیح سلامت نہیں ہوئے ہم چاروں اس کے بے دام غلام بنے سیوا کرتے رہے ابوبکر اور دانیال پورا ہفتہ اس کی تیمار داری کو آتے اور کیکے لاتے رہے، اس کی غلط فہمی اور بدگمانی تو دور ہو گئی ہے اور اس نے مان لیا کہ ہم اس کے دشمن نما دوست نہیں بلکہ جگری دوست ہیں، جو ہر حال میں دوست کا بھلا چاہتے ہیں، تو بس اب آپ خدارا ہم سے بدگمان مت ہو جانا کہیں آپ کو منانے کے لئے ہمیں پھر سے گول گپے بنانے نہ پڑ جائیں، ویسے آپس کی بات ہے، گول گپوں کو گول گپا بنانا بھی ایک مشکل کام ہے، جو ہر کسی کے بس کا نہیں۔ ☆☆☆

کہیں بن جائے تنہائی

روبینہ سعید

ہانیہ کے کھڑکی کھولتے ہی خوشگوار ہوا کا جھونکا اندر آیا، اس نے تازہ ہوا میں گہری سانس لی، رات بھر کی بارش کے بعد اب مطلع صاف ہو چکا تھا، اس نے آسمان پر نظر دوڑائی آوارہ بدلیاں آسمان پر بھاگتی پھر رہی تھیں، پرندے ہوا میں اڑ رہے تھے، سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا، اردگرد کا منظر بے حد بھلا تھا، ہر شے دھلی دھلی نکھری نکھری لگ رہی تھی، ہانیہ نے اپنی بکھری چیزیں سمیٹنی شروع کیں، بیڈ کی چادر درست کر کے تکیے ترتیب سے لگائے، رائٹنگ ٹیبل پر ان کتابوں کو ترتیب سے رکھا جن کا مطالعہ وہ ساری رات سے کرتی تھی، بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اسے وہ اخبار بھی نظر آ گیا جس پر اس نے ملازمت کے اشتہار پر نشان لگایا تھا، انٹرویو آج دس بجے تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اسے ملازمت کر لینی چاہیے کیونکہ اس کے پاپا وقار احمد بائی پاس کروانے کے بعد ابھی تک سنبھل نہیں پائے تھے، پاپا پہلے ہی مما کے علاج میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکے تھے، مگر تمام تر علاج معالجے کے بعد بھی ذکیہ کی زندگی نے وفا نہیں کی اور دو سال پہلے کینسر کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئی تھیں، انہیں بلڈ کینسر تھا، وقار احمد نے ہر ممکن کوشش کی اس بیماری سے لڑنے کی مگر بیماری تو کیا جاتی الٹا وہ معاشی طور پر بدحال ہوتے چلے گئے، ان کی ساری توجہ اپنی اہلیہ کے علاج پر تھی اور ان کے کاروبار پر ان کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ان کا پارٹنر قابض ہو گیا، وقار احمد اس صدمے کو قبول نہ کر سکے اور انہیں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا، اب ہانیہ چاہتی تھی کہ وہ کوئی ملازمت کر لے تاکہ وقتی طور پر پریشانیاں تھوڑی کم ہو جائیں، وہ میڈیکل کے فورتھ ائیر کی طالبہ تھی اس کا ایم بی بی ایس مکمل ہونے میں ایک سال باقی

مکمل ناول
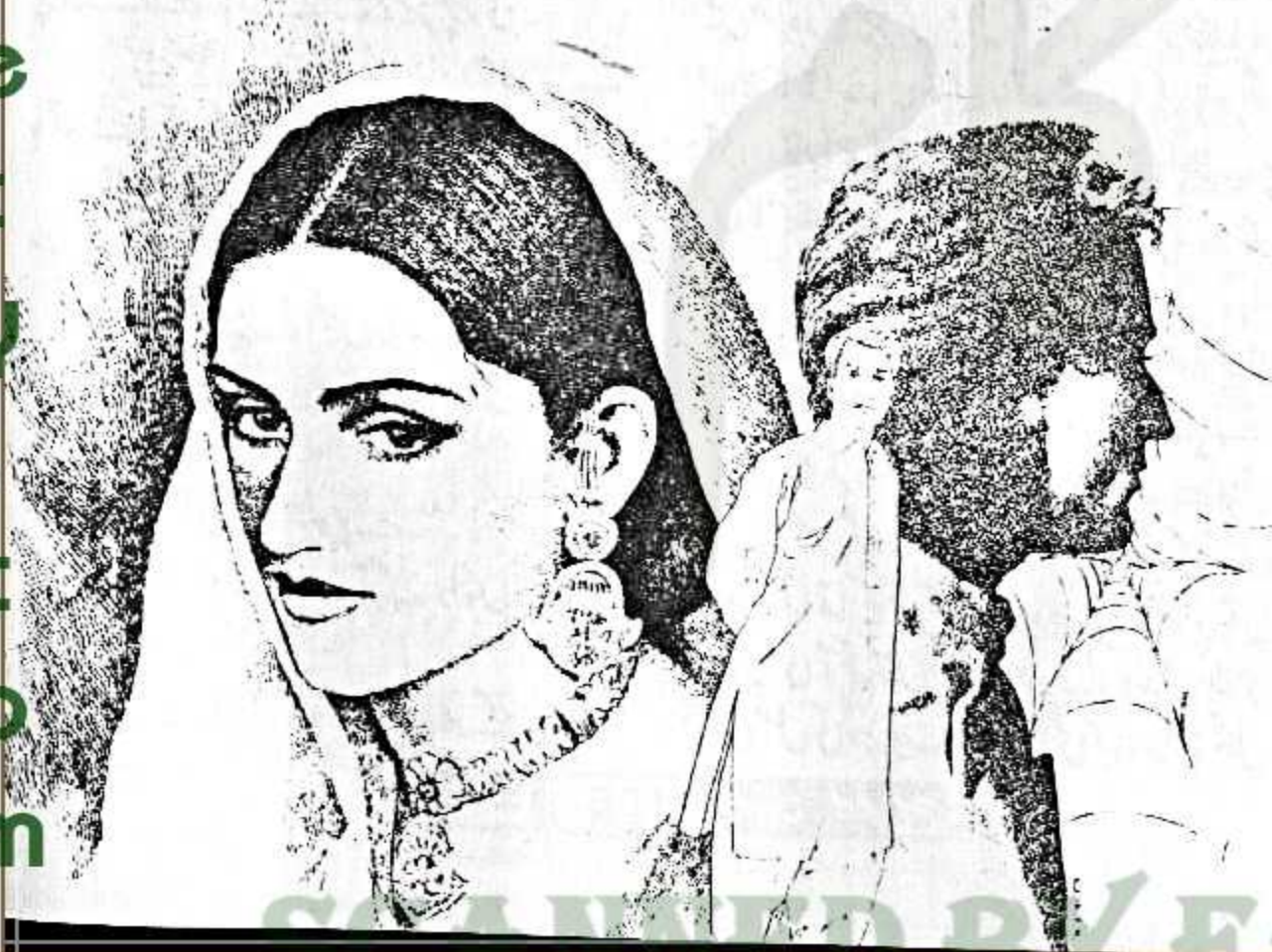
تھا، پھر ایک سال اس نے ہاؤس جاب کرنی تھی، مگر اب جو گھر کے حالات تھے وہ اسے اکسا رہے تھے کہ وہ گھر سے قدم باہر نکالے، رات کو اخبار دیکھتے ہوئے اس کی نظر اس اشتہار پر پڑ گئی، وقتی طور پر وہ اسے پرکشش لگا، ملازمت جزوقتی تھی، چار گھنٹے روزانہ کی ڈیوٹی تھی، اس کے پیپرز میں ایک مہینہ رہ گیا تھا، چار گھنٹے کام کر کے وہ اچھی طرح سے پیپروں کی تیاری کر سکتی تھی، وقار احمد کے پارٹنر نے کاروبار میں سے بہت تھوڑا سا پیسہ ہر مہینے گھر کے اخراجات کے لئے دینے کا وعدہ کیا تھا، ان پیسوں سے گھر کا خرچہ بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا، اسی لئے ہانیہ نے ملازمت کا فیصلہ کیا، کبھی کبھی ہانیہ سوچتی کہ اس نے میڈیکل کی لائن کیوں چن لی، اتنی لمبی اور صبر آزما انتظار، اگر اس نے سادہ بی اے ہی کیا ہوتا تو آج اسے آسانی سے ملازمت مل جاتی، مگر یہ وقار احمد کی خواہش تھی کہ ہانیہ ان کی اکلوتی بیٹی ڈاکٹر بنے، ہانیہ نے کپڑے نکال کر پریس کیے اور ناشتہ تیار کرنے کچن میں چلی گئی، ہانیہ ناشتہ بنا کر ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو وقار احمد وہیں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، ہانیہ نے ٹرے میز پر رکھی۔

''چلیے پاپا۔'' اس نے اخبار وقار احمد کے ہاتھ سے اچک کر ایک طرف رکھا۔

''ناشتہ تیار ہے۔'' وقار احمد ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''پاپا!'' ہانیہ نے انہیں مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' انہوں نے چائے کا مگ اٹھا کر منہ سے لگایا۔

''پاپا! آج میرا انٹرویو ہے۔''

''کیا؟'' وقار احمد نے مگ واپس ٹیبل پر رکھا۔

''مگر کیوں بیٹا؟'' وہ پریشان ہوگئے۔

''ایک ماہ بعد تمہارے ایگزامز ہیں اور ضرورت کیا ہے ملازمت کی؟''

''پاپا صرف چار گھنٹے کی جاب ہے اور جزوقتی ہے، میں نے سوچا کر لو اور پیپروں کی آپ فکر نہ کریں، یوں دوں گی پیپر۔'' اس نے انہیں چٹکی بجا کر دکھائی۔

''مگر بیٹا...... گھر کے حالات ابھی اتنے بھی خراب نہیں ہوئے کہ تم ملازت کرنے نکل جاؤ اور پھر کام کرو گی تو پڑھو گی کب؟'' وہ بری طرح پریشان ہو چکے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہانیہ کا میڈیکل ادھورا رہ جائے۔

''اللہ نہ کرے۔'' انہوں نے خود کو تسلی دی، ہانیہ نے انہیں قائل کر ہی لیا تھا، وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی تھی، سفید کلف والی شلوار کے ساتھ فیروزی قمیض جس پر سفید کڑھائی تھی سفید کاٹن کے دوپٹے کے چاروں طرف فیروزی لیس میں وہ بہت دیدہ زیب لگ رہی تھی، پاؤں میں سفید سینڈل پہن کر اس نے اسٹریپ بند کیے، کلائی پر گھڑی باندھی اور کانوں میں ہم رنگ آویزے پہن کر وہ تیار تھی، اس نے ہینڈ بیگ میں ضروری چیزیں ڈال کر کندھے پر لٹکایا اور اپنے کاغذات کی فائل ہاتھ میں دبا کر باہر نکل آئی، وقار احمد کو خدا حافظ کہہ کر وہ بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

جہانزیب آج بہت لیٹ ہو گیا تھا، آنکھ ہی دیر سے کھلی گھڑی دیکھی تو پونے نو بج رہے تھے، چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور چھپاک سے واش روم میں گھس گیا، آج ہی تایا ابو نے جلدی آفس آنے کو کہا تھا کیونکہ آج آنٹرویو لینے تھے اور آج ہی اس کی آنکھ نہیں کھلی، اس نے جلدی جلدی تیاری مکمل کی، بریف کیس ریڈی کیا، سائیڈ ٹیبل

سے موبائل والٹ اور کار کی چابی اٹھائی اور باہر آ گیا اس کے پیچھے اس کی امی فرحت ناشتے کے لئے پکارتی رہ گئیں مگر وہ انہیں ٹالتا ہوا کار میں آ بیٹھا، ایک بار پھر گھڑی دیکھی گھڑی کی سوئیاں گویا بھاگ رہی تھیں، نو بج کر پچیس منٹ ہو چکے تھے اس نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ سے نکال کر باہر لے آیا، گاڑی سڑک پر ڈال کر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی، رات ہونے والی بارش کی وجہ سے سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا دکھائی دے رہا تھا، انٹرویو دس بجے شروع ہونا تھا اور اس کے تایا منصور احمد نے لینا تھا مگر انہیں اچانک اسلام آباد جانا پڑ گیا تو وہ انٹرویو کی ذمہ داری جہانزیب کو سونپ گئے، اب وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا گویا اڑا جا رہا تھا، آگے سڑک ٹوٹی ہوئی تھی جا بجا گڑھے بنے ہوئے تھے اور ان میں پانی بھرا ہوا تھا، ایک جگہ جو گاڑی گڑھوں پر سے گزری تو بارش کا پانی دونوں طرف اچھل کر سڑک پہ کھڑے لوگوں کو بھگو گیا، ان میں ایک لڑکی پر اس کی نظر پڑی، لڑکی کے سفید کپڑے کیچڑ کی وجہ سے تجریدی آرٹ کا نمونہ پیش کر رہے تھے، اس نے فوراً گاڑی روکی اور خود باہر نکل آیا، لڑکی اپنی فائل کو دوپٹے سے صاف کر رہی تھی، جہانزیب نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ تو سوچ رہا تھا کہ لڑکی غصے سے لال پیلی ہو جائے گی، مگر یہ تو اپنی فائل ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ کھڑی تھی، وہ آگے بڑھا۔

''آئی ایم سوری میم...... دراصل میں بہت جلدی میں تھا میں نے دیکھا نہیں، آپ نے کہاں جانا ہے آیئے میں ڈراپ کر دوں۔'' اس نے معذرت کرتے ہوئے پیشکش کی۔

''کوئی بات نہیں۔'' لڑکی دھیمی آواز میں بولی۔

''میں نے جہاں جانا تھا اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' جہانزیب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے انٹرویو کے لئے جانا تھا مگر اب، اس حلیے میں تو نہیں جا سکتی۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''لگتا ہے ملازمت ابھی میرے نصیب میں نہیں ہے۔'' جہانزیب کو بہت دکھ ہوا یہ جان کر وہ ایک ضرورت مند لڑکی ہے اور اس کی وجہ سے اس کا انٹرویو برباد ہو گیا۔

''اچھا آپ ایسا کریں کہ اپنی فائل مجھے دے دیں۔'' وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

''کیوں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیونکہ میں بھی ایک انٹرویو کے سلسلے میں جا رہا ہوں شاید آپ کا بھی کام بن جائے۔'' اس نے فائل لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''مگر۔'' لڑکی ہچکچائی۔

''میں جہاں جا رہی تھی وہ چار گھنٹے کی جاب تھی اس نے زیادہ میں ٹائم نہیں دے سکتی، لہٰذا فائل رہنے دیں۔'' لڑکی اب صدمے سے نکل چکی تھی۔

''آپ انٹرویو کے لئے کہاں جا رہی تھیں۔'' لڑکی کی زبان سے چار گھنٹے کی ملازمت کا سن کر وہ چونکا تھا، لڑکی نے اسی کے دفتر کا پتہ دہرایا۔

''میں بھی وہاں ہی جا رہا ہوں، آپ ایسا کریں میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔'' وہ فوراً گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا، اسے کہیں اندر اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس لڑکی کے لئے کچھ کر سکتا تھا، شاید اسے ملازمت کی اشد ضرورت ہے، ہانیہ اس آفر پر ٹپٹا گئی۔

''مگر میرے کپڑے؟'' اس نے اپنے

کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔
''کوئی بات نہیں؟'' وہ مسکرایا۔
''اب ان کپڑوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''
''مگر سر!'' ہانیہ ہچکچائی۔
''آپ طے کر لیں کہ آپ کو ملازمت چاہیے یا نہیں۔'' اس نے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں چاہیے تو ہے مگر......'' ہانیہ حیران سے لہجے میں بولی۔
''اگر ملازمت چاہیے تو اگر مگر بھول جائیں اور گاڑی میں بیٹھیں۔'' اس نے کار کا دوسرا دروازہ کھولا، ہانیہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ بیٹھے یا نہیں، مگر وہ میڈیکل کی سٹوڈنٹ تھی، کو ایجوکیشن میں پڑھتی تھی لہٰذا اس میں اعتماد بہت تھا لہٰذا ایک لحہ سوچ کر بیٹھ گئی اور اس کے بیٹھتے ہی جہانزیب نے گاڑی بھگا دی۔

☆☆☆

فیصل جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہوا اور آفس کی تیاری کرنے لگا، اس نے آج جہانزیب کے ساتھ مل کر منصور ماموں کے آفس کی خالی پوسٹ کے لئے انٹرویو کرنے تھے، جہانزیب نے اسے دس بجے آفس پہنچنے کی تاکید کی تھی کیونکہ دو بجے ان دونوں نے ایک میٹنگ میں شرکت کرنی تھی اس لئے ان کا پروگرام تھا کہ انٹرویو ساڑھے بارہ بجے تک مکمل کر لئے جائیں تاکہ میٹنگ میں شریک ہونے سے پہلے میٹنگ کا ایجنڈا ابھی زیر غور آ جائے، فیصل نے بریف کیس کھول کر حسب عادت چیک کیا، اس کی مطلوبہ ہر چیز بریف کیس میں موجود تھی، والٹ، گھڑی، موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ اب جانے کے لئے تیار تھا کہ کمرے کا دروازہ کھول کر اس کی بیوی یشفاء اپنی ننھی بیٹی زینب کو اٹھائے اندر داخل ہوئی، زینب سے بڑے عمر نے اس کی انگلی تھام رکھی تھی، فیصل نے زینب کو گود میں لے لیا اور اس کو پیار کرتے ہوئے بولا۔
''مہران کو فون کر کے بلا لینا آج زینب کو انجکشن لگنا ہے۔'' اس نے پیار کر کے زینب کو واپس یشفاء کے حوالے کیا، عمر مچل رہا تھا کہ اسے بھی ساتھ لے کر جائے، وہ اسے گود میں اٹھا کر پورچ تک آیا، یشفاء کے ہاتھ میں بریف کیس تھا، بریف کیس اس نے کار کا دروازہ کھول کر دوسری سیٹ پر رکھا اور عمر کو یشفاء کے حوالے کرنا چاہا مگر عمر رونے لگا، اس کے رونے سے فیصل پریشان ہو چکا تھا تب ہی مہران اپنی بائیک سنبھالتے ہوئے آ گیا، اس نے فیصل سے عمر کو لے لیا اور اسے بائیک پر بٹھا لیا۔
''چلو شہزادے کیا یاد کرو گے ہم بھی گھومنے چلتے ہیں۔'' اس نے عمر سے کہا عمر کا رونا یکدم ختم ہو گیا، فیصل نے سکون کا سانس لیا، مہران نے اسے اشارہ کیا، فیصل نے جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی گھر سے باہر نکال لایا۔
''کیا بھابھی آپ سے بچے نہیں سنبھلتے۔'' مہران نے یشفاء کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔
''ہاں بچے سنبھالنے کے لئے ان کا چاچو ہے نا۔'' یشفاء نے جواب دیا۔
''کیا مطلب؟ چاچو ہے یا کوئی آیا۔'' اس نے مصنوعی غصے سے کہا اور بائیک کو کک لگا کر اسٹارٹ کیا۔
''اب کہاں؟'' یشفاء نے پوچھا۔
''انہیں ایک چکر لگوا کر لاتا ہوں۔'' اس نے بائیک پر بیٹھے عمر کی طرف اشارہ کیا۔
''ورنہ ابھی لاوڈ اسپیکر اسٹارٹ ہو جائے گا۔''

''کبھی میری گڑیا کو بھی لے جایا کرو۔'' یشفاء نے گود میں زینب کی طرف اشارہ کیا جو عمر کے ساتھ بائیک پر بیٹھنے کو بے تاب ہو رہی تھی۔
''ارے بھابھی ابھی ایک کو تو بھگت لوں پھر گڑیا کو بھی چکر کروا لوں گا۔'' اس نے زینب کے گال پر پیار کیا اور زن سے بائیک نکال کر لے گیا۔
اب زینب کا رونا شروع ہو چکا تھا، یشفاء اسے سنبھالتی چپ کرواتی اندر چل دی، جہاں ڈائننگ ٹیبل پر نصرت اپنی دونوں بیٹیوں نازو اور کرن کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی، زینب کو روتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یشفاء کو ناشتہ کرنے کا کہہ کر زینب کو بہلانے لگی۔
زینب کا رونا اسی وقت بند ہوتا تھا جب مہران اسے بھی بائیک پر چکر لگوا کر لاتا، یہ روز کا معمول تھا۔

☆☆☆

جہانزیب آفس میں داخل ہوا تو ہانیہ بھی اس کے ساتھ تھی، آفس میں موجود عملہ اٹھ اٹھ کر جہانزیب کو گڈ مارننگ کہنے لگا وہ جس ٹیبل کے آگے سے گزرتا وہاں کا موجود عملہ کھڑے ہو کر اسے گڈ مارننگ کہتا، ہانیہ کافی شرمندہ تھی اپنے حلیے کی وجہ سے مگر جہانزیب کو جیسے اس بات کی فکر ہی نہیں تھی، اس نے ہانیہ کو مس شائستہ کے پاس بٹھایا اور اس کی فائل لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، دروازہ کھولا تو حسب توقع فیصل موجود تھا، فیصل نے جہانزیب کو ایک نظر دیکھا اور دوسری نظر کلاک پر ڈالی جہاں سوا دس کا ٹائم ہونے والا تھا۔
''سوری فیصل بھائی۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''دراصل تھوڑا مسئلہ ہو گیا تھا، بہر حال پہلے آپ ذرا یہ فائل دیکھیں۔'' اس نے ہاتھ میں موجود فائل فیصل کے آگے رکھی۔
''کس کی ہے؟'' فیصل نے فائل کھولتے ہوئے پوچھا تو جہانزیب نے مختصر الفاظ میں آج کا واقعہ سنایا، فائل میں لگی شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی فیصل نے سرسری نظر ڈالی تو چونک اٹھا۔
''جہانزیب!'' وہ بے اختیار پکارا، جہانزیب نے اس کے لہجے میں کچھ انجانی بات محسوس کی۔
''ہاں بھائی کیا ہوا؟''
''یار! یہ دیکھ۔'' اس نے فائل جہانزیب کے آگے کی۔
''یہ دیکھ اس لڑکی کے والد کے شناختی کارڈ کے مستقل پتے کے خانے میں اپنی حویلی کا پتہ لکھا ہے۔''
''کیا......مگر؟'' جہانزیب حیران تھا۔
''اس کا نام کیا ہے؟'' فیصل نے پوچھا، جہانزیب نے نام پڑھا ''فیصل بھائی اس کا نام ہانیہ وقار احمد ہے۔''
''وقار احمد۔'' فیصل بڑبڑایا۔
''یار یہ کہیں وقار ماموں تو نہیں ہیں؟'' فیصل بول پڑا۔
''وقار چچا کی بیٹی۔'' جہانزیب پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔
''مگر یار اگر یہ وقار چچا کی بیٹی ہے تو اسے اس معمولی ملازمت کی کیا ضرورت پڑ گئی، تو ایسا کر اسے سب سے پہلے بلا لے، مگر اسے ہرگز یہ نہیں بتانا کہ ہم اسے پہچان چکے ہیں۔'' فیصل نے تاکید کی، جہانزیب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مس شائستہ کو ہانیہ کو اندر بھجوانے کو کہا، اتنی دیر میں اس نے سرسری فائل پر نظر ڈالی، ہانیہ اندر آئی تو فیصل

کی نظر سب سے پہلے اس کے خراب کپڑوں پر پڑی۔

''جی مس ہانیہ وقار احمد، یہی نام ہے آپ کا؟'' اس نے فائل اپنے آگے سرکالی۔

''یس سر!'' ہانیہ بولی۔

''جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں آپ کیونکہ آپ کی فائل کے مطابق آپ میڈیکل کے سیکنڈ لاسٹ ائیر میں ہیں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی ٹف پڑھائی کے ساتھ آپ جاب کیسے کر پائیں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''سر! یہ درست ہے کہ میں میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہوں مگر سر کالج کی پڑھائی اس سال کے لئے مکمل ہے، تقریباً ایک مہینے کے بعد پیپر شروع ہو جائیں گے اس کے تقریباً چار ماہ بعد میرے آخری سال کے داخلے کے اخراجات کے لئے میں یہ جاب کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''سر! وہ بزنس کرتے تھے۔''

''تھے سے کیا مراد، کیا اب نہیں کرتے؟'' فیصل بے چین تھا کہ سارا احوال ایک دم پتہ چل جائے۔

''نو سر! اب وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں ان کے دل کا پچھلے دنوں بائی پاس ہوا ہے، ان کے دل کے دو والو بند تھے، تب سے وہ کام نہیں کر سکتے ویسے بھی......'' ہانیہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا ویسے بھی......'' جہانزیب بے چین ہوا۔

''سر! مجھے پتہ نہیں بتانا چاہیے یا نہیں۔'' ہانیہ تذبذب کا شکار تھی۔

''نہیں نہیں مس ہانیہ آپ بھروسہ کر کے سب کچھ بتا سکتی ہیں آپ سمجھیں آپ کا بڑا بھائی آپ کے سامنے بیٹھا ہے؟'' فیصل بے قرار ہو گیا تھا یہ جان کر کہ وقار احمد کا بائی پاس ہوا ہے۔

''بڑا بھائی؟'' ہانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، شاندار شخصیت کا مالک سوٹ میں ملبوس، بال ترتیب سے جمے ہوئے، نازک سے فریم کی عینک جمائے وہ اسے انتہائی شفقت سے دیکھ رہا تھا، ہانیہ کا دل چاہا کہ سارا حال اسے بتا دے اور اس نے رک رک کر ماں کی بیماری پھر موت اور وقار احمد کے پارٹنر کا دھوکے سے بزنس پر قبضہ جما لینے کے بارے میں گھر کے اخراجات غرض سب کچھ بتاتی چلی گئی، فیصل بہت دکھی ہو چکا تھا یہ سب جان کر، وہ ہانیہ کی ہمت پر حیران تھا۔

''دیکھئے مس ہانیہ! ہم دراصل اس پوسٹ کے لئے ایک ذمہ دار اور بھروسے کے قابل خاتون تعینات کرنا چاہتے تھے اور آپ سے مل کر پتہ چلا کہ آپ ایک انتہائی ذمہ دار اور حوصلہ مند لڑکی ہیں تو اس پوسٹ کے لئے آپ سے بڑھ کر مستحق کوئی نہیں ہو سکتا، ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ آپ میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہوتے ہوئے جاب کرنا چاہتی ہیں، ہم آپ کے حوصلے کی داد دیتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ جب آپ کے داخلے کا ٹائم آئے گا تو کمپنی آپ کو لون بھی دے گی، ابھی تنخواہ آپ کو تھوڑی کم لگے گی مگر آپ کی کارکردگی دیکھتے ہوئے اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے، امید ہے کہ آپ ہماری کمپنی میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔'' فیصل نے مسکراتے ہوئے اسے تفصیلات بتائیں۔

''سر! کیا میں سلیکٹ ہو گئی؟'' ہانیہ حیران تھی۔

''جی ہاں۔'' جہانزیب نے انٹر کام اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مس شائستہ ایک اپائمنٹ لیٹر ٹائپ کروائیے مس ہانیہ کے نام اور ان کو ان کا کام سمجھا دیں مس ہانیہ کل سے ڈیوٹی سنبھالیں گی۔'' فیصل سوچ میں گم تھا، اچانک اسے کچھ خیال آیا۔

''جہانزیب! مس ہانیہ کو ایڈوانس دو ماہ کی سیلری بھی آج ہی مل جانی چاہیے۔''

''جی بھائی۔'' اس نے دوبارہ انٹر کام پر ہدایت جاری کی، ہانیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے یہ سب کیا تھا، کیا اللہ کی مہربانی، یقیناً وہ مطمئن ہو گئی، جبکہ فیصل اس کے جانے کے بعد ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

☆☆☆

سردار احمد یار خان اپنے علاقے کے بہت بڑے جاگیر دار تھے، حد نظر تک پھیلی ہوئی وسیع و عریض زمینوں کے مالک تھے، پورے علاقے میں ان کا رعب و دبدبہ تھا، سارا علاقہ سردار صاحب کا دم بھرتا تھا، آمدنی بے شمار تھی، سرسبز و شاداب پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور لہلہاتی فصلیں ان کی خوشحالی کا ثبوت تھیں، اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے رحم دل اور شفیق تھے، کسی کی جرأت نہیں تھی ان کے علاقے میں کوئی غلط کام کرنے کی، مجبور اور بے کس لوگوں کا سہارا تھے تو بے ایمان اور بے ضمیروں کے لئے آہنی ہاتھ تھے، گھر میں اپنے بچوں کے لئے مہربان اور مشفق ہونے کے ساتھ ساتھ ان پر کڑی نظر رکھتے تھے، اسی لئے بچے ان سے ڈرتے تھے اور اپنی بات زیادہ تر اپنی والدہ جنہیں اماں بی کہا جاتا تھا ان کے ذریعے کہلاتے تھے، ان کے پانچ بچے تھے، تین بیٹے اور دو بیٹیاں، بڑے بیٹے محمود احمد پھر بیٹی نصرت، ان سے چھوٹے منصور احمد، چوتھے نمبر پر فرحت تھی اور آخری نمبر وقار احمد کا تھا۔

گھر میں ہر بڑے چھوٹے فیصلے کا اختیار بابا سائیں کے پاس تھا، کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، بڑے بیٹے منصور احمد کی شادی انہوں نے اپنی بھانجی منزہ سے کی، منصور احمد اور منزہ کی تین اولادیں ہوئیں سعد، اسجد اور نوشی، نصرت کی شادی انہوں نے اپنے بھتیجے داؤد سے کی، ان کے چار بچے فیصل مہران، نازو اور کرن تھے، تیسرے نمبر کے محمود احمد کی شادی اماں بی کی بھانجی طاہرہ سے ہوئی اور ان دونوں کے تین بچے تھے جہانزیب، شاہ زیب اور مومنہ، فرحت کی شادی ان کے بھانجے اشفاق سے ہوئی ان کے بھی تین بچے تھے، ولید، سلمٰی اور یشفاء سب اولادوں کی شادیاں بابا سائیں نے اپنی مرضی سے کیں اور اب اس انتظار میں تھے کہ وقار احمد جو اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے تھے، وہ واپس آئیں تو ان کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں، وقار احمد کے لئے انہوں نے رشتہ پسند کر لیا تھا، ان کے چھوٹے بھائی اسفند یار خان کی ایک ہی بیٹی تھی، بابا سائیں نے ان کے گھر جا کر تاریخ بھی طے کر لی تھی مگر وقار احمد جب واپس آئے تو اکیلے نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کی بیوی ذکیہ بانو بھی تھیں، ذکیہ بھی پڑھائی کے لئے لندن میں مقیم تھیں ان کی فیملی فیصل آباد سے تعلق رکھتی تھی، ان کی فیملی میں صرف ان کے ماں باپ تھے، جنہیں شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا، البتہ وقار احمد کے خاندان کی خاموشی کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی، بابا سائیں نے وقار احمد کو حکم دیا کہ ذکیہ کو طلاق دیں مگر وقار احمد نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تب بابا سائیں نے انہیں عاق کرنے کی دھمکی دی مگر وقار احمد ان کی دھمکی میں نہیں آئے تو انہوں نے سچ مچ وقار احمد کو اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کر دیا اور

وقار احمد، ذکیہ کو لے کر کچھ عرصے اپنے سسرال میں رہے پھر دوبارہ کراچی آ کر اپنے سسر کی مد سے کاروبار شروع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے قدم جماتے چلے گئے، وقار احمد کی شادی سے بابا سائیں اپنے بھائی کے سامنے اتنے شرمندہ تھے کہ ساری زندگی دوبارہ ان کے گھر نہیں گئے، وہ خود کو معاف نہیں کر پائے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تمام بچوں اور اماں بی کو بھی خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی نے وقار احمد سے تعلق رکھا تو وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتا، لہٰذا وقار احمد بھرے پرے کنبے کے ہوتے ہوئے اکیلے ہو گئے۔

☆☆☆

ہانیہ نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی، پہلے دن اسے بڑا عجیب سا لگا مگر آہستہ آہستہ وہ کام کو سمجھتی چلی گئی اور اب اسے اس کام میں مزہ آنے لگا تھا، اسے مس شائستہ کو اسسٹ کرنا تھا، سارا اسٹاف بھی اچھا تھا، زیادہ تر لوگوں کے خیال میں وہ جہانزیب کی وجہ سے اس ملازمت کو حاصل کر پائی تھی، کیونکہ پہلے دن وہ ہی اسے لے کر آیا تھا، پھر ایک دن جب جہانزیب آفس میں داخل ہوا تو سب لوگ اسے گڈ مارننگ کہتے گئے وہ ہر ٹیبل کے آگے سے گزرتا جا رہا تھا اور سر کے اشارے سے جواب دیتا جا رہا تھا، تب وہ ہانیہ کے ٹیبل کے پاس پہنچا تو ہانیہ نے بھی اسے کھڑے ہو کر گڈ مارننگ کہا اس نے نظر اٹھا کر ہانیہ کو دیکھا فیروزی رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ سلیقے سے سر پر جمائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''مس ہانیہ!'' اس نے ہلکے سے اسے پکارا۔

''یس سر!'' ہانیہ نے جواب دیا۔

''جب میں یہاں سے گزروں یا کوئی اور تو برائے مہربانی آپ کھڑے ہو کر گڈ مارننگ مت کہا کریں۔''

''جی سر!'' وہ حیران ہوئی۔

''مگر سر سب کہتے ہیں۔''

''کہنے دیں سب کو۔'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یاد رکھیں آپ ان سب میں شامل نہیں ہیں۔''

''مگر کیوں سر؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''کیونکہ......'' وہ گڑبڑا گیا۔

''کیونکہ آپ مستقبل کی ڈاکٹر ہیں۔'' اسے بروقت جواب سوجھ گیا۔

''اور ہمیں ڈاکٹروں سے بنا کر رکھنی چاہیے۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا، سب اسٹاف ان کی گفتگو تو نہ سن سکا مگر کوئی بات ضرور ہے یہ سب کے ذہن میں آ چکا تھا، جہانزیب اور فیصل نے ابھی وقار احمد کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، ان کا ارادہ تھا کہ بابا سائیں اور اماں بی عمرہ کر کے واپس لوٹ آئیں تو وہ کوئی حکمت عملی طے کرتے ہیں تاکہ کسی طرح بابا سائیں وقار احمد کو معاف کر دیں اور ہانیہ کو جو پریشانی اٹھا رہی ہے اسے نجات مل جائے، وہ کروڑوں کی وارث ہو کر چند ہزار کی نوکری پر مجبور تھی اور وقار احمد دل کے مریض بن چکے تھے، اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو ہانیہ اکیلی کیسے رہ سکتی ہے، پہلے کی بات اور تھی، بہو بیٹا تھے مگر اب پوتی کا معاملہ ہے ان کے اپنے خون کی بات ہے یقیناً بابا سائیں سوچیں گے ضرور یہی وجہ تھی کہ ابھی انہوں نے منصور احمد سے بھی یہ بات پوشیدہ رکھی تھی جن کا یہ آفس تھا اور فیصل اور جہانزیب اسے سنبھالتے تھے۔

''بیٹا کام کیسا جا رہا ہے آج کل؟'' محمود احمد نے کھانے کے وقت جہانزیب سے پوچھا۔

''پاپا اے ون۔'' اس نے چاولوں کی ڈش اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں تو کہتی ہوں اب اس کی شادی کی فکر کریں۔'' طاہرہ نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے محمود احمد سے کہا۔

''کیوں میاں صاحبزادے؟ تمہاری اماں کیا کہہ رہی ہیں؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پاپا، ابھی نہیں۔''

''ابھی لائف پڑی ہے شادی کرنے کے لئے۔'' اس نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی ہاں کر لو نہ۔'' شاہ زیب بولا۔

''کیوں؟'' جہانزیب نے اسے گھورا۔

''بھائی تمہاری ہو گی تو میری باری آئے گی نہ۔'' شاہ زیب نے بے چارگی سے کہا، سب یہ سن کر ہنس پڑے۔

''مومنہ بیٹا تمہارا کیا خیال ہے، جہانزیب کی شادی کے بارے میں۔'' محمود احمد نے پیار سے بیٹی کو پکارا جو خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔

''جی پاپا، بس اب اپنے گھر میں بھی رونق لگ جانی چاہیے۔'' مومنہ جو بی ایس سی کے آخری سال میں تھی نے کہا۔

''بس پھر طے ہے۔'' محمود احمد نے کہا۔

''بابا سائیں اور اماں بی آ جائیں تو جہانزیب کی شادی کی بات کرتے ہیں۔''

''نہیں پاپا، ابھی نہیں۔'' جہانزیب نے قطعی لہجے میں کہا، طاہرہ نے اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی محسوس کی کہ وہ پانی پیتے پیتے رک گئیں، انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا، ان کی پیشانی پر بھی سلوٹیں پڑ چکی تھیں، جبکہ جہانزیب اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

☆☆☆

ہانیہ نے بغیر کسی دشواری کے اپنے پیپروں کی تیاری شروع کی ہوئی تھی، ذہین تو وہ بہت تھی، پھر اس کے پیپروں کا شیڈول ایسا تھا کہ اسے تیاری کے لئے اچھا خاصا ٹائم مل جاتا تھا کیونکہ پیپروں میں تین سے چار دن کا وقفہ لازمی ہوتا تھا، وہ جی جان سے پیپروں کی تیاری میں مگن تھی، اس کے تمام پیپر اسی وجہ سے بہت اچھے ہو رہے تھے بس آخری پیپر رہ گیا تھا اور وہ اس میں مکمل طور پر گم تھی تب بالکل اچانک وقار احمد کے دل میں درد اٹھا، ہانیہ بمشکل انہیں ہسپتال لے کر آئی، انہیں فوراً آئی سی یو میں ایڈمٹ کیا گیا، اس نے اس پریشانی میں دفتر بھی اطلاع نہیں دی، فیصل نے مس شائستہ کے ذریعے فون کروایا تو پتہ چلا کہ وہ صبح سے اپنے پاپا کے ساتھ ہسپتال میں ہے، فیصل اور جہانزیب دونوں سیدھے ہسپتال پہنچے وہ آئی سی یو کے باہر بے قراری سے ٹہل رہی تھی ان دونوں کو وہاں دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

''سر! آپ یہاں کیسے؟''

''ہانیہ!'' فیصل آگے بڑھا۔

''تم نے مجھے فون بھی نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

''میں نے کہا تھا کہ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔'' ہانیہ چپ کھڑی رہی۔

''اچھا یہ بتائیے آپ کے پاپا کیسے ہیں؟'' جہانزیب نے پوچھا۔

''ابھی وہ ٹھیک نہیں ہیں۔'' ہانیہ نے اپنے لب کچلے۔

''حوصلہ رکھیے مس ہانیہ، آپ تو خود ڈاکٹر بن رہی ہیں، سمجھ سکتی ہیں کہ وہ انشاء اللہ جلد ٹھیک ہوں گے۔'' فیصل ماموں سے ملنے کو بے قرار تھا۔

''کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟'' اس نے

آئی سی یو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں۔“ ہانیہ نے گہری سانس لی۔
”ابھی نہیں۔“
”مس ہانیہ آپ یہاں اکیلی ہیں، کیا آپ کے رشتہ دار وغیرہ نہیں ہیں۔“ جہانزیب نے اسے ٹٹولا۔
”ہیں، کیوں نہیں ہیں، سب ہیں۔“ ہانیہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ جہانزیب چونک گیا۔
”پھر ان میں سے کسی کو بلائیے، آپ ہپتال میں اکیلی ہیں اور یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔“ اس نے ہانیہ کو اکسایا۔
”سر! میں انہیں نہیں بلا سکتی۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔
”مگر آپ اکیلی ہسپتال میں کیسے رہ سکتی ہیں، آپ کا تنہا ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“ جہانزیب کا ذہن مسلسل اس بات میں اٹک رہا تھا کہ اس کا تنہا ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں، جہانزیب اور فیصل انتظار گاہ میں بیٹھ گئے، شام کو وقار احمد کی حالت خطرے سے باہر آئی، تو ہانیہ کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی آئی سی یو میں چلے آئے، وقار احمد کو دیکھ کر فیصل دھک سے رہ گیا، جب وقار احمد گھر سے گئے تھے تو فیصل کی عمر چھ سال تھی پھر وقار احمد کی تصویریں اس نے دیکھی ہوئی تھیں، اب بستر پر جو شخص پڑا تھا جس کے جسم پر جا بجا نلکیاں لگی ہوئی تھیں، جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہا تھا کیا وہ اس کا ماموں وقار تھا، فیصل کی بے اختیار آنکھیں بھر آئیں، ہانیہ اس سے آگے کھڑی تھی، اس لئے اسے فیصل کی حالت نظر نہیں آئی، جہانزیب نے فیصل کی پشت پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا، فیصل نے اسے دیکھا تو جہانزیب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خود کو سنبھالنے کی تلقین کی، فیصل نے تیزی سے خود کو سنبھالا، ہانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے رگڑ کر آنکھوں کو صاف کیا۔
”سر!“ اس نے فیصل کو مڑ کر مخاطب کیا۔
”اب یہ کل تک دواؤں کے زیر اثر رہیں گے، شاید کل شام تک ڈاکٹر انہیں ڈسچارج کر دیں۔“
”ہانیہ! آپ کا کل پیپر ہے؟“ جہانزیب کو اچانک یاد آیا۔
”یس سر!“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔
”مگر اب میں پیپر کیسے دے سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے پاپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”اس وقت پاپا کو میری اشد ضرورت ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”پیپر کا کیا ہے؟ اگلے سال دے لوں گی۔“ اس کا لہجہ دکھوں سے چور تھا، فیصل کا دل کٹ گیا۔
”ہرگز نہیں۔“
”میں ہسپتال میں رہوں گا اور تم گھر جا کر صبح ہونے والے پیپر کی تیاری کرو گی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر قطعی لہجے میں کہا، ہانیہ حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔
”مگر سر، آپ کیسے۔“
”کیوں؟ کیوں نہیں رہ سکتا میں ہسپتال میں؟“ فیصل نے گھور کر ہانیہ کو دیکھا۔
”چلو اب تم ٹائم ضائع نہ کرو اور گھر کی راہ پکڑو۔“ اس نے ہانیہ کو ہچکچاہٹ کا شکار محسوس کرتے ہوئے کہا۔
”لیکن سر؟“
”کوئی لیکن ویکن نہیں۔“ اس نے فوراً اس کی بات کاٹی۔
”سر میں کتابیں یہاں لے آتی ہوں اور

ویٹنگ روم میں جاگ کر ساری رات تیاری کر لوں گی۔“ ہانیہ ہسپتال سے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔
”ہرگز نہیں بے وقوف لڑکی، تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی، یہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمہارے پاپا کل تک دواؤں کے زیر اثر رہیں گے اور یقین کرو میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔“ فیصل نے اسے اچھا خاصا ڈانٹ دیا، اسے کبھی کسی نے نہیں ڈانٹا تھا، اس لئے وہ روہانسی ہو گئی۔
”مگر مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“ وہ منمنائی۔
”کوئی بات نہیں، اچھا نہیں بھی لگ رہا پھر بھی جاؤ، کیونکہ تمہارے پاپا یہی چاہتے ہیں کہ تم ڈاکٹر بنو، چلو شاباش اب جاؤ۔“ اس نے اسے بہلایا۔
”جہانزیب تم ہانیہ کو گھر چھوڑ کر آؤ۔“ اس نے جہانزیب کو کہا۔
”چلیں مس ہانیہ۔“ جہانزیب نے آگے قدم بڑھائے، ہانیہ جیسے ہپنا ٹائز ہو چکی تھی، اعتبار کرے یا نہ کرے، یہ کیسے لوگ ہیں میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی یہ دونوں اتنا کچھ کیوں کر رہے ہیں۔
”یا اللہ! یہ کیا چکر ہے۔“ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔
”آخر پاپا یہی چاہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر بنوں تو میں ان دونوں پر بھروسہ کر لیتی ہوں، آگے اللہ مالک ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جہانزیب کے ساتھ آگے بڑھ گئی، وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اسے راستہ بتاتی جا رہی تھی اور جہانزیب گاڑی چلاتا جا رہا تھا تب ہی اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے جہانزیب نے اس کار کو بالکل نہیں دیکھا جس میں مومنہ، نازو، کرن اور سلمٰی بیٹھی ہوئی تھیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر مہران تھا، ان سب نے جہانزیب کے ساتھ اس انجان لڑکی کو دیکھ لیا تھا، لڑکی نے دوپٹہ سر پہ سلیقے سے جمایا ہوا تھا اور وہ کچھ کہہ رہی تھی جسے جہانزیب نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔
”تو یہ وجہ ہے۔“ مومنہ نے غصے سے سوچا۔
”اس وجہ سے جہانزیب بھائی شادی سے انکار کر رہے ہیں۔“ وہ سب حویلی جا رہے تھے آج بابا سائیں اور اماں بی عمرے سے لوٹ کر واپس آ رہے تھے، ان سب نے ائیر پورٹ جانا تھا۔

☆☆☆

فیصل نے کوٹ اتار کر ویٹنگ روم کی کرسی پر ڈال دیا تھا، اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اگر وقار ماموں کو کچھ ہو گیا تو ہانیہ اس دنیا کا مقابلہ تنہا کیسے کرے گی، بابا سائیں اور اماں بی کیسے ماں باپ ہیں جنہوں نے کبھی بیٹے کو مڑ کر نہیں دیکھا، مگر اب وقت آ گیا ہے، بابا سائیں اور اماں بی کو وقار ماموں کو معاف کر کے ہانیہ کو اپنانا ہو گا، جہانزیب واپس آیا تو اس نے اسے گھر چلے جانے کو کہا مگر جہانزیب نے منع کر دیا اور فون ملا کر اپنی امی طاہرہ کو ضروری کام سے شہر سے باہر اچانک جانے کی اطلاع دے دی ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ فیصل بھائی بھی اس کے ساتھ ہیں۔
”یار! مجھے تو یاد نہیں رہا، آج تو بابا سائیں اور اماں بی آ رہے ہیں۔“ فیصل نے جہانزیب سے کہا۔
”ہاں بھائی! آ تو رہے ہیں، چلو خیر ہم بھی ضروری کام سے ہی ہسپتال میں بیٹھے ہیں۔“
نرس دوبارہ وقار احمد کو انجکشن لگا کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

حویلی میں خوب چہل پہل تھی، بابا سائیں اور اماں بی عمرے سے واپس آ چکے تھے، بابا سائیں کا سارا خاندان جمع تھا، کھانے کا وقت ہو چلا تھا، سب کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں آ گئے، کھانے کا سارا انتظام ان کی بہوؤں طاہرہ اور منزہ نے کیا تھا، ٹیبل کی بجائے زیادہ لوگوں کی وجہ سے فرشی نظام ترتیب دیا گیا تھا، سفید چاندنیوں کے گرد گاؤ تکیہ لگائے گئے تھے، کھانے کے برتن درمیان میں بڑی چوکیوں پر سیٹ تھے، کھانا بھی چھوٹی ڈشوں کی بجائے بڑے تھالوں میں سرو کیا گیا تھا، سب نے کھانے کے انتظام کو پسند کیا، کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، بابا سائیں اور اماں بی اپنے سفر کا احوال بیان کر رہے تھے، اچانک بابا سائیں نے فیصل کے بارے میں پوچھا تو نصرت نے بتایا کہ وہ دوسرے شہر کام کے سلسلے میں گیا ہوا ہے، ساتھ ہی بابا سائیں نے جہانزیب کا پوچھا تو طاہرہ نے بھی یہی بتایا، جہانزیب کے بارے میں یہ سن کر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور مسکرا دیں، بابا سائیں کی باریک بین نظروں نے ان کی یہ حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی اور انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھ لیا کہ کیا بات ہے؟ سب خاموش رہے مگر نازو خاموش نہ رہ سکی اور اس نے سب بزرگوں کا لحاظ کیے بناء کہہ دیا کہ ان لوگوں نے حویلی آتے ہوئے جہانزیب کو گاڑی میں ایک لڑکی کے ساتھ کہیں جاتے دیکھا ہے، بابا سائیں کا رنگ ایک لمحے میں بدل گیا انہوں نے قہرناک نظروں سے بہو کو دیکھا، طاہرہ گڑبڑا گئیں۔

''نہیں بابا سائیں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ یقین کریں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا ہے، اس نے یہی بتایا ہے کہ......''

''بس۔'' بابا سائیں ان کی بات کاٹ کر دھاڑے۔

''اسجد!'' انہوں نے پوتے کو پکارا۔

''فون لگاؤ جہانزیب کو۔'' اسجد نے جلدی جلدی نمبر پنچ کیے بیل جا رہی تھی، بابا سائیں نے فون تھام لیا۔

''ہیلو۔'' جہانزیب کی آواز سنائی دی۔

''ہاں پتر کہاں ہو؟'' بابا سائیں نے اپنے لہجے کو مدہم کرتے ہوئے پوچھا۔

''السلام علیکم بابا سائیں! پہنچ گئے آپ؟ اماں بی کیسی ہیں؟'' جہانزیب نے پوچھا۔

''ہاں پتر پہنچ گئے، سب خیر ہے تو سنا کب آ رہا ہے مجھ سے ملنے؟'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا اس سے بہت مشکل سے خود پر کنٹرول کر کے بات کر رہے تھے۔

''بابا سائیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے اور فیصل بھائی کو حیدر آباد آنا پڑ گیا ہے، بس ہم دونوں کل دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔'' اس نے انہیں ٹالا۔

''اچھا فیصل سے میری بات کروا۔'' جہانزیب نے فون فیصل کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''جی بابا سائیں! آپ پریشان نہ ہوں، دراصل میرے دوست کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے میں اور جہانزیب اسے ملنے حیدر آباد آئے تو اس کی نازک حالت دیکھ کر ہم نے آج رات اس کے پاس رکنے کا فیصلہ کیا ہے، بس کل ہم آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔'' بابا سائیں فیصل پر بہت بھروسہ کرتے تھے، اس کی آواز سن کر کچھ مطمئن تو ہو گئے مگر جہانزیب کے ساتھ لڑکی کو دیکھنا جانے کیوں انہیں ہضم نہیں ہو رہا تھا، اب انہیں ہر حال میں کل کا انتظار کرنا تھا، کل سے پہلے یہ پہیلی حل ہونے والی نہیں تھی، جب تک جہانزیب نہ آ جاتا۔

☆☆☆

سب لڑکیاں لان میں بیٹھی تھیں، ہنسی مذاق چل رہا تھا، تب مہران اور سعد وہاں پہنچ گئے۔

''آپ دونوں یہاں کیوں آ گئے۔'' کرن ہنسی۔

''جائیے جینٹس میں جا کر بیٹھیے۔''

''کیوں؟'' سعد نے کرسی سنبھالی۔

''یہاں بڑا قرآن حفظ کیا جا رہا ہے؟''

''تو اور کیا، یہاں غیبتوں کا بازار کھلا ہو گا، سب کے بخیئے ادھڑ رہے ہوں گے۔'' مہران نے قہقہہ لگایا اور سعد کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''ویسے مجھے تم لڑکیوں پر کبھی کبھی ترس آتا ہے، بیچاری لڑکیاں، غیبتوں کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتیں، اب نازو کو ہی دیکھ لو۔'' وہ نازو کی طرف مڑا۔

''کیا ضرورت تھی بابا سائیں کو جہانزیب کی شکایت لگانے کی۔'' اب وہ غصے میں آ چکا تھا۔

''کیوں...... کیوں نہ لگاتی شکایت، کیا تم نے نہیں دیکھا تھا؟'' اس نے تن کر پوچھا۔

''دیکھا تھا مگر بعض اوقات آنکھ کا دیکھا بھی غلط ہوتا ہے، ہو سکتا ہے اس لڑکی نے لفٹ لی ہو، یا ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی کلاس فیلو ہو، اچانک مل گئی ہو، کچھ بھی ہو سکتا ہے، کم از کم جب تک تمہیں یقین نہ ہو، کوئی بات آگے نہیں بڑھانی چاہیے۔'' اس کی بات سے تقریباً سب لڑکیاں متفق تھیں سوائے نازو کے، وہ جہانزیب کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ ہی نہیں سکتی، اس کے دل کے چور جذبات سے کچھ کچھ آگاہ تقریباً سارے کزن تھے، مگر سعد نے اپنے دل میں نازو کو بسایا ہوا تھا، آج نازو کا جہانزیب کے لئے بولنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

''ویسے نازو تمہیں نظر کی عینک کی بھی ضرورت ہے۔'' مہران نے کہا۔

''کیوں؟'' نازو حیران ہوئی۔

''تاکہ تمہیں قریب کی چیزیں بھی واضح نظر آئیں۔'' اس نے نازو کے ساتھ بیٹھے سعد کو دیکھتے ہوئے کہا، دونوں اٹھ کر جا چکے تھے۔

☆☆☆

ہانیہ کا پیپر بہت اچھا ہو گیا تھا، وہ سیدھی ہسپتال آ گئی، فیصل اور جہانزیب دونوں نے اس سے پیپر کے بارے میں پوچھا۔

''سر! آپ دونوں کے تعاون سے میں اس قابل ہوئی کہ پیپر دے سکوں، ورنہ میں اتنی پریشان تھی کہ کیا بتاؤں؟ سر میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔'' وہ اتنی ممنون تھی کہ وہ دونوں شرمندہ ہو گئے، تھوڑی دیر میں وقار احمد کو ہوش آ گیا اور دوپہر تک ڈاکٹروں نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی، ہانیہ نے ان دونوں کا تعارف کمپنی کے مالکان کے طور پر کروایا اور فیصل نے انہیں سہارا دے کر کھڑا کیا، دوسری طرف سے جہانزیب نے تھاما اور سنبھالتے ہوئے کار تک لائے، ہانیہ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور ان دونوں نے انہیں گھر تک پہنچا دیا، ہانیہ نے انہیں چائے کے لئے روکنا چاہا مگر انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی، آخر بابا سائیں کی عدالت میں پیشی بھگتنی تھی، وہ دونوں سیدھے حویلی پہنچ گئے، سب بڑے ہال میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو سب نے انہیں دیکھا ان کا برا حال ہو رہا تھا، ڈھیلی ٹائیاں بکھرے بال، شکن آلود کپڑے ہاتھوں میں کوٹ تھامے، وہ دونوں سیدھے بابا سائیں اور

اماں بی کی طرف بڑھے سلام کر کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئے، ان دونوں کی سرخ آنکھیں اس بات کی غماز تھی کہ دونوں ساری رات جاگتے رہے ہیں۔

"ہاں پتر کیا حال ہے تمہارے دوست کا؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

"جی بابا سائیں اسے گھر پہنچا کر آ رہے ہیں؟" فیصل نے جواب دیا۔

"نہ پتر اس کے گھر والے نہیں تھے جو تم لوگ رات کو ہسپتال میں رکے؟" انہوں نے فکر سے پوچھا۔

"سب ہیں بابا سائیں، بس خون سفید ہو گیا ہے لوگوں کا۔" جہانزیب بہت تلخ ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" ان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔

"چھوڑیں بابا سائیں۔" جہانزیب کا دل نہ جانے کیوں برا ہو رہا تھا اس کے دل میں یہی خیال بار بار آ رہا تھا کہ یہ سب بابا سائیں کی وجہ سے ہوا ہے۔

"نہ چھوڑوں کیسے؟" یکدم بابا سائیں دھاڑے، سب سہم گئے، مہران نے ملامت آمیز نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔

"کہاں تھا تو شام کو؟ کس لڑکی کو بٹھایا ہوا تھا تو نے گاڑی میں؟ بول؟ بولتا کیوں نہیں؟" بابا سائیں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا، جہانزیب اور فیصل دھک سے رہ گئے، یقیناً بابا سائیں کو خبر مل چکی ہے فیصل نے جہانزیب کو اشارہ کیا، خاموش رہنے کا۔

"کون سی لڑکی بابا سائیں؟" فیصل نے پوچھا۔

"وہی لڑکی جس کے ساتھ یہ کہیں جا رہا تھا، سب لوگوں نے دیکھا تھا، اوئے تو جھٹلاتا ہے اس بات کو؟" انہوں نے جہانزیب کو جھنجھوڑا، یکدم جہانزیب کا ضبط اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ہاں...... ہاں۔" وہ چیخا۔

"تھی وہ لڑکی میرے ساتھ۔" وہ بابا سائیں سے بھی زیادہ اونچی آواز میں دھاڑا۔

"لو سن لو، محمود اور طاہرہ سن لو، یہ دن دیکھنا تھا تمہارے بیٹے کی وجہ سے، کہ یہ لڑکیوں کو لے کر گھومیں گے اور شرمندہ ہونے کی بجائے ہمارے سر پر جوتے ماریں گے۔" انہوں نے طنزیہ ان دونوں سے کہا، طاہرہ کے تو آنسو بہنے کو تیار تھے اور محمود احمد پریشان اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"یہ دن دیکھنا میری وجہ سے نہیں ہیں بابا سائیں، اس کے ذمہ دار آپ ہیں آپ؟" اس نے یکدم دھماکہ کیا۔

"نہ میں نے کہا ہے تو لڑکیوں کو گھما کر گاڑیوں میں بٹھاؤ۔" انہوں نے جیسے انگارے چبائے، فیصل بھی فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اب بات کھل کر ہو جائے، اس نے جہانزیب کو بولنے کا اشارہ کیا۔

"جانتے ہیں وہ لڑکی کون ہے؟" جہانزیب اونچی آواز میں بولا۔

"کون ہے؟" بابا سائیں کے لبوں سے الفاظ سرسرائے۔

"آپ کی پوتی ہے، آپ کا اپنا خون ہے وہ، وقار چچا کی بیٹی ہے وہ۔" اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔

"اور جانتے ہیں ہارٹ اٹیک کسے ہوا ہے؟" فیصل بھی اونچی آواز میں بولا، سب خاموش تھے۔

"وقار ماموں کو؟" اس نے بم ان کے سر پر پھوڑ دیا۔

"کل سے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں صرف آپ کی وجہ سے؟" جہانزیب دھاڑا۔

"اور آپ کہتے ہیں میں گاڑیوں میں لڑکیوں کو لے کر گھومتا ہوں؟" سارا خاندان سناٹے میں تھا۔

"ہاں۔" جہانزیب اس بار کچھ دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں ہانیہ کو گھر چھوڑنے گیا تھا، کیونکہ اس کی دو وجوہات تھیں پہلی تو یہ کہ آج اس کا آخری پیپر تھا اور دوسری بات یہ کہ تھی ہم دونوں نہیں چاہتے تھے کہ وہ اکیلی ہسپتال میں رہے؟"

"اکیلی کیوں؟" فرحت نے روتے ہوئے پوچھا ذکیہ کہاں گئی۔

"وہ دو سال پہلے کینسر سے وفات پا چکی ہیں۔" فیصل نے بتایا۔

"اور اب وقار ماموں کو دل کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے، کل سے آج دوپہر تک وہ دواؤں کے زیر اثر رہے ہیں اب انہیں گھر چھوڑ کر آ رہے ہیں۔" فیصل نے آہستہ آہستہ ساری تفصیل بتائی، بابا سائیں بالکل خاموش تھے اماں بی کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے، فرحت اور نصرت بھی رو رہی تھیں، فیصل سارا حال آہستہ آہستہ بتا کر خاموش ہوا تو جہانزیب کو پھر کچھ یاد آیا۔

"اور بابا سائیں ایک اور بات سن لیں، آپ کی پوتی پچھلے ایک مہینے سے آپ کی ہی کمپنی میں چند ہزار روپے کی ملازمت کر رہی ہے، جانتے ہیں کیوں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سب کو دیکھا۔

"کیونکہ اس نے اپنا میڈیکل کے آخری سال کا داخلہ بھرنا ہے بابا سائیں۔" اس نے تاسف سے ان کو دیکھا۔

"وہ جو کروڑوں کی مالک ہے اپنا داخلہ جمع کروانے کے لئے چند ہزار کی ملازمت پر مجبور ہے، کیوں بابا سائیں کیوں؟" اس نے بابا سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"صرف آپ کی وجہ سے۔" جہانزیب نے ان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بابا سائیں آپ کو کتنا شوق تھا کہ آپ کے بچوں میں سے کوئی ڈاکٹر بنے مگر کسی نے آپ کی خواہش پوری نہیں کی، یہ جو اتنے سارے آپ کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں بیٹھے ہیں ان میں کتنوں نے آپ کی خواہش پوری کی؟" فیصل نے رک کر سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کسی نے بھی نہیں اور ادھر ہانیہ کو دیکھیں، وہ دراصل آپ کی خواہش پوری کر رہی ہے۔" فیصل چپ ہوا تو جہانزیب شروع ہو گیا۔

"اماں بی آپ مجھے یہ بتائیں آپ کیسی ماں ہیں؟ آپ کا دل کبھی نہیں تڑپا بیٹے سے ملنے کے لئے اور مجھے تو اپنی دونوں پھپھو سے بھی یہی بات پوچھنی ہے، کیسی بہنیں ہیں آپ؟ ارے بابا سائیں ناراض تھے آپ لوگ تو چوری چھپے مل سکتی تھیں کہ نہیں؟ اور اماں بی اب بھی صرف رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا، ہانیہ بالکل اکیلی ہے، بہن بھائی کوئی ہے نہیں، وہ ملازمت پر جاتی ہے تو پیچھے وقار چچا بالکل اکیلے ہوتے ہیں، آپ جانتی ہیں دل کے مریضوں کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا، اگر کل کلاں کو چچا کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا ہے تو کیا آپ خود کو معاف کر سکیں گی۔" جہانزیب نے اماں بی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"کسی کو کیا پتہ میں کتنا تڑپی ہوں اپنے بیٹے کے لئے۔" اماں بی گریہ زاری کرتے ہوئے بولیں۔

"ساری ساری رات جاگ کر گزارتی

ہوں نجانے میرا وقار کس حال میں ہوگا۔"

"بس اب فیصلہ ہوگیا۔" اچانک اماں بی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تو مجھے لے چل۔" انہوں نے فیصل کا ہاتھ پکڑلیا۔

"چلیئے اماں بی۔" فیصل تو جیسے تیار بیٹھا تھا، فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"شاباش فیصل اور جہانزیب۔" اچانک داؤد صاحب بولے۔

"مجھے تم دونوں پر فخر ہے، ارے جو کام میں اتنے عرصے میں نہ کرسکا وہ تم دونوں نے کر دکھایا۔" فیصل اماں بی کو لے کر دروازے تک پہنچا۔

"رک جاؤ عظمت بی بی۔" بابا سائیں کی پر جلال آواز گونجی، سب سہم گئے، اب بابا سائیں اماں بی کو کیا حکم دیتے ہیں۔

"نہیں سردار صاحب، اب نہیں۔" اماں بی نے مڑے بغیر کہا۔

"اب میرا بچہ موت کے منہ میں پڑا ہے، آپ اگر مجھے گھر سے بھی نکال دیں گے تو میں تب بھی جاؤں گی۔" انہوں نے قدم آگے بڑھائے۔

"میں نے کہا رک جاؤ۔" بابا سائیں یکدم دھاڑے، ان کی دھاڑ پورے گھر میں گونج اٹھی، اماں بی بے اختیار رک گئیں اور مڑ کر بابا سائیں کو دیکھنے لگیں۔

"میرے بغیر جاؤ گی، ارے وہ میرا بھی بیٹا ہے۔" ان کے الفاظ تھے گویا تپتے صحرا میں بارش کی بوندیں، جہانزیب فوراً ان کے گلے لگ گیا، انہوں نے فیصل کو اشارے سے پاس بلایا اور دوسرے شانے سے اسے لگالیا۔

"چلو یار! جلدی چلو۔" انہوں نے کہا اور سب مسکرادیے۔

☆☆☆

وقار صاحب کے دروازے پر بابا سائیں کی شاندار گاڑی رکی جسے فیصل چلا رہا تھا گاڑی میں بابا سائیں اور اماں کے علاوہ جہانزیب موجود تھا، فیصل نے نیچے اتر کر بیل دبائی، تھوڑی دیر بعد اندر سے ہانیہ کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"مس ہانیہ دروازہ کھولیں۔" جہانزیب بولا، ہانیہ نے دروازہ کھول دیا سامنے اماں بی اور بابا سائیں کو دیکھ کر سلام کیا اور فیصل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مس ہانیہ یہ میرے دادا ہیں، بابا سائیں اور یہ میری دادی ہیں اماں بی اور "اماں بی۔" وہ اماں بی سے مخاطب ہوا۔

"یہ مس ہانیہ ہیں ہماری کمپنی میں کام کرتی ہیں کل ان کے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" وہ راستے میں ہی ان دونوں کو بتا چکا تھا کہ ہانیہ لاعلم ہے۔

"آیئے اندر۔" اس نے راستہ دیا، سب اندر آگئے، وہ انہیں لے کر وقار احمد کے کمرے میں آگئی، وقار احمد آنکھیں موندے لیٹے تھے، اماں بی اور بابا سائیں انہیں اتنا نڈھال اور کمزور دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔

"یہ میرے پاپا ہیں وقار احمد۔" ہانیہ نے تعارف کروایا، وقار احمد نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں بابا سائیں اور اماں بی کے چہرے نظر آئے انہیں اپنا وہم لگا انہوں نے دوبارہ آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔

"اماں بی!" ان کے لب کپکپائے۔

"میرا بچہ۔" اماں بی فوراً بازو پھیلا کر آگے بڑھیں وقار احمد اٹھ کر بیٹھے۔

"اماں بی!" انہوں نے وقار احمد کو سینے سے لگالیا پھر بابا سائیں بھی آگے بڑھے۔

"بابا سائیں کیا آپ نے مجھے معاف کردیا ہے۔" وقار احمد ہچکچائے۔

"او کیسی معافی پتر اوئے، میں تو کب سے تیرا انتظار کررہا تھا، کہ شاید تجھے بڈھے ماں باپ یاد آجائیں۔" انہوں نے وقار احمد کو اپنے سینے سے لگا کر شکوہ کیا، ہانیہ حیران پریشان یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی، جبکہ فیصل اور جہانزیب دونوں مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

بابا سائیں اور اماں بی ان دونوں کو حویلی لے آئے تھے، یہاں بھرا پرا خاندان دیکھ کر وہ حیران رہ گئی، اس کے اتنے بہت سے رشتہ دار تھے اور وہ اب تک کتنی اکیلی زندگی گزارتی رہی ہے، منصور تایا کی خوشی نے سب کزنز سے اس کا تعارف کروایا، وہ سب سے گھل مل گئی بس نازو اس سے کچھ کھنچی کھنچی محسوس ہوئی۔

فیصل اور جہانزیب کو تو وہ پہلے سے ہی جانتی تھی، دونوں تایا، تائیاں، پھپھو اور پھوپھا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، بابا سائیں اکثر اسے اپنے پاس بٹھا لیتے اور اس سے گھنٹوں باتیں کرتے تھے، اماں بی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں اور وقار احمد تو جیسے سارے رشتے پا کر دوبارہ جی اٹھے تھے۔

اس دن وہ سب باغ میں گھومنے آئے تھے، آموں کا موسم تھا، بابا سائیں نے سب کو باغ میں جا کر سیر کرنے کا پیغام بھیجا تو سب مقررہ دن حویلی پہنچ گئے، باغ میں پہنچ کر خوب ہلا گلا مچا، سعد، ولید، مہران اور شاہ زیب درختوں پر چڑھ چڑھ کر آم توڑ رہے تھے، درختوں کے نیچے کھڑی لڑکیوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا، سب سے زیادہ آم کرن اور نوشی اکٹھے کرچکی تھیں، سلمٰی، مومنہ اور نازو بھی اس کوشش میں تھیں کہ اوپر سے گرنے والے آم جھپٹ لیں مگر نوشی اور کرن کی پھرتی قابل دید تھی، یشفاء کے دونوں بچے بھی چہکتے پھر رہے تھے، ہانیہ ایک درخت کے نیچے کھڑی اس سارے نظارے سے محظوظ ہورہی تھی، تب ہی جہانزیب اس کے پاس آگیا۔

"کیسا لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"زبردست۔" ہانیہ مسرت سے بولی۔

"مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ باغ سے پھل توڑنے میں اتنا مزہ آتا ہوگا۔"

"لیکن آپ نے تو ایک بھی آم نہیں توڑا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کیونکہ مجھے درختوں پر چڑھنا ہی نہیں آتا۔" ہانیہ کہہ کر ہنس پڑی، اس کے ہنسنے سے لگا جیسے کوئی جھرنا پھوٹ پڑا ہو، جہانزیب کھو سا گیا۔

"آپ کو چڑھنا آتا ہے درخت پر۔" یکدم ہانیہ نے پوچھا۔

"آں...... ہاں...... ہاں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"آتا تو ہے مگر یہ اتنے سارے چڑھے تو ہوئے ہیں۔"

"سر! آپ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں بچپن سے اتنی موج مستی کی زندگی گزارتے آرہے ہیں۔" ہانیہ کے لہجے میں اسے کتنی حسرتیں بولتی محسوس ہوئیں۔

"کم آن ہانیہ!" اس نے تاسف سے کہا۔

"کیا ہوا سر؟" ہانیہ نے پوچھا۔

"بھئی کم از کم اب تو سر نہ کہا کرو۔" اس نے بے چارگی سے کہا، ہانیہ مسکرادی۔

"جب تم مجھے سر کہتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی پچاس ساٹھ سال کا خبطی سا پروفیسر

ہوں۔" جہانزیب کی بات سن کر ہانیہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی اور جہانزیب بے اختیار اسے محویت سے دیکھے گیا، تب ہی کوئل کوکنے لگی۔

"چلیں کوئل کو ڈھونڈتے ہیں۔" جہانزیب نے کہا اور وہ اس کے ساتھ چل پڑی، ہوا جو صبح سے چل رہی تھی اب گھٹا میں بدلنے لگی تھی، موسم خوبصورت ہو رہا تھا، آسمان گویا بادلوں کی چھل پہل سے سج گیا تھا، وہ کوئل کو ڈھونڈتے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، کوئل نے تو کیا ملنا تھا، مالی بابا کے گھر کے پاس پہنچ کر انہوں نے کراہنے کی آواز سنی، ہانیہ نے جہانزیب کی توجہ اس جانب مبذول کروائی، وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گیا، ہانیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی، اندر چارپائی پر سات آٹھ برس کا بچہ پڑا کراہ رہا تھا، ہانیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھوا، وہ بخار سے تپ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ، اتنا بخار۔" ہانیہ بڑبڑائی، اس کے ماں باپ دونوں رو رہے تھے۔

"بی بی صیب، اسے تین روز ہو گئے ہیں تپ چڑھے ہوئے۔" اس کی ماں نے روتے روتے بتایا۔

"حکیم صیب کی پڑی سے بھی تپ نہیں اترتا، ام کیا کرے بی بی صیب۔"

"آپ ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لاؤ۔" وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی، مالی بابا جلدی سے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لے آئے اس نے عورت سے کپڑا مانگا اور اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنے لگی، جہانزیب بھی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا باہر بہت زور کی بارش شروع ہو چکی تھی، بادلوں کی گرج کے ساتھ ساتھ بجلی بھی چمک رہی تھی، ہانیہ پٹیاں ٹھنڈے پانی میں بھگو بھگو کر کافی دیر تک رکھتی رہی تقریباً پونے گھنٹے کے بعد اس کا بخار کم ہو گیا اور بچے نے آنکھیں کھول دیں، ہانیہ نے صاف کپڑے سے اس کا چہرہ صاف کیا اور کھڑی ہو گئی۔

"مجھے یہ ٹائیفائیڈ بخار لگتا ہے اور اسے ہسپتال لے جانا ضروری ہے، آج تو بارش ہو رہی ہے آپ کل اسے ہسپتال ضرور لے کر جائیں حکیم صاحب کی دوا سے آرام نہیں آئے گا، آج میں بخار کی گولیاں کسی کے ہاتھ بجھوا دوں گی، دودھ سے دے دینا، انشاء اللہ رات کو بخار نہیں ہوگا۔" اس نے اس کی ماں سے کہا۔

"بہت اچھا بی بی صیب، اللہ آپ کو خوش رکھے۔" اس کی ماں اسے دعائیں دینے لگی۔

"چلیں ہانیہ۔" جہانزیب دروازے میں کھڑا باہر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"بارش تھم چکی ہے۔" ہانیہ اس کے ساتھ باہر نکل آئی باہر سماں ہی بدلا ہوا تھا، ہر شے دھلی دھلی لگ رہی تھی، ہانیہ نے باہر آ کر گہری سانس لے کر گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک اپنے اندر اتاری، کوئل اب بھی کوک رہی تھی۔

"ہانیہ یہ ساون کی پہلی بارش تھی۔" جہانزیب نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا۔" ہانیہ کو حیرت ہوئی۔

"یہ ساون کی بارش تھی۔"

"ہاں۔" جہانزیب نے سر ہلایا۔

"سب لوگ کہاں چلے گئے۔"

"میرا خیال ہے وہ حویلی چلے گئے ہیں، چلو ہم بھی چلتے ہیں۔" ہانیہ اس کے ساتھ چل پڑی، کچا راستہ بہت خراب ہو چکا تھا، جگہ جگہ گڑھوں میں پانی بھر چکا تھا، جہانزیب بڑی مہارت سے چل رہا تھا، جبکہ اس سے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا، ایک جگہ جو اس کا پاؤں پھسلا تو اس نے بے اختیار گرنے سے بچنے کے لئے

جہانزیب کی شرٹ ہاتھ میں دبوچ لی، جہانزیب نے بے اختیار ہانیہ کو ہاتھوں سے پکڑ کر سہارا دیا، اس کے اس طرح ہاتھ پکڑنے سے ہانیہ شپٹا گئی، جہانزیب نے فوراً اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

"مضبوطی سے پاؤں جما کر چلو۔" خفت مٹانے کو وہ اسے ہدایتیں دینے لگا، ہانیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی احتیاط سے چلتی گئی، آگے پانی کھڑا تھا، جہانزیب اسے پھلانگ گیا، اس کے لئے ایسا کرنا مشکل تھا، وہ پریشان ہو گئی کہ کیا کرے تب ہی اچانک جہانزیب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، وہ چند لمحے تذبذب کا شکار رہی کہ ہاتھ تھامے یہ نہیں۔

"کم آن ہانیہ۔" جہانزیب ہلکی آواز میں پکارا، ہانیہ نے آہستہ آہستہ اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا جسے جہانزیب نے اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا، ہانیہ بے اختیار کھینچ کر اس کے ساتھ جا ٹکرائی اور فوراً الگ ہو گئی۔

"چلو۔" جہانزیب نے کہا اور آگے چل پڑا، ہانیہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی، تھوڑی دیر بعد حویلی آ گئی وہ جہانزیب کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو سلمٰی نازو اور نوشی انہیں اوپر ٹیرس پر نظر آئیں، جہانزیب اندر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا جبکہ ہانیہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا، وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی، نازو اسے گھورتی رہی۔

☆☆☆

بابا سائیں نے اسے بلایا تھا، وہ کپڑے بدل کر وہاں پہنچی تو وہاں داؤد پھوپھا اور منصور تایا بھی موجود تھے۔

"آؤ بیٹی آؤ۔" بابا سائیں اسے دیکھتے ہی بولے۔

"بیٹا! مجھے جہانزیب نے سب بتا دیا ہے، انشاء اللہ میں اس بچے کو کل شہر کے ہسپتال بجھوا دوں گا۔"

"جی بابا سائیں۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"بیٹا اب ہم اپنے ہسپتال کے منصوبے پر کام شروع کر رہے ہیں، میں نے تمہارے پھوپھا کو نقشہ بنانے کی ہدایت کر دی ہے تین سال کا منصوبہ ہے جب تک تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ گی، انشاء اللہ ہسپتال تم نے ہی سنبھالنا ہے۔" ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا، ہانیہ ان کی خوشی سے خود بھی خوش ہو گئی۔

☆☆☆

"تم لوگ کل کہاں رہ گئے تھے؟" سلمٰی نے ہانیہ سے پوچھا وہ لوگ اگلے دن لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"ہم...... وہ دراصل......" ہانیہ ابھی جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ نازو بول اٹھی۔

"ساون انجوائے کر رہی تھیں؟" سب نے اس کی طرف دیکھا وہ گھبرائی گئی، تب ہی نے یشفاء نازو کو گھورا۔

"ہاں تو اور کیا؟" نازو ان کی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر بولی۔

"میں نے خود انہیں جہانزیب کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔" ہانیہ خاموشی سے اپنے لب کاٹنے لگی۔

"کم آن ہانیہ۔" یشفاء نے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"نازو کو عادت ہے اول فول بکنے کی، تم محسوس نہ کرنا۔"

"جی نہیں بھابھی، مجھے عادت ہے کھری اور سچی بات کہنے کی، پوچھیئے آپ ان سے، کہ یہ

کہاں رہیں تقریباً ایک گھنٹہ، جب ہم آنے لگے تو کہاں تمیں یہ؟ کتنا ڈھونڈا سب نے مگر یہ وہاں ہوتی تو ملتیں نہ۔" نازو نجانے اس سے کس بات کا بدلہ لے رہی تھی، ایسی بات تو کبھی کسی نے اس سے نہیں کی تھی، اس کو سخت ہزیمت کا احساس ہوا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، یشفاء نے صورتحال گمبھیر دیکھی تو نازو کو ڈانٹنے لگی، تب ہی اچانک باہر کا دروازہ کھلا اور مالی بابا کی بیوی اندر داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھا، اس نے لان میں ساری لڑکیوں کو بیٹھے دیکھا تو وہاں آ گئی اور متلاشی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی، ہانیہ پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی جانب بڑھی۔

"بی بی صیب!" اس نے گلدستہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کے واسطے ام نے بنایا ہے۔" ہانیہ نے گلدستہ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اب تمہارا بیٹا کیسا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے بی بی صیب اب وہ بالکل ٹھیک ہے، اس کا بابا اسے آج ہسپتال لے گیا تھا، دوا کھلا دی ہے بی بی صیب کل سے اسے بخار بھی نہیں ہوا، یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے آپ نے کل جس طرح اس کی خدمت کی ہے بی بی صیب ام اس کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔" وہ غریب عورت اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔

"ارے نہیں نہیں، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" ہانیہ شرمندہ ہو گئی۔

"نیں بی بی صیب، آپ تو سیر کے واسطے آیا تھا اور امارے گھر میں امارے بچے کی خدمت کرتی رہیں، ام بہت شرمندہ ہے بی بی صیب اماری وجہ سے آپ کی سیر بھی خراب ہوئی۔" وہ کتنی عاجزی سے بات کر رہی تھی کہ ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے۔

"اچھا سنو، بچے کا خیال رکھا کرو، اسے مچھروں سے اور مکھیوں سے بچاؤ، برسات کے دن شروع ہو چکے ہیں پانی ابال کر پیو اور جو ڈاکٹر صاحب کہیں اسی طرح کرو۔" اس نے اسے سمجھایا۔

"جی بی بی صیب۔" وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گئی، سب خاموش بیٹھی تھیں۔

"یشفاء آپی میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" اس نے یشفاء کو مخاطب کیا اور خاموشی سے اٹھ کر اندر آ گئی۔

"ہو گئی تمہاری تسلی نازو؟" نوشی نے برا منہ بناتے ہوئے نازو کو لتاڑا۔

"کیا ملتا ہے تمہیں ہانیہ کو دکھ دے کر۔" کرن بھی بولی۔

"وہ کتنی اچھی ہے سب کا خیال رکھتی ہے۔" سلمٰی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"اب یہی کیا کم ہے کہ ہم سیر و تفریح میں مصروف رہے اور وہ ایک بچے کی مسیحائی میں مگن تھی اور تمہاری سوچ کتنی گھٹیا ہے نجانے تم نے کیا کیا سوچ لیا تھا۔" یشفاء تاسف سے نازو کو دیکھ رہی تھی، نازو خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔

"ویسے نازو پرابلم کیا ہے۔" یشفاء نے پوچھ ہی لیا۔

"کوئی پرابلم نہیں بھابھی۔" اس نے انگلیاں مروڑنی شروع کر دیں۔

"مجھے تو بس اس بات کا دکھ ہے کہ اس نے آتے ہی بابا سائیں کو نجانے کیا گھول کر پلایا ہے کہ وہ ہر وقت ہانیہ، ہانیہ کا ورد کرتے رہتے ہیں

اور تو اور کل پاپا کو ہسپتال کا نقشہ بنانے کی ہدایت دی ہے، جسے ہانیہ سنبھالے گی۔" اسے نجانے کیوں ملال تھا۔

"ارے اتنا رنج ہے تو تم خود اتنا پڑھ لیتیں کہ تم ڈاکٹر بن کر ہسپتال سنبھال لیتیں۔" سلمٰی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں نازو اب اگر ہانیہ سے تم نے کوئی الٹی سیدھی بکواس کی تو میں امی کو شکایت لگا دوں گی۔" کرن نے بھی اسے وارننگ دی اور سلمٰی کے ساتھ اندر چلی گئی، نازو وہیں بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

ہانیہ کی آخری سال کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی جو پریکٹیکل پر مشتمل تھی وہ بہت مصروف ہو چکی تھی، وہ بڑی محنت سے اپنے اسائمنٹ تیار کرتی تھی، اب تو گھر والے اس سے بات کو ترس گئے تھے، سارا دن کالج اور ہسپتال میں گزار کر وہ سہ پہر کے قریب گھر آ کر کھانے سے فارغ ہو کر سو جاتی تھی، پھر شام کے کھانے پر وہ ڈائننگ ٹیبل پر نظر آتی اور پھر رات سے صبح تک پڑھتی رہتی، وقار صاحب کی طبیعت پھر سے ہلکی ہلکی خراب رہنے لگی تھی، وہ ہانیہ کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے، اب وہ اکثر بابا سائیں سے بات چیت میں مصروف رہتے تھے سب کسی نہ کسی بڑی خبر کے منتظر تھے، پھر ایک دن دھماکہ ہی ہو گیا، جب اسے بتایا گیا کہ اگلے جمعے کو اس کا نکاح جہانزیب سے کیا جا رہا ہے، اس کے اوسان خطا ہو گئے، وہ فوراً وقار احمد کے پاس پہنچی۔

"پاپا میرا آخری سال ہے، میری پڑھائی کتنی ٹف ہے میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔" وقار صاحب نے جواب میں اسے جو کچھ بتایا اسے سن کر وہ سن ہو کر رہ گئی۔

"بیٹا! یہ ابھی صرف نکاح ہے، جب تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہو جائے گا تو رخصتی کر دیں گے، بیٹا مجھے لگتا ہے میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے، میرے دل میں ہر وقت ہلکا ہلکا درد رہتا ہے، نجانے کب بلاوا آ جائے، بیٹا اگر میرے سامنے کم از کم نکاح ہو جائے تو میری روح مطمئن ہو جائے گی۔" انہوں نے اسے چپ کروا دیا تھا، وہ ان کے سینے سے لگ کر کتنی دیر تک روتی رہی تھی، پھر اماں بی نے آ کر اسے چپ کروایا، وہ اپنے کمرے میں آ کر کتنی دیر تک گم صم بیٹھی رہی تھی، یہ احساس ہی کتنا تکلیف دہ تھا کہ خدانخواستہ اس کے پاپا...... "اللہ نہ کرے" اس نے جھرجھری لی۔

اگلے دن سے وہ اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گئی، اسے نہیں پتہ تھا کہ نکاح کے لئے کیا تیاریاں ہو رہی تھیں، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے؟ نکاح والے دن بھی اس کا بہت ضروری پریکٹیکل تھا، وہ تقریباً تین بجے گھر آئی تو پتہ چلا کہ دونوں پھپھو اپنی فیملیوں کے ساتھ آ چکی تھیں۔

"چلو آؤ ہانیہ مہندی لگا دوں۔" سلمٰی اسے اندر کمرے میں لے گئی، شام تک حویلی بقعہ نور بن چکی تھی، تائی اماں اس کے لئے بہت خوبصورت جوڑا لائی تھیں، سنہری اور سرخ رنگ کا حسین امتزاج تھا، لہنگے اور دوپٹے پر چوڑا چوڑا کام تھا، لہنگے اور دوپٹے پر لگے زمرد جوڑے کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے، زیورات میں بھی زمرد استعمال کیا گیا تھا، وہ دلہن بن کر بہت خوبصورت لگ رہی تھی، اس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی، اسے نہیں پتہ چلا کہ کب نکاح ہوا ہے اور کب فوٹو سیشن شروع ہوا ہے، جب جہانزیب اس کے برابر آ کر بیٹھا تو تمام کزنز کی نوک جھونک بھی شروع ہو گئی، پیچھے لڑکیاں کھڑی تھیں، دولہا کے

ساتھ سارے لڑکے کھڑے تھے، دونوں طرف سے دلچسپ فقرے بازی شروع ہو چکی تھی۔

"یار سب مل کر دعا کرو صبح تیز بارش ہو جائے۔" مہران بولا۔

"کیوں کیوں؟" ساری لڑکیاں کورس میں پکاریں۔

"پھر میں بھی گاڑی بھگاتا ہوا سڑک پر لے جاؤں گا شاید مجھے بھی کوئی دلہن مل جائے۔" سب نے زوردار قہقہہ لگایا، سب ان دونوں کی پہلی ملاقات کے سین سے واقف تھے جب جہانزیب گاڑی بھگاتا ہوا لے جا رہا تھا اور راستے میں ہانیہ مل گئی تھی، کافی دیر تک ہنگامہ جاری رہا، پھر دونوں پھپھو آئیں اور انہوں نے ہانیہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا، تھوڑی دیر بعد پھوپھا، بابا سائیں کے پاس چلی گئیں، ہانیہ کے پاس سلمٰی تھی تب ہی دروازے پر دستک ہوئی، سلمٰی نے دروازہ کھولا تو جہانزیب تھا۔

"جی فرمائیے کوئی کام تھا؟" سلمٰی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، بس اپنی بیگم سے ملنا تھا؟" اس نے بھی اسی کی طرح مسکراتے ہوئے بتایا۔

"مگر بابا سائیں کی طرف سے اجازت نہیں ہے لہٰذا سوری۔" سلمٰی نے دروازہ بند کرنا چاہا تو جہانزیب نے دروازہ تھام لیا۔

"سلمٰی میری بہن صرف دس منٹ اور پھر بابا سائیں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے صرف دس منٹ، میں باہر کھڑی ہوں۔" سلمٰی باہر چلی گئی اور جہانزیب اندر آ گیا، ہانیہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی، اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"آپ یہاں کیوں آ گئے؟" الفاظ اس کے لبوں سے سرسرائے۔

"تمہیں دیکھنے۔" اس نے اسے محویت سے دیکھتے ہوئے کہا، اس کی لمبی پلکیں خود بخود جھک گئیں، وہ اس روپ میں اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ جہانزیب کے دل کو کچھ ہونے لگا، چند لمحے عجیب سا سکوت کمرے میں طاری رہا، جہانزیب بے خود سا ہونے لگا وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا، ہانیہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، جہانزیب نے سرعت سے خود کو سنبھال لیا۔

"کم آن ہانیہ، یار اب تم میری بیوی ہو۔" اس نے بے چارگی سے کہا، تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی اور سلمٰی اندر آ گئی۔

"چلیں جہانزیب بھائی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔"

"سلمٰی تھوڑا سا ٹائم اور......"

"ہرگز نہیں، چلیں باہر، ورنہ ابھی بابا سائیں کو بتا کر آتی ہوں۔" جہانزیب کے جانے کے بعد سلمٰی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو، جہانزیب بھائی ایسے ہی دیوانے نہیں ہو رہے تھے چلو چینج کر لو۔" ہانیہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

وقار احمد تو جیسے ہانیہ کے نکاح کے انتظار میں تھے، نکاح کے ہفتے بعد ہی وہ درد اٹھا تو وہ جانبر نہ ہو سکے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، ہانیہ ان کے بعد مزید تنہا ہو گئی تھی، اگرچہ سب اس کا بہت خیال رکھتے تھے مگر وہ اپنے آپ میں گم رہنے لگی تھی، مومنہ اور نوشی اس کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتیں، آخر آہستہ آہستہ وہ اپنے روزمرہ معمول کی طرف لوٹنے لگی، اس نے پھر راتوں کو جاگ کر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

پھر ایک دن اس پر ایک انوکھا انکشاف ہوا

کہ وہ رات کو جب تک جاگتی ہے تب تک جہانزیب بھی جاگتا رہتا ہے جیسے ہی اس کے کمرے کی لائٹ آف ہوتی ہے جہانزیب کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہو جاتی تھی، یہ احساس ہی کتنا خوشگوار تھا کہ کوئی اس کی اتنی پرواہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ رات بھر جاگتا رہتا ہے، اس رات وہ اسائنمنٹ تیار کر رہی تھی جو انسانی کھوپڑی سے متعلقہ تھی، کھوپڑی تو اسے اس کا کلاس فیلو شہریار دے گیا تھا، کام شروع کرنے سے قبل اس نے ولید کو بلوا کر کھوپڑی ٹیبل پر رکھوائی تھی، پہلے ایسے سارے کام وہ وقار صاحب سے کرواتی تھی، اب ان کے بعد اکثر وہ کبھی ولید تو کبھی امجد سے یہ کام کرواتی تھی، اس دن وہ رات کے تین بجے فارغ ہوئی تو سوچنے لگی کہ اب اس کھوپڑی کو لفافے میں کون ڈالے، وہ سوچتے سوچتے دروازہ کھول کر باہر آ گئی، راہداری سنسان پڑی تھی، سب کے کمروں کی بتیاں گل تھیں، صرف جہانزیب کے کمرے کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی، اب جہانزیب سے کیسے کہے، یہی سوچ کر اس نے خود ہی کھوپڑی کو لفافے میں ڈالنے کا ارادہ کیا، مگر کھوپڑی کی طرف اٹھتے ہوئے ہاتھ کھوپڑی نہ اٹھا سکے، ہمت ہی نہیں ہوئی، خوف سا محسوس ہو رہا تھا، اسے پسینہ اپنے مساموں سے پھوٹتا محسوس ہوا، آخر فیصلہ کر ہی لیا، جھٹکے سے دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئی، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جہانزیب کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

"اب دروازہ کیسے کھلے؟ کیسے دستک دوں؟ کہیں کوئی غلط مطلب ہی نہ سمجھ لے۔" اسی شش و پنج میں تھی کہ آخر ہمت کر کے ہولے سے دستک دے ہی دی، ذرا دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا، جہانزیب اسے کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا، ہلکے گلابی رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس شانوں پر ہم رنگ دوپٹہ پھیلائے وہ کنفیوژ سی کھڑی تھی، بالوں کو سمیٹ کر کیچر اس طرح لگا ہوا تھا کہ چہرے کے دونوں طرف لٹیں لہرا رہی تھیں، وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو اپنی انگلی کے گرد پلیٹ رہی تھی۔

"خیریت؟" جہانزیب نے محویت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا، اسے اس کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی، تب ہی اس کی نگاہیں اٹھ ہی نہیں پا رہی تھیں، اس کی لمبی ریشمی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔

"وہ...... دراصل...... میرے کمرے میں۔" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

"جی ہاں مجھے پتہ ہے آپ کے کمرے میں ایک عدد کھوپڑی ہے اور اب آپ چاہتی ہیں کہ کوئی آئے اور اسے اٹھا کر لفافے میں ڈالے اور آپ کی نظروں سے اسے دور کر دے کیونکہ آپ کو ڈر لگتا ہے۔" اس نے مزے سے ساری حقیقت اسے بتائی۔

"آپ کو پتہ ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جہانزیب کا دل چاہا کہ ان جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جائے۔

"چلیے۔" اس نے خود کو سنبھالا اور خود کو اس کے سحر سے آزاد کرنے کے لئے اس کے کمرے کی جانب بڑھ گیا، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی آ گئی، جہانزیب نے احتیاط سے کھوپڑی کو اٹھا کر لفافے میں منتقل کیا پھر اسے ڈبے میں پیک کر دیا اور ایک طرف رکھ دیا۔

"جی اور کوئی حکم؟" اس نے ہانیہ کے سامنے خم ہوتے ہوئے پوچھا، اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ویسے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ

جاتے ہوئے اس کے پاس کھڑا ہوا۔

"تم جب تک جاگتی رہتی ہو، میں بھی جاگتا رہتا ہوں۔"

"آپ کیوں جاگتے ہیں؟" اس نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

"کیونکہ تمہیں ڈر جو لگتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" یہ احساس اسے سرشار کر گیا کہ وہ اس کی خاطر جاگتا رہتا تھا۔

"وقار چچا نے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"پاپا نے؟" وہ دنگ رہ گئی۔

"جی ہاں، انتقال سے دو دن پہلے انہوں نے مجھے بلا کر کچھ باتیں کی تھیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی اور میں نے ان کو تسلی دی تھی کہ جب تک ہانیہ سو نہیں جایا کرے گی میں بھی جاگتا رہوں گا۔" ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"پاپا کو میرا کتنا خیال تھا۔" اس کے آنسو بہنے لگے، جہانزیب نے بے اختیار اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"میں ہوں نہ، اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تھینک یو جہانزیب، آئی پرامس اب میں کبھی نہیں ڈروں گی۔" اس نے ممنونیت سے کہا اور جہانزیب مسکراتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

اس کی پڑھائی اپنے اختتامی مراحل کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ بہت دل لگا کر پڑھ رہی تھی، اکثر وہ پڑھنے بیٹھتی تو فجر کی اذانیں اسے کتاب بند کرنے پر مجبور کرتیں، جہانزیب کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ ڈیڑھ بجے کے ٹائم اپنے کمرے میں موجود الیکٹرک کیٹل میں کافی بناتا اور ایک کپ کافی ہانیہ کو اس کے کمرے میں دے آتا، ہانیہ بھی اب اس کا رات کو انتظار کرتی، وہ ہانیہ کو سمجھاتا کہ اتنی محنت کے ساتھ آرام بھی ضروری ہے مگر ہانیہ پر ایک ہی دھن سوار ہوتی کہ میں کلاس سے پیچھے نہ رہ جاؤں، اس کے پیپر شروع ہو چکے تھے، وہ اپنا کھانا پینا تک بھول گئی تھی، نہ اس کو دن کا ہوش تھا، نہ رات کا، بس وہ ہوتی اور اس کی کتابیں، نوشی اور مومنہ دونوں اس کا حتی الامکان خیال رکھ رہی تھیں، کچھ دنوں سے تو اسے کھانا بھی کمرے میں بھجوا دیا جاتا تھا اور اکثر وہ کھانا بھول جاتی تھی۔

نوشی اور مومنہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے سامنے کھانا کھلاتیں، جس دن وہ آخری پیپر دے کر آئی اس دن وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی، ایک بوجھ تھا جو اتر چکا تھا، وہ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی، مگر اب اس کی تھکن اس پر غالب آ رہی تھی، وہ جب سے پیپر دے کر آئی تھی، سو رہی تھی اس نے اسے سونے دیا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ کتنے دن اور راتوں سے اپنی نیند پوری نہیں کر پا رہی تھی، رات کو جہانزیب نے اس کے کمرے پر دستک دی مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا، وہ دروازہ دھکیل کر اندر گیا، وہ رائٹنگ ٹیبل پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہانیہ!" اس نے پکارا مگر وہ نہیں اٹھی۔

"ہانی...... ہانی۔" اس نے اس کا شانہ ہلایا تو اس کا سر تھوڑا اور آگے چلا گیا، جہانزیب نے اسے سیدھا کیا اس کا چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"او مائی گاڈ، اتنا تیز بخار۔" اس نے اسے کھڑا کیا اور سہارا دے کر اس کے بستر تک لایا، اسے لٹا کر کمبل اوڑھا دیا اور روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی باؤل میں ڈال کر اس کے پاس لے آیا، اپنا رومال اس نے پانی میں بھگو کر پٹی اس کی

جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دی، پانی کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہی وہ کسمسائی، جہانزیب کافی دیر تک پٹیاں کرتا رہا، اس کا بخار کم ہو چکا تھا، جہانزیب ٹشو سے اس کا چہرہ صاف کر رہا تھا تب اس نے آنکھیں کھولیں اور جہانزیب کو خود سے اتنا قریب بیٹھا دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی، اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا مگر جہانزیب نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"لیٹی رہو، کوئی بات نہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا، ہانیہ نے اطمینان سے آنکھیں موند لیں، تھوڑی دیر بعد جہانزیب ہاتھ میں ٹرے تھامے اندر آ گیا۔

"چلو اٹھو تھوڑا سا کچھ کھا لو پھر دوا کھا لینا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں نہ۔"

"جی ہاں اور اب اگر تم نے کچھ کھا کر دوا نہ لی تو میں......"

"تو کیا...... آپ مجھے ڈانٹ نہیں سکتے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"مائی گاڈ۔" اس نے سر تھام لیا۔

"میں ڈانٹ نہیں رہا احمق لڑکی، کچھ کھاؤ اور دوا لو تاکہ بخار اترے۔"

☆☆☆

ہسپتال بن کر تیار ہو چکا تھا اور ہانیہ کا ہاؤس جاب بھی شروع ہو چکا تھا، اس کی ڈیوٹی ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں تھی، بابا سائیں اب ہسپتال میں مشینری اور دوسرے آلات منگوا رہے تھے، دو منزلوں پر مشتمل ہسپتال جدید ساز و سامان سے لیس ہو چکا تھا، بابا سائیں ہسپتال بنوا کر مطمئن ہو چکے تھے انہیں سکون حاصل ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنے گاؤں میں ایک ہسپتال آخر کار قائم کر ہی دیا تھا، ہسپتال میں انہوں نے ڈاکٹر بھی تعینات کر دیئے تھے، ہسپتال کا نام انہوں نے اپنے بیٹے وقار احمد کے نام پر رکھا تھا۔

"وقار احمد (وقف) ہسپتال۔" وہ ہسپتال بنوا کر اتنے مطمئن ہوئے کہ ایک رات جب سوئے تو صبح نہیں اٹھے، ان کے پیچھے پیچھے تین ماہ کے وقفے سے اماں بی بھی ان سے ملنے روانہ ہو گئیں، حویلی ویران ہو گئی تھی، یو اے ای کا آفس سنبھالنے منصور تایا روانہ ہوئے، جبکہ سنگاپور کا بزنس محمود تایا نے سنبھالا، حویلی پر اب طاہرہ تائی اور منزہ تائی کا مکمل راج ہو گیا تھا، اب ان کے رویے بھی ہانیہ کے ساتھ بدلتے چلے گئے، ان کے سلوک سے ہانیہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں ہوئی کہ جہانزیب کے ساتھ اس کے نکاح پر تائی نے راضی خوشی ہامی نہیں بھری تھی بلکہ بابا سائیں کے سامنے انکار کی جرأت نہیں تھی، ورنہ وہ نوشی کو بہو بنانا چاہتی تھیں، ہانیہ گھریلو سیاست سے بہت خوفزدہ ہو گئی تھی اس نے جب جہانزیب سے اپنے دل کے خدشات بیان کیے تو اس نے اس کا وہم گردانا، جہانزیب اسے دل و جان سے چاہتا تھا، وہ اسی بات سے مطمئن تھی۔

☆☆☆

ہانیہ کی ڈیوٹی بہت سخت تھی، اکثر اسے نائٹ شفٹ بھی کرنی پڑتی، اگر کبھی شہر میں ہنگامے یا فسادات ہوتے تو ڈاکٹروں کو فوراً کال کر لیا جاتا چاہے وہ ابھی ڈیوٹی آف کر کے آئے ہوں، اگر ہانیہ کو دوبارہ کال کیا جاتا تو طاہرہ فوراً اعتراضات کی بھرمار کر دیتیں اور اسے بہانے بنا کر عیش کرنے کے طعنے دیتیں، ایسے ہی ایک دن جب شہر میں اچانک ہی بم دھماکہ ہوا تو ہانیہ کو بھی دوبارہ ہسپتال پہنچنا پڑا۔

شہریار اسے لینے آیا تھا، اس کے جانے کے بعد منزہ اور طاہرہ نے شہریار کے حوالے سے

باتیں شروع کر دیں اور رات کو جب جہانزیب آیا تو انہوں نے اس بات کو غلط رخ دے کر اسے ہانیہ سے بدظن کرنا چاہا، مگر جہانزیب شہریار کو اچھی طرح جانتا تھا، اس لئے طاہرہ کی دروغ گوئی کو سن کر خاموش رہ گیا طاہرہ سمجھیں کہ جہانزیب ان کا ہم خیال بن چکا ہے، اس دن کے بعد بھی وہ گاہے بگاہے ہانیہ کی غیر موجودگی میں جہانزیب کے کانوں میں شہریار کے بارے میں زہر گھولتی رہتی تھیں تا کہ وہ ہانیہ سے بدظن ہو جائے مگر جہانزیب ماں کے سامنے تو خاموش رہتا تھا تا کہ گھر کی فضا خراب نہ ہو، وہ جانتا تھا کہ اگر ابھی اس نے ہانیہ کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہا تو ماں اور چچی دونوں پیچھے پڑ جائیں گی، اس کے ساتھ ساتھ وہ ہانیہ کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا جب بھی وہ طاہرہ کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی تو وہ اپنی باتوں سے اس کے دل سے سارے خدشات نکال دیتا، اکثر وہ آفس سے اٹھ کر اس کے ہسپتال آ جاتا، ہانیہ کے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ اس کی بہت اچھی سلام دعا تھی، شہریار کے ساتھ تو خاص طور پر جہانزیب کی کافی بے تکلفی تھی، اکثر وہ ہسپتال کے ایم ایس ارشد خان سے شارٹ لیو لے کر ہانیہ کو لنچ پر لے جاتا تھا، جہانزیب بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ گھر میں موجودہ حالات کا ازالہ ہوتا رہے۔

☆☆☆

جہانزیب بہت پریشان تھا، طاہرہ نے شہریار کا نام اس دن تکمل کر لیا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا، وہ سب ناشتے کی میز پر تھے، ہانیہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہی تھی اس کو دیر ہو گئی تھی، اس نے عجلت میں بیگ اپنا اوورآل اور اسٹیتھوسکوپ اٹھایا ہی تھا کہ مومنہ بول پڑی۔

''ہانیہ ناشتہ تو ٹھیک طرح کر لو۔''

''بس مومنہ ہو گیا دیر ہو چکی ہے ڈاکٹر ارشد ڈسپلن کے سخت پابند ہیں۔'' وہ جلدی جلدی بولی، اتنی دیر میں اس کا موبائل بول اٹھا، اس نے سنا۔

''ہاں ہاں شہریار پہنچ رہی ہوں، مجھے پتہ ہے آج ڈاکٹر ارشد نے آپریشن کرنا ہے۔'' اس نے موبائل آف کر کے بیگ میں ڈالا اور سب کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر کو لپکی۔

''دیکھ لئے اس کے لچھن؟'' انہوں نے جہانزیب کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یا اب بھی تجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' طاہرہ نے ہاتھ میں پکڑا گلاس زور سے ٹیبل پر پٹخا۔

''کیا ہو گیا ہے امی؟ یہ کس طرح سوچنے لگی ہیں آپ؟'' جہانزیب کو امید نہیں تھی کہ وہ سب کے درمیان اس مسئلہ کو چھیڑ دیں گی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تو اتنا بے غیرت ہو جائے گا، تجھے نظر نہیں آتا، وہ تیری ناک کے نیچے کیا کھیل کھیل رہی ہے؟ ہر وقت ہر جگہ شہریار، شہریار کرتی رہتی ہے۔'' ان کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''مما!'' جہانزیب چلا اٹھا۔

''آپ ہانیہ پر تہمت لگا رہی ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ کہہ کر رہی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تیرا، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ یا میں اندھی ہوں مجھے نظر نہیں آتا کہ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے۔'' وہ غصے سے بے قابو ہو رہی تھیں۔

''مما بس کر دیں، پھر کبھی بات کریں گے۔'' اس نے ان کے غصے کو دبانا چاہا۔

''کب بات کریں گے؟ جب پانی سر سے

اونچا ہو جائے گا تب بات کرے گا۔" جہانزیب کھڑا ہو گیا۔

"مما مجھے دیر ہو رہی ہے، آج میری اہم میٹنگ ہے، آپ ناشتہ کریں اور مما ہاں......" وہ جاتے جاتے رکا، سب اس کو دیکھ رہے تھے۔

"ہانیہ میری منکوحہ ہے میری بیوی ہے عزت ہے وہ میری، برائے مہربانی آئندہ اس کی کردار کشی کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہے، کیونکہ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے شہریار کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں، لہٰذا آئندہ مجھے یہ مسئلہ اس گھر میں سنائی نہ دے تو بہتر ہے۔" جہانزیب کے لہجے میں چھپی دھمکی انہیں واضح سنائی دی۔

"ورنہ کیا کرے گا تو؟" وہ کھڑی ہو گئیں، مومنہ، نوشی، سعد، امجد اور شاہ زیب بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے، البتہ منزہ بیٹھی رہیں۔

"ورنہ مما میں ہانیہ کو لے کر اس حویلی سے چلا جاؤں گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور بریف کیس اٹھا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

آفس پہنچ کر اس نے اپنے پاپا محمود احمد کو فون کر کے یہاں کے حالات بتا کر مشورہ مانگا، انہوں نے اسے فی الفور سنگاپور آنے کا کہا، ان کے خیال کے مطابق وہ طاہرہ کی نظروں سے دور ہو گا تو وہ خاموش ہو جائیں گی، پھر چند ماہ کے بعد ہانیہ کا ہاؤس جاب ختم ہو جائے گا تو وہ ان کی رخصتی کروا دیں گے، ان کے خیال کے مطابق صرف تھوڑے دنوں کی بات اور رہ گئی ہے لہٰذا جہانزیب نے سنگاپور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

"تمہارے ہاؤس جاب ختم ہونے میں کتنا عرصہ رہ گیا ہے؟" جہانزیب نے اس سے پوچھا۔

"کیوں بھئی؟ بے چینی کس بات کی ہے؟"

وہ دونوں سمندر کے کنارے چل رہے تھے، بارش کا موسم تھا، جہانزیب اس کے ہسپتال پہنچ گیا اور ایم ایس ارشد خان سے اس کا ہاف ڈے کروا کر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسے سمندر پہ لے آیا۔

"بس ہانی اب انتظار نہیں ہوتا؟" اس نے ہانیہ کو شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کر لیا، بارش ہو رہی تھی، سمندر کا ساحل نسبتاً سنسان تھا۔

"سو ہانی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سنگاپور چلا جاؤں اور پاپا کو یہاں واپس بھیج دوں۔" اس کے جانے کا سن کر ہانیہ بے طرح پریشان ہو گئی، حویلی میں حالات تو اس کے خلاف جا رہے تھے ایک جہانزیب کا سہارا تھا، اب یہ بھی جانے کی بات کر رہا ہے۔

"لیکن جہانزیب تم جاؤ گے تو میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی پھر تائی اماں تو بالکل بدل گئی ہیں۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ رونا شروع کر دیتی۔

"کم آن ہانیہ، کچھ نہیں ہوتا، جیسے ہی تمہارا ہاؤس جاب ختم ہو گا، میں واپس آ جاؤں گا۔" اس نے اس کے گیلے بالوں کو اس کی پیشانی سے ہٹایا۔

"اگر میں نہیں گیا تو ہانی کچھ بھی ہو سکتا ہے، پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔"

"لیکن جہانزیب۔" اس کے لب کپکپائے، اس کے رکے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ گئے، پاپا کے بعد جہانزیب کا ہی تو سہارا ہے اب کیا ہو گا، جہانزیب نے اس کے رخساروں پر بہتے گرم آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کیے اور اسے خود سے قریب کر لیا، وہ بے آواز روئے جا رہی تھی۔

☆☆☆

رات دو بجے ہانیہ نے جہانزیب کا دروازہ بجایا، جہانزیب نے دروازہ کھولا اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

"جہانزیب پھر تم نے کیا سوچا؟ کیا واقعی جا رہے ہو؟" وہ ابھی تک خوفزدہ تھی۔

"ہاں ہانی۔" اس نے اس کا بازو پکڑا اور اندر لے گیا اور دروازہ بند کردیا۔

"میں کل دوپہر کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔"

"جہانزیب مت جاؤ، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح ڈری ہوئی تھی وہ اسے تسلی دینے گا، اچانک لائٹ چلی گئی، جہانزیب نے سائیڈ ٹیبل سے لائٹر اٹھا کر جلایا، لائٹر کے ننھے سے شعلے میں اسے ہانیہ روتی ہوئی نظر آئی، اس کا دل کٹ گیا، اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ہانیہ کو کیسے سمجھائے کہ اس کا جانا کتنا ضروری ہے، اس نے اسے خود سے قریب کرلیا، پھر نجانے کیسے لائٹر کا شعلہ بجھ گیا مگر اس نے بجھنے سے پہلے ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ہانیہ رونا بھول چکی تھی مگر جہانزیب اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

"جہانزیب!" گہری تاریکی میں ہانیہ کی سرگوشی گونجی۔

"اب کیا ہوگا؟" جہانزیب بھی پریشان ہو چکا تھا، یہ کیا ہوگیا تھا؟

☆☆☆

سب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، جہانزیب کو سنگاپور گئے کافی دن ہو چکے تھے، طاہرہ تائی جو پہلے محتاط لفظوں میں اس پر طنز اور طعنوں کے تیر چلاتی تھیں، اب جہانزیب کے جانے سے کھل کر اس کے ماں باپ کے ماضی کے حوالے سے زہر افشانی کرتی تھیں، ایسے میں ہانیہ کے لئے کتنا مشکل ہوتا تھا پلٹ کر جواب دینے سے خود کو روکنا، وہ کوشش کرتی تھی کہ طاہرہ سے اس کا سامنا کم از کم ہو، مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ بھی ناممکن تھا، ایسے میں وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرتی، نوشی اور مومنہ ہر ممکن کوشش کرتی تھیں کہ طاہرہ بیگم کی زیادتیوں کا ازالہ ہوتا جائے، مگر طاہرہ بیگم جہانزیب کے نہ ہونے سے کھل کر سامنے آگئی تھیں، ہانیہ نے جیسے ہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا اس کے معدے میں گرہیں سی پڑیں اور اسے ابکائی آگئی اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور واش روم کی طرف بھاگی، منزہ اور طاہرہ دونوں ہکا بکا اسے جاتا دیکھتی رہیں، طاہرہ کو قدرت نے اپنی مانی کا موقع دے دیا تھا ان کی رسی دراز کردی گئی، وہ اٹھیں اور آگ بگولا ہوتی ہوئی اس کے پیچھے گئیں وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی، وہ زینہ چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ گئیں اور دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئیں، وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی، انہوں نے لپک کر اسے بالوں سے پکڑا اور اٹھا دیا۔

"کیوں ری حرافہ! یہ کیا گل کھلایا ہے تو نے؟" انہوں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔

"یہ کرتوت ہیں تیرے، ان کاموں کے لئے تو ہسپتال میں جاتی ہے بول۔" انہوں نے دوسرا تھپڑ اس کے رسید کیا۔

"تائی اماں! یقین کریں......" اس نے بولنا چاہا مگر انہوں نے بولنے نہ دیا اور اسے گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئیں۔

"نکل ابھی میرے گھر سے، جہانزیب کو پتہ چلا تو وہ تو کھڑے کھڑے تجھے شوٹ کردے گا۔" وہ اسے کھینچتی ہوئی باہر کی جانب لے جارہی تھیں، نوشی اور مومنہ دونوں ہکا بکا کھڑی تھیں،

مومنہ آگے بڑھی اس نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر انہوں نے زوردار دھکا دیا مومنہ دور جا کر گری، ہانیہ کو وہ زبردستی کھینچتی ہوئی نیچے لا رہی تھیں نوشی حق دق کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، پھر جیسے ہانیہ کی چیخوں سے اسے ہوش آیا وہ بے اختیار دوڑ کر آگے بڑھی مگر منزہ نے اسے دبوچ لیا۔

"تائی اماں چھوڑیں ہانی کو۔" وہ ماں کی گرفت سے خود کو آزاد کراتے ہوئے چیخی۔

"کیسے چھوڑوں اس بد ذات کو، آوارہ، فاحشہ......" وہ مسلسل اسے مار رہی تھیں، ان پر جنون طاری ہو چکا تھا۔

"تائی اماں آپ میرا یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس کے منہ سے آواز بھی بمشکل نکل رہی تھی، مومنہ دوبارہ ماں کی طرف لپکی مگر طاہرہ اسے گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لے آئی۔

"تائی اماں مجھے نہ نکالیں، میں آپ کی بہو ہوں، تائی اماں آپ جہانزیب کو آنے دیں پھر جو وہ فیصلہ کرے مجھے منظور ہوگا۔"

"ہاں جہانزیب کو آنے دوں تاکہ وہ تیری بوٹیاں کردے۔" وہ مار مار کر تھک چکی تھیں تبھی پاؤں سے چپل اتار چکی تھیں، ہانیہ کو چھڑاتے میں مومنہ کو بھی دو تین چپلیں پڑ چکی تھیں اور اسے تائی اماں سے ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرائی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی، پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور اسے باہر دھکا دے دیا اور دروازہ بند کرلیا، کسی ملازم کی جرأت نہیں ہوئی سامنے آنے کی، وہ دھکا لگنے سے باہر جا گری، اس کا چہرہ سوج چکا تھا، دوپٹہ نجانے کہاں گر گیا تھا، وہ نیم بے ہوش پڑی تھی، پھر اس نے کسی کی آواز سنی۔

"ارے یہ تو بی بی صیب ہے۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ سن سکی، وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی، جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو مالی بابا کے گھر میں پایا، وہ سخت شرمندہ تھی، مگر آفرین ہے ان دونوں میاں بیوی نے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا، اس کی بیوی گل بانو نے اس کے زخموں پر دوا لگائی، اسے گرم دودھ میں ہلدی ملا کر پلایا، صبح تک اس کے درد اور سوجن میں واضح کمی تھی اس نے کچھ فیصلے کیے اور شیر خان اور گل بانو کو اپنے پاپا کے گھر چل کر رہنے کے لئے راضی کرلیا، حویلی میں اس کا سارا سامان رہ گیا تھا، جس میں اس کا موبائل بھی تھا وقار احمد کے گھر آ کر اس نے جہانزیب سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر اس کا سیل فون مسلسل بند تھا، شام تک فیصل، مہران اور ولید بھی وقار احمد کے گھر آ چکے تھے فیصل نے بہت کوشش کی، کہ ہانیہ ان کے ساتھ چلے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اب جب تک جہانزیب نہیں آجاتا، وہ اس گھر میں ہی رہے گی اور پھر وہ اکیلی نہیں تھی، شیر خان، اور گل بانو دونوں اس کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

جس رات طاہرہ نے ہانیہ کو گھر سے نکالا اس رات کو جہانزیب کا سنگاپور میں کار سے حادثہ ہوگیا، جس میں اسے کافی چوٹیں آئیں اور اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے، وہ بے ہوش ہو چکا تھا، اسے جب دوبارہ ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک ہسپتال کے کمرے میں پایا، اس کے سامنے ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں کھڑی تھیں۔

"آپ اب کیسے ہیں؟" ڈاکٹر نے انگلش میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل جواب دیا، تب اچانک اسے یاد آیا کہ وہ تو سنگاپور آیا ہوا ہے، اس نے اٹھنا چاہا مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔

"لیٹے رہیں آپ، ابھی آپ کا جسم ایکسر

سائز اور فزیوتھراپی سے حرکت کے قابل ہوگا؟'' نرس نے کہا۔

''مگر میں نے گھر اطلاع کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''میں پاکستان میں رہتا ہوں، میں کب سے یہاں ہوں میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔'' وہ فکر مند ہو چکا تھا، سنگاپور پہنچ کر اس نے ابھی تک اطلاع بھی نہیں دی تھی، ہانیہ ناراض ہو جائے گی وہ میرے جانے سے کتنی پریشان تھی۔

''آپ کو یہاں دس ماہ انیس دن ہو چکے ہیں؟'' نرس نے اس کے سر پر دھماکہ کیا۔

''دس ماہ انیس دن۔'' اس کے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔

''آپ کو یاد ہے کہ آپ کی کار کو حادثہ پیش آیا تھا۔'' نرس نے پوچھا۔

''جی ہاں، مجھے یاد ہے کہ میں کار چلاتا ہوا جا رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک کار نے بے قابو ہو کر میری کار پر چڑھائی کر دی مگر مجھے یہ نہیں یاد کہ مجھے اتنے دن ہو گئے ہیں۔'' وہ حیران پریشان تھا۔

''ابھی آپ کو مزید تقریباً تین ماہ اور لگیں گے چلنے پھرنے کے قابل ہونے کے لئے، مگر آپ پریشان نہ ہوں، آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

☆☆☆

فیصل اپنے آفس میں بیٹھا کوئی فائل چیک کر رہا تھا، جب اسے ایک انجان کال موصول ہوئی، تھوڑے بے توقف کے بعد اس نے کال موصول کر لی دوسری طرف جہانزیب کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔

''فیصل بھائی میں جہانزیب ہوں۔''

''جہانزیب تم ٹھیک تو ہو نہ۔'' وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''کہاں تھے اتنے عرصے سے، یار تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔'' جواب میں اس نے رک رک کر ساری بات بتا دی۔

''فیصل بھائی میں نے ہانیہ سے بات کرنی ہے اس کا موبائل شاید آف ہے۔'' ہانیہ کے ذکر پر فیصل نے گہری سانس لی۔

''یار ہانیہ کا نمبر چینج ہو چکا ہے اس کا موبائل وہیں حویلی میں رہ گیا تھا۔''

''کیا مطلب ہانیہ حویلی میں نہیں ہے۔'' وہ گھبرا گیا۔

''تو ایسا کر یہ ہانیہ کا نمبر لکھ پھر تفصیل سے بات کریں گے۔'' اس نے اسے ٹال دیا، جہانزیب بری طرح پریشان ہو چکا تھا، کہیں اس کی مسلسل گمشدگی سے گھبرا کر ہانیہ نے عدالت سے خلع تو نہیں لے لی ورنہ وہ حویلی کیوں چھوڑتی، اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ہانیہ کا نمبر ڈائل کیا، چوتھی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو۔'' ہانیہ کی مترنم آواز سنائی دی جہانزیب خاموش رہا۔

''ہیلو۔'' ہانیہ نے دوبارہ کہا۔

''ہیلو ہانیہ!'' جہانزیب نے بمشکل کہا، اس کی آواز اتنی مدہم تھی کہ وہ بمشکل سن پائی۔

''جہانزیب!'' وہ چلائی۔

''تم جہانزیب ہو۔'' اس کی آواز میں نمی گھل چکی تھی۔

''بولتے کیوں نہیں؟ بولو جہانزیب بولو نہ۔'' وہ اب اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

''میں آ رہا ہوں ہانی، میں ائیر پورٹ پر ہوں، تم کہاں ہو؟'' اس نے اپنے آنسوؤں کو

صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا کے گھر۔''

''میں ایک گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

وقار احمد کے گھر کے سامنے ٹیکسی آ کر رکی، جہانزیب نے اپنا سامان باہر نکالا اور کرایہ دے کر ٹیکسی کو رخصت کیا، وہ گیٹ کے سامنے کھڑا تھا، سب کچھ پہلے جیسا تھا صرف ایک بورڈ کا اضافہ ہو چکا تھا، جس پر بڑے بڑے حروف میں ''ڈاکٹر ہانیہ جہانزیب احمد'' لکھا تھا، ہانیہ کے نام کے ساتھ اپنا نام جڑا دیکھ کر ایک انجانی سی مسرت اس کے رگ و پے میں سما گئی اس نے بیل دی، تھوڑی دیر بعد گیٹ کھل گیا گیٹ کھولنے والا شیر خان تھا، وہ اسے یہاں وقار احمد کے گھر دیکھ کر حیران رہ گیا اس سے مل کر وہ اندر کی طرف بڑھا، برآمدے میں اسے ہانیہ نظر آئی، یہ اس ہانیہ سے کہیں مختلف تھی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا، اس قدر کمزور اور لاغر، اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، ہانیہ کی نظر جہانزیب پر پڑی وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھی، جہانزیب نے اپنا سامان وہیں چھوڑا اور اس کی طرف بڑھا، ہانیہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے جہانزیب مجھے اکیلا چھوڑ کر؟'' اس نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''تمہیں پتہ تھا نہ کہ مجھے ڈر لگتا ہے، تم پھر بھی چلے گئے۔'' وہ اس کے سینے سے لگی زار و قطار روئے جا رہی تھی۔

''جہانزیب مجھے تائی اماں نے حویلی سے نکال دیا۔'' جہانزیب کو جھٹکا لگا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے اسے خود سے الگ کر کے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''کیوں ہانی کیوں؟'' وہ چلایا، ہانیہ جیسے ہوش میں آئی اور اسے لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی اور دھیرے دھیرے اپنے اوپر بیتنے والے ظلم کی داستان اپنے آنسوؤں کے اضافے کے ساتھ سناتی چلی گئی، جہانزیب کی حالت عجیب ہو رہی تھی، اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، ہانیہ کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

''اس کی اماں اتنا بڑا ظلم کیسے کر سکتی ہیں؟'' اس کا دماغ پھٹنے والا تھا، اس کی صحت ابھی ویسے بھی اس قابل نہیں تھی۔

''جہانزیب!'' ہانیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں اسے پکارا۔

''میں ابھی تک پل صراط پر کھڑی ہوں، تمہارے بغیر میں اس پر سے نہیں گزر سکتی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جہانزیب آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے جہانزیب کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا، جہانزیب اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا، یہاں جھولے میں چھوٹا سا بچہ لیٹا تھا، جہانزیب بے اختیار آگے بڑھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر اس ننھے منے وجود کو اٹھا لیا وہ سے دیکھتا رہا وہ ہو بہو جہانزیب کی تصویر تھا، جہانزیب نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہے چلے جا رہے تھے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ہانیہ کو اپنے شانے سے لگا لیا، وہ دونوں زار و قطار رو رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دینا ہانیہ، تم پر اتنا ظلم ہوا اور میں وہاں ہوش و حواس سے بیگانہ ہسپتال میں پڑا رہا، میں دس مہینے تک بے ہوش رہا، مگر ہانیہ اب میں آ گیا ہوں، اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے، شدت غم سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ہانیہ کو سرکاری ہسپتال میں ملازمت مل گئی تھی اور جہانزیب نے اپنا بزنس دوبارہ سنبھال لیا تھا، وہ حویلی نہیں گیا تھا، نہ اپنی ماں سے ملا تھا، بس اس نے اور ہانیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وقار احمد کے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، وقار احمد کے گھر کے اوپر والے پورشن میں انہوں نے رہائش اختیار کی اور نچلے پورشن کو کلینک میں بدل دیا، جہاں ہانیہ شام میں بیٹھتی تھی، جہانزیب نے اپنے بیٹے کا نام اذان رکھا تھا اور اذان کا عقیقہ نہایت شاندار کیا جس میں اس نے سب کو بلایا سوائے اپنی ماں کے، طاہرہ پہلے بیٹے کی گمشدگی سے پریشان رہتی تھی پھر جب اس کے آنے کی خبر ملی تو دوبارہ جی اٹھی مگر بیٹے نے تو اس سے ملنا ہی گوارہ نہ کیا، وہ آہستہ آہستہ بیمار پڑتی گئی، اب اسے ہانیہ پر کیے گئے ظلم یاد آ رہے تھے، کیسے انہوں نے اسے رات کے وقت گھر سے مار مار کر نکالا تھا، اب اکثر انہیں خواب میں ہانیہ نظر آنے لگی، وہ بدحواس ہو کر اٹھ کر بیٹھ جاتیں، کبھی جہانزیب کو پکارتیں تو کبھی ہانیہ سے معافی مانگتیں، آخر ایک رات انہیں فالج کا زبردست اٹیک ہوا اور ان کا جسم مفلوج ہو گیا، وہ چارپائی پر پڑی رہتیں تھیں، مومنہ دن رات ان کی خدمت کر رہی تھی، مگر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی جا رہی تھیں، ہانیہ نے جہانزیب کو مجبور کیا کہ وہ تمہاری والدہ ہیں لہٰذا تمہیں ان کی خدمت کرنی چاہیے جہانزیب صبح و شام ان کی خبر گیری کے لئے جانے لگا، ایک بار جہانزیب جب ان کے پاس بیٹھا تھا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے اشارے سے اسے کچھ کہنا چاہا جہانزیب اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

"ہاں مما! کیا ہوا؟ پانی دوں آپ کو؟" اس نے پوچھا انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ہانیہ!" ان کی زبان سے بدقت نکلا، جہانزیب سن ہو کر رہ گیا، وہ کبھی ہانیہ کو مجبور نہیں کرے گا یہاں آنے کے لئے۔

"بھیا میں بھابھی کے پاس چلی جاتی ہوں۔" مومنہ نے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا، اس نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"بھابھی صرف ایک دفعہ چلی چلیں۔" مومنہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"صرف ایک بار چل کر دیکھ لیں کہ ان کا کیا حال ہے؟" وہ بے بسی کی تصویر بنی تھی۔

"آپ ایک بار چل کر ان سے مل لیں، وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"مومنہ تم روؤ نہیں میں ضرور آؤں گی۔"

مومنہ کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک گم صم رہی، جہانزیب آچکا تھا۔

"کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟" اس نے اسے جو سوچوں میں گم دیکھا تو ہاتھ اس کے آگے لہرایا۔

"آں ہاں۔" وہ چونکی۔

"تم کب آئے؟"

"بس مجھے تو آئے کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"اچھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"آج مومنہ آئی تھی۔" اس نے اسے بتایا۔

"اچھا۔" جہانزیب جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، مومنہ کے ذکر پر نظریں چرا گیا۔

"اس سے میں نے کہا ہے کہ میں ضرور آؤں گی اور اب......"

"کیا اب؟" جہانزیب نے بے تابی سے بات کاٹی، وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی،

جہانزیب بے چین تھا اس کا فیصلہ جاننے کے لئے۔

"جہانزیب!" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"ہوں۔"

"میں نے سوچا ہے کہ پاپا کا گھر فی الحال کلینک کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ہم لوگ حویلی چلتے ہیں۔"

"کیا؟" جہانزیب بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، کیونکہ تائی اماں کو اس وقت ہماری ضرورت ہے۔" جہانزیب نے محسوس کیا اس کی آنکھوں میں نمی ہے۔

"نہیں ہانی اگر تمہارا دل یہ فیصلہ مجبوری میں کر رہا ہے تو میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"نہیں جہانزیب!" اس نے اپنے لب کچلے۔

"میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں چھوڑ دیا ہے اب جو اس کی رضا ہو اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی رضا یہی ہے کہ ہم بیمار تائی اماں کی خدمت کریں۔" وہ اس کی جانب مڑی۔

"اور تم پریشان مت ہو، میں مجبور ہو کر یہ فیصلہ نہیں کر رہی بلکہ میں ہنسی خوشی حویلی جانا چاہتی ہوں۔" اس نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"مجھے تم پر فخر ہے ہانیہ۔" جہانزیب نے ہانیہ کا ہاتھ تھام کر جذب کے عالم میں کہا۔

☆☆☆

ہانیہ نے اذان کو گود میں اٹھا رکھا تھا، جبکہ جہانزیب کے ہاتھ میں بیگ تھا، حویلی کے دروازے پر قدم رکھتے ہی اسے بے اختیار اپنا بے جان جسم زخموں سے چور، دروازے پر پڑا نظر آیا، اس نے جھرجھری لی، جہانزیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، اس نے چونک کر اسے دیکھا، جہانزیب نے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا، لان سے گزر کر وہ گھر کے اندر داخل ہوئے، سامنے سیڑھیاں تھیں، اس نے خود کو ان سیڑھیوں سے نیچے گھسیٹتے ہوئے دیکھا، اس کی آنکھیں جلنے لگیں، بے اختیار اس نے اپنی آنکھیں مسل کر صاف کیں، سامنے نوشی اور مومنہ کھڑی تھیں، وہ بیگ سمیت انہیں اندر آتا دیکھ کر حیران رہ گئیں، مومنہ خوشی کے مارے ہانیہ سے لپٹ گئی۔

"بھابھی آپ آ گئیں، آپ کتنی اچھی ہیں۔"

"تائی اماں کہاں ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آئیے اندر کمرے میں ہیں۔" وہ خوشی سے بے حال ہو رہی تھی، اندر کمرے میں اپنے پلنگ پر تائی اماں لیٹی ہوئی تھیں، ان کی آنکھیں بند تھیں، ہانیہ ان کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"تائی اماں!" اس نے دھیرے سے پکارا، آواز سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"ہانیہ!" ان کی بے حد کمزور آواز سنائی دی۔

"تو...... آ...... گئی۔" انہوں نے بہت مشکل سے جملہ پورا کیا۔

"جی تائی اماں۔" وہ بولی۔

"اور دیکھیں یہ آپ کا پوتا۔" اس نے ننھے اذان کو ان کے سامنے کیا، انہوں نے بے اختیار اذان کو دیکھا ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"اور آپ کو پتہ ہے کہ اذان اب آپ کے پاس رہنے آیا ہے۔" وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو، مگر جہانزیب جانتا تھا وہ ایک کرب سے گزر رہی ہے، تائی اماں سخت

شرمندہ تھیں، وہ اس سے نظر نہیں ملا پا رہی تھیں، ان کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے، ہانیہ نے اپنی انگلیوں سے ان کے آنسو صاف کیے، مومنہ ان کے لئے سوپ لے آئی، ہانیہ نے سوپ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اذان کو اسے تھما دیا اور چمچے سے انہیں سوپ پلانے لگیں، محمود تایا کو اس کے آنے کا پتہ لگا تو وہ وہیں آگئے، اس کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے، ان کے برابر جہانزیب بیٹھا ہوا تھا۔

"بیٹا!" انہوں نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔

"جی تایا ابا۔" ہانیہ نے طاہرہ کا منہ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹا! جو کچھ ہوا، یقین جانو اگر میں یہاں ہوتا تو نہیں ہوتا، مگر جو کچھ اس احمق عورت نے کیا، اس کا صلہ یہ بھگت رہی ہے، تمہارا جہانزیب سے نکاح ہوا تھا اور پھر بیٹا پھر غلطیاں ہماری بھی ہیں، جبکہ تم دونوں ایک ہی گھر میں تھے تو ہمیں رخصتی کر دیتے یا نکاح ہی نہ کیا ہوتا، مگر بیٹا اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، تم نے جتنی اذیت برداشت کی اس کا مداوا تو کبھی نہیں ہو سکتا، لیکن بیٹا اگر تم اپنے دکھ بھلا کر یہاں آ ہی گئی ہو تو اب میری ایک بات اور مان لو۔" انہوں نے بڑے مان سے کہا۔

"جی تایا ابو! آپ بولیے۔" ہانیہ نے کہا۔

"بیٹا! اس عورت کو معاف کر دو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ باندھے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں تایا ابو؟" وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے۔

"میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی، معاف کرنے والی ذات تو صرف خدا کی ہے، آپ اس طرح کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔" اس نے ایک نظر تائی اماں کو دیکھا، ان کے آنسو کسی آبشار کی طرح بہہ رہے تھے۔

"ہانیہ...... مجھے...... معاف...... کر...... دے۔" انہوں نے بمشکل کہا۔

"تائی اماں ایسی بات نہ کریں۔" ہانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ہانیہ!" جہانزیب بولا، ہانیہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہانیہ! صرف ایک بار کہہ دو کہ تم نے مما کو معاف کر دیا۔" اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ ہانیہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی تائی اماں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"تائی اماں!" اس کی آواز آنسوؤں سے لبریز تھی۔

"میں نے آپ کو اللہ کی رضا کی خاطر معاف کیا۔"

"جیتی رہو میری بچی، اللہ تمہیں خوش رکھے۔" محمود احمد اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اب اپنا ہسپتال بھی تم نے سنبھالنا ہے۔" تایا ابو نے کہا۔

"بابا سائیں کی بڑی آرزو تھی کہ اس ہسپتال کو تم سنبھالو۔"

"تایا ابو!" ہانیہ ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹا بول۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تایا ابو! کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے۔" اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"بیٹا جتنا بھروسہ وقار کو تجھ پر تھا اس سے کہیں زیادہ مجھے تجھ پر یقین ہے اور تجھے ایک بات بتاؤں، تیری تائی بھی جانتی تھی کہ جیسی بات وہ تجھ سے منسوب کر رہی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر بیٹا جب انسان حسد اور غرور کا شکار ہو کر دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو پھر وہ اسی طرح قدرت کی گرفت میں آتا ہے، اسے تیرا یہاں آنا پھر بابا سائیں کا تیرے لئے پیار اور سب سے بڑی بات ہسپتال بنوا کر تیرے حوالے کرنا ہضم نہیں ہو رہا تھا، مگر بیٹا تو ساری پچھلی باتیں بھلا دے اور میں جانتا ہوں کہ یہ بہت مشکل ہے مگر بیٹا یہی بہت ضروری ہے کہ تو نے اگر معاف کر ہی دیا ہے تو کھلے دل سے کر اور بابا سائیں کے اس خواب کو پورا کر کہ اس ہسپتال کو تو سنبھالے۔" وہ اس کے جھکے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے، ہانیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"اور ہانیہ!" جہانزیب بولا، ہانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں ہوں نہ ہر قدم پر تمہارا ساتھ دینے کے لئے۔" مومنہ اذان کے لئے اندر آ چکی تھی اس کے ساتھ نوشی بھی تھی۔

"اور ہانیہ ہم لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں۔" نوشی نے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے اپنی محبت کا احساس دلایا۔

"اور بھئی کوشش کرنا، ہسپتال میں ہی ہم لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کروا لینا، کیونکہ حویلی میں تو ہم بور ہو جائیں گے۔" مومنہ نے ہانیہ کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں ہسپتال میں آپاؤں کی سیٹ بھی تو خالی ہو گی، مومنہ کو اس سیٹ کے لئے بک کر لیتے ہیں۔" جہانزیب نے برجستہ کہا، سب ہنس پڑے۔

"بھائی!" مومنہ نے منہ بنایا۔

"کیا میں آپا لگتی ہوں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"نہیں بھئی! ہماری مومنہ اب اتنی بھی گئی گزری نہیں کہ آپا کی سیٹ آپ اسے دیں، اسے آپ سوپر کی پوسٹ بھی دے سکتے ہیں۔" امجد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"امجد بھائی!" اس نے غصے سے پاؤں پٹخے، ہانیہ مسکرا دی۔

"نہیں بھئی مومنہ کو تنگ نہ کرو، مومنہ تم میرے آفس میں میرے ساتھ بیٹھنا، ٹھیک ہے۔" مومنہ خوش ہو گئی۔

"چلو ہانیہ، امی سو چکی ہیں، آؤ ہسپتال کا چکر لگا آئیں۔" جہانزیب نے کہا اور وہ سب ہسپتال کی طرف چلے۔

ہسپتال کی عمارت پر وقار احمد کے نام کا لگا بورڈ دیکھ کر ہانیہ کی روح تک سرشار ہو گئی، اسے لگا جیسے صحرا میں چلتے چلتے کسی مہربان بادل نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا ہو، اسے محسوس ہوا جیسے وقار احمد یہیں کہیں اس کے آس پاس کھڑے مطمئن سے اسے دیکھ رہے ہیں وہ بے اختیار مسکرا دی۔

☆☆☆

مہک فاطمہ

آج آٹھ مارچ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے خاص تقریب منعقد کی تھی جس میں اسے مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تا کہ اسے دوسری عورتوں کے سامنے رول ماڈل کے طور پر پیش کیا جائے۔

پورا ہال رنگ وروشنیوں سے جگمگا رہا تھا کئی چینلو کے نمائندے کیمرے منعکس کیے ایک طرف کھڑے تھے اور صحافی اپنے کام میں مصروف، پرکشش انداز میں بولتی میزبان کی آواز سارے ہال میں گونج رہی تھی۔

”بنت حوا کی کہانی ازل سے لے کر آج تک ہر منفرد انداز میں بیان کی جاتی رہی ہے وہ ہستی جو محبت اور وفا کی پیکر ہے جو سراپا ہمت و حوصلہ ہے جو قربانی دے کر طمانیت محسوس کرتی ہے یہ سارے اوصاف ہمیشہ سے ہی عورت کی فطرت کا تعارف رہے ہیں، لیکن آج کی عورت شعور اور کامیابی کی جس منزل پہ کھڑی ہے عورت کا یہ مقام ہم سب کے لئے باعث فخر ہے۔“

ناولٹ

”آج کا دن عورت کی اہمیت، عظمت اور حقوق کو تسلیم کرنے کا دن ہے آج کا دن ہر عورت ہر لڑکی کو چاہے وہ کسی بھی حیثیت میں ہے، خراج تحسین پیش کرنے کا دن ہے۔“

پھر مہمان خصوصی کو اسٹیج پر بلانے سے پہلے اس کے قابل ستائش عوامل کا ذکر کیا گیا، وہ یونیورسٹی میں سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی چیئر پرسن تھی اس کے علاوہ وہ کئی رفاعی عوامل میں اس کی خدمات قابل قدر تھیں۔

میزبان نے نہایت مودٔب انداز میں اسے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، ہلکے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس، سر کو پیشانی تک ڈھانپے وجود کے گرد چادر لپیٹے وہ بڑے باوقار انداز میں چلتی ہوئی ڈائس کے سامنے جا کھڑی ہوئی کئی کیمروں

کی روشنیاں اس پر مرکوز ہوگئیں۔

''میڈم پہلے تو ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ آپ جو ماشاء اللہ اتنے قابل فخر مقام پہ ہیں آپ خود کن لوگوں کو اپنی بیک پاور سمجھتی ہیں؟'' میزبان نے پہلا سوال کیا۔

''پہلے تو میں آپ کی Orgnization کی انتہائی ممنون ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے اتنی عزت سے مدعو کیا۔'' اس کا متاثر کن لب ولہجہ پر اعتماد نسوانی آواز پورے ہال میں گونجی۔

''آج میں جس مقام پہ بھی ہوں اس میں میری فیملی کا خاص کر میرے والد اور شوہر کا کردار ناقابل فراموش ہے جن کی سپورٹ نے مجھے ایک کامیاب اور پر اعتماد عورت کے روپ میں ڈھالا۔''

اس کے باپ کی آنکھوں میں جتنا فخر تھا اس نے اتنا زندگی کے کسی مقام پر بھی محسوس نہیں کیا تھا اور شوہر کے چہرے پر توصیف و تفاخر بھری مسکراہٹ تھی۔

''آج کے دن کے حوالے سے آپ لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟'' میزبان لڑکی نے رائے طلب انداز میں پوچھا وہ مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ حاضرین کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آج کے دن کے حوالے سے میں آپ لوگوں کے سامنے نہ تو کوئی تقریر کرنا چاہتی ہوں نہ ہی کوئی نصیحت میں صرف آپ لوگوں، خاص کر مرد حضرات سے چند باتیں عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

''لڑکیوں کو بوجھ سمجھ کر احساس کمتری میں مبتلا مت ہونے دیں، عورت کی پہلی طاقت اس کے گھر کے مرد ہوتے ہیں آپ خواہ باپ ہیں بھائی ہیں یا شوہر ہیں عورت کو پورا اعتماد اور تحفظ فراہم کریں، پھر دیکھیں کہ بنت حوا کیسے آپ کی طاقت بن کر ابھرتی ہے۔'' تالیوں کے شور کے سبب وہ چند لمحے خاموش ہوئی۔

''میں آج ایک بات واضح کرنا چاہتی ہوں کہ عورت کی ترقی کا مقصد مردوں کو چیلنج کرنا یا انہیں اپنا ماتحت کرنا ہرگز نہیں، ضرورت صرف تھوڑی سی وسیع النظری کی ہے، گھر کی لڑکیوں کو ایک جائز حد تک آزادی ضرور دیں ایسا نہ ہو کہ وہ بے جا پابندیوں اور گھٹن کا شکار ہو کے کوئی غلط قدم اٹھا لیں یا ان کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جائیں۔'' تالیوں کے شور نے گفتگو میں توقف پیدا کیا۔

''اگر عورت کو گھر اور معاشرے میں پورے حقوق ملنے لگیں تو آپ یقین جانیے ہمیں کسی این جی او کسی سیمینار کی ضرورت نہیں پڑے گی ہماری بچیاں اس ملک کی بیٹیاں آپ کی عزتیں ہیں اگر آپ انہیں احترام اور مقام نہیں دیں گے تو کون دے گا؟''

سامعین کے ذہنوں پر ایک سوالیہ نقطہ چھوڑ کر اس نے اپنی گفتگو کو اختتام کیا اور میزبان سے شکریہ وصول کرتی اسٹیج سے اتری۔

حاضرین کے درمیان بیٹھی اس کی ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے گویا آج اسے ایک کامیاب ماں ہونے کا ثبوت مل گیا۔

تقریب کے اختتام کے بعد اس نے فرط جذبات سے بیٹی کا ماتھا چوم کر اسے گلے سے لگایا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازا پھر اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ گھر آ گئی، راستے بھر بھی وہ لوگ تقریب کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے گھر آ کے اس نے لباس تبدیل کیا پھر نماز عشاء کے بعد شکرانے کے نوافل ادا کیے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر بیڈ پہ نیم دراز ہوگئی نیند اس کی آنکھوں سے

کوسوں دور تھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ناں کہ انسان جب کسی بہت بڑی خوشی سے لوٹتا ہے تو اس پہ ایک عجیب سی اداسی چھانے لگتی ہے۔

اس نے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا لی شہر دل میں کئی یادیں ماضی کے پردوں سے جھانکنے لگیں۔

ماضی کبھی انسان کے اندر سے مٹتا نہیں ہے، یہ اہمیت جتاتا رہتا ہے، کبھی کبھی خوشی اور مسرت سے مسرور کرتا ہے، تو کبھی کسی پرچھائی سے مضطرب، واقعی ...... بیٹیاں اتنا بھی بوجھ نہیں ہوتیں جتنا انہیں سمجھ لیا جاتا ہے، آج اس کے دل و دماغ نے پورے یقین کے ساتھ یہ بات تسلیم کی۔

''کاش آج وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی تو......'' اس کے اندر سے اک ہوک اٹھی، پھر نا جانے کب اس کا ذہن کتاب ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔

☆☆☆

حوریہ کی پیدائش پہ گھر میں رونے دھونے کا ایک کہرام برپا ہوا بہنیں اس لئے روئیں انہیں بھائی کی خواہش تھی باپ غم و غصے سے بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا رشتہ داروں نے کڑوی کسیلی باتیں کر کے ہمدردی کا اظہار کیا پھر سال بھر بعد بیٹے کی پیدائش پہ سب کی مرادیں بر آئیں سب کو دلی اطمینان اور خوشی میسر آئی۔

حوریہ کی پیدائش پہ گھر میں جو سماں بندھا تھا اکثر بڑی بہنیں بڑے پر مزاح انداز میں اس کا تذکرہ حوریہ کے سامنے کرتیں اور خود سمیت سب کے ردعمل پہ خوب قہقہے لگاتیں حوریہ کے چہرے پہ ہلکی سی خفت آمیز مسکراہٹ پھیل جاتی پھر وقت ساتھ اس کے تحت الشعور میں یہ احساس شدت سے ابھرنے لگا کہ وہ اک ان چاہی غیر ضروری اور کمتر ہے جس کا وجود زبردستی مسلط کیے جانے کے سوا کچھ نہیں، اگر وہ نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا نتیجتاً انہی سوچوں کی بنا پہ اسے یہ محسوس ہوتا کہ وہ زندگی میں نہ کبھی سر اٹھا کے جی سکے گی نہ اپنے حقوق کے لئے بول سکے گی۔

سلائی کڑھائی میں دلچسپی کے باعث اس نے کم عمری میں ہی سلائی مشین سنبھال لی تھی اور کافی حد تک اپنا خرچ خود اٹھانے لگی تھی بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے ووکیشنل ڈپلومہ کیا وہ ساری بہنیں ہی گھریلو امور میں طاق سگھڑ اور مزاجاً با ادب اور شائستہ تھیں جبکہ حوریہ طبعاً کم گو حساس اور شاکر الطبع ہونے کے ساتھ شکل و صورت میں بھی اسم با مسمیٰ تھی۔

دھیرے دھیرے سب بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں لیکن حوریہ کی شادی نا جانے کیوں تاخیر کا شکار ہو رہی تھی اول تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ آتا نہ اگر آتا بھی بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ایک طرف گھر والوں کی پریشانی دوسری طرف لوگوں کی باتیں الگ، آخر کار سب کی دعائیں رنگ لائیں اور حوریہ کو اچھا گھر، اچھا بر مل گیا۔

حوریہ بھرے پورے سسرال میں بیاہی گئی چند ہی دن میں اس نے نرم مزاجی اور شائستہ اطوار سے سب کا دل موہ لیا سب سے بڑھ کر تو عمران اس پیکر حور کے دامن الفت کا اسیر ہوا۔

عمران گھر میں سب سے بڑا تھا اس کی دو بہنیں چھوٹی اور ایک بھائی تھا والد ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے مصروفیت کے لئے چھوٹی سی دکان بنا لی تھی عمران سرکاری عہدے پر فائز تھا۔

☆☆☆

حوریہ کی شادی کو سال بھر ہو چلا تھا لیکن اس کی طرف سے ابھی کوئی امید نہ تھی اب تو ساس بھی طعنے دینے لگی تھی حوریہ کو طرح طرح کے

واہمے ستانے لگے اس نے علاج معالجے کے علاوہ عبادتوں کا بھی سہارا لیا، التجاؤں بھرے سجدے لمبے ہونے لگے، دعاؤں کی شرف قبولیت کے نتیجے میں اس کی امید بھر آئی، تب اماں بی کی طرف سے ایک اور انوکھی سی خواہش کا برملا اظہار ہوا کہ انہیں پوتا ہی چاہیے، حوریہ نے ان کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دی وہ تو اسی خوشی سے ہواؤں میں تھی کہ ماں کا درجہ پانے والی ہے خوش تو عمران بھی بہت تھا، اس نے کسی خواہش کا اظہار تو نہ کیا، چاہتا بہرحال وہ بھی بیٹا ہی تھا۔

ایک خوبصورت سنہری، چمکیلی سی صبح تھی جب حوریہ اور عمران کے آنگن ایک صبح نور جیسی پری نے جنم لیا۔

"مبارک ہو آپ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔" نرس نے آ کے مسکراہٹ کے ساتھ بتایا عمران کے اندر پر خوشی کی لہر دوڑ گئی پدرانہ محبت سے آشنائی ہر مایوسی پہ حاوی ہو گئی جبکہ اماں بی کے چہرے پر زنجیدگی چھیل گئی۔

"چلو جی، پہلی ہی بیٹی، ابھی تو میرے بیٹے کے سر سے بہنوں کے بیاہنے کا بوجھ نہ اترا تھا کہ بیٹی کا بوجھ آن پڑا، ہائے ہماری قسمت۔" اماں نے دہائی دی۔

پھوپھیاں فروا اور فاریہ غیر متوقع خبر پا کے تھوڑی مایوس تو ہوئی لیکن اسی لمحے بھتیجی کو دیکھنے کے لئے پرجوش ہو گئیں۔

بچی کو دیکھتے ہی سب صدقے واری ہونے لگیں شاید یہ خون کی کشش کا اثر تھا کہ باقی سب کے دلوں سے بھی ملال کی دھند چھٹ گئی تھی۔

کچھ گھنٹے بعد حوریہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کے گھر آ گئی ممتا کے احساس سے اس کی رگ رگ میں خوشی اور سرور اتر آیا تھا اس لے بچی کے وجود میں اپنی زندگی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی بچی کا نام "ماہ نور" رکھا گیا۔

"نی مرجانی تجھے یہ ہمارا گھر ہی نظر آیا تھا اترنے کے لئے اسی گھر پہ نظر تھی تیری کمبخت۔" اکثر اماں بھی نور کو پیار کرتے ہوئے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتیں۔

"ارے اب ہی واپس چلی جا جہاں سے آئی ہے۔" اماں کے اس رویے سے حوریہ کا دل بے طرح سے مسلا جاتا، اسے یوں لگتا جیسے اس کے دل پہ پتھر پڑ رہے ہوں، لو بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے لاڈ پیار بگارنے کا جس میں کوسنے اور تحقیر ہو، جلتی کڑھتی حوریہ یہ سوچ کر رہ جاتی، کئی بار ڈھکے چھپے الفاظ میں حوریہ کو بھی بیٹی کی ماں ہونے کی بناء پر تضحیک کا نشانہ بنایا گیا لیکن اس کی تسلی کے لئے یہ حدیث پاک ہی کافی تھی۔

"اولاد میں پہلے لڑکی کا پیدا ہونا ماں باپ کے لئے خوش بختی ہے۔"

لیکن نا جانے کیوں معاشرے کا رویہ اس خوش بختی کو بدبختی بنانے پہ تلا ہوا تھا۔

انہی دنوں حوریہ کی دونوں نندوں کی شادیوں کی تاریخیں طے ہوئیں شادیوں کا خرچ کافی حد تک عمران کو ہی اٹھانا پڑا تھا اماں بی تو اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر خرچ کر رہی تھیں ورنہ میانہ روی اختیار کر کے یہی سب کچھ بڑی خوش اسلوبی سے ہو سکتا تھا حتیٰ کہ حوریہ سے بھی بری میں دیا گیا زیورات کا سیٹ لے کر فروخت کر دیا گیا، ایک بار عمران ہی اماں کو کسی بات پہ اعتدال میں رہنے کا کہہ بیٹھا جواباً اماں بی بگڑ پڑیں ان کے قیاس میں یہ حوریہ کی ہی چال بازی کا کرشمہ ہوگا جو ان کے بیٹے کے ذریعے ان کی مرضی میں مداخلت کر رہی ہے۔

"دو ہی تو بہنیں ہیں تمہاری، کون سا چھ چھ بیٹھیں ہیں جو دو جوڑوں رخصت کر دوں،

کنگالوں کی بیٹیوں کی طرح۔" یہ تیر تاک کے حوریہ کی طرف اچھالا گیا تھا جو سیدھا اس کے دل میں پیوست ہوا تھا درد آنسو بن کے آنچل میں جذب ہونے لگے ماں کا اشارہ کس طرف تھا یہ سمجھنے کے بعد عمران کو شرمندگی سی ہوئی، اس نے ایک چور نظر سامنے کچن میں کھڑی حوریہ کی پشت پہ ڈالی اور پھر انجان بن کے نظر انداز کر گیا۔

شادیوں کے موقع پہ تقریباً سارے ہی کپڑوں کی سلائی حوریہ کے ذمہ تھی اوپر سے گھر میں کاموں کی بھرمار، لیکن وہ ماتھے پہ شکن لائے بغیر سب کچھ سنبھالے ہوئے تھی، نور روتی تو وہ اسے گود میں اٹھا کے کام نمٹاتی رہتی جس پہ اماں تلملا کہ کہہ اٹھیں۔

"اسے اتار بھی دیا کرو کبھی گود سے کچھ نہیں ہو جائے گا اسے مر نہیں جائے گی یہ، بھلا لڑکیوں سے بھی اتنے لاڈ پیار کرتا ہے کوئی۔" حوریہ کا دل گہرے رنج میں ڈوب جانے لگا۔

☆☆☆

نور کی پیدائش کے ایک سال بعد پھر اس کی کوکھ میں امید کی کرن روشن ہوئی، وہ پہلے لڑکی کی پیدائش کے تلخ تجربے سے بہت کچھ سیکھ چکی تھی لہٰذا اب کی بار اس نے خدا کے حضور گڑگڑا کے اولاد نرینہ کے لئے دعائیں مانگی اماں بی نے بھی کہیں سے تعویذ لا کر اس کے گلے میں پہنا دیا۔

ایک خنک سرمئی سی شام تھی جب حوریہ کے آنگن میں اک شہزادہ اترا، جہاں عمران کا سر فخر سے بلند ہوا وہاں دادی اور پھوپھیاں بلائیں لیتی نہ تھکتی، دادا اور چچا کی خوشی بھی دیدنی تھی حوریہ تو خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی وہ خود کو مزید محفوظ تصور کرنے لگی، دو بچوں کی اوپر تلے پیدائش نے حوریہ کو جسمانی طور پر خاصا کمزور کر دیا تھا اور پھر ذمہ داریوں کا بوجھ الگ تھا انہی دنوں حوریہ کو اپنی بہن کی وفات کی خبر ملی جو ایک کم سن بیٹی کی ماں بھی تھی یہ خبر اس کی روح تک کو دہلا گئی، وہ صدمے سے کئی روز تک نڈھال و بے حال رہی۔

کچھ دن بعد گھر میں حوریہ کے دیور فاران کی شادی کی بات چیت ہونے لگی آج کل ان ماں بیٹوں نے گھر گھر جا کر لڑکیاں دیکھنے کا نیا شغل شروع کر رکھا تھا گھر آ کے لڑکی والوں کی خوب برائیاں کی جاتی اور بلند و بانگ قہقہے لگا کر محظوظ ہوا جاتا، کاموں میں مصروف، بے دخل سی حوریہ کو ان کی جاہلانہ باتوں سے سخت کوفت ہوتی۔

تیسری دفعہ حمل کے دوران وہ کافی ڈری ہوئی تھی نہ جانے اب کی بار قسمت کیا رنگ دکھائے؟ لیکن اماں بی تو جیسے دو پوتے خدا سے کنفرم کرا کے آئی تھیں انہیں جوڑی بننے کا پورا یقین تھا پھر وہی تعویذات اور عملیات کیے گئے حوریہ بھی اولاد نرینہ کے لئے قدرت کے آگے دست دراز کیے ہوئے تھی لیکن اس کی دعائیں شرف قبولیت نہ پا سکیں بلکہ مصلحت کی بنا پہ محفوظ کر لی گئیں۔

شفق سی رنگین شام تاروں بھری رات کے دامن میں گم ہو رہی تھی جب حوریہ کی گود میں دو اجالوں جیسی اگینے اتریں۔

نرس نے جب آ کے دو جڑواں بچیوں کی اطلاع دی تو عمران کا پورا وجود منجمد سا ہو گیا اور اماں بی کا چہرہ دھواں دھواں، وہ بے وجہ ہی نرس پر برس پڑیں۔

"ارے کیسی منحوس خبر سنا رہی ہو تم۔" جواباً نرس نے بھی غصے سے کھری کھری سنا دیں۔

"اے بڑھیا! سٹھیا گئی ہو گیا جو خدا کی رحمت کو نحوست کہہ کے دھتکار رہی ہو۔" بمشکل صالحہ (حوریہ کی بہن) نے دونوں کو خاموش

کروایا، لیکن اماں کے ناشکرے کلمات کا سلسلہ خودکلامی کی صورت میں جاری رہا۔

"نا جانے کیا قصور ہو گیا ہم سے اکٹھے ہی دو پتھر آن پڑے ہمارے سر پہ۔"

ہوش میں آنے کے بعد جب حوریہ نے دو بچیوں کا سنا تو اس کے چہرے پہ خوف، حسرت اور ملال کے کئی رنگ آکے ٹھہر گئے۔

"پھر کیا ہوا آپی! اگر بیٹیاں ہیں تو، خدا ان کی قسمت اچھی کرے۔" صالحہ نے صدق دل سے دعا دی اور حوریہ کو تسلی دینے لگی پھر دونوں بچیوں کو اس کے قریب لائی انہیں دیکھتے ہی حوریہ کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ پھوٹ پڑی ایک جیسی صورت کی دو گڑیوں کے چہرے اجالے بکھیر رہے تھے، اس نے بے ساختہ دونوں کو سینے سے لگالیا پھر باری باری چوما۔

حوریہ گھر آگئی اس نے بچیوں کے نام بھی خود ہی تجویز کیے "درشہوار" اور "درنایاب" کسی اور کے ان کے ناموں میں دلچسپی تھی بھی نہیں دادی کو تو ابھی تک جڑواں پوتیوں کی پیدائش پہ صبر نہ آرہا تھا وہ حسب عادت ناشکری اور تحقیر بھرے کلمات بڑبڑاتی رہتی، حوریہ ملامتی سی خاموشی میں مبتلا ان کی باتوں کے تھپڑ سہتی رہتی، ماہ نور کے ساتھ بھی دادی کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ تضحیک امیز ہو گیا تھا عمران بھی خاموش اور روکھا سا رہنے لگا اس نے کبھی بچیوں کو گود میں نہ اٹھایا تھا بس نگاہ شفقت ڈال کر ہی اس کی پدرانہ محبت کا فرض پورا ہوتا کچھ روز بعد ہانیہ کے ہاں سے بیٹا ہونے کی خوشخبری آئی تو اماں بی خوشی اور فخر سے نہال ہو گئیں پھر انہی دنوں عمران کے ایک دوست کے ہاں سے بھی بیٹے کی خوشی میں مٹھائی وصول ہوئی۔

رات جب حوریہ حسب معمول کام نمٹا کے کمرے میں آئی تو عمران بظاہر بچوں کے ساتھ بیڈ پہ نیم دراز تھا لیکن اس کے چہرے پہ افسردگی کے سایے نمایاں تھے اور دھیان کسی غیر مرئی نقطے پہ مرکوز، حتیٰ اسے حوریہ کے قریب آکے بیٹھنے کی خبر تک نہ ہو سکی۔

"کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے کیا؟" حوریہ کے لہجے کی نرماہٹ اپنائیت بھری فکرمندی کا احساس تھا۔

"ہوں۔" وہ چونکا اور سامنے سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا مجسم وفا کی نگاہیں متفکر اور جواب طلب تھیں نا جانے حوریہ کی ذات میں ایسی کیا تاثیر تھی کہ عمران بغیر کسی پس و پیش کے اپنا ہر احساس اس کے سامنے کھل کے بیاں کر دیتا کچھ لمحوں بعد وہ زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہر طرف سے بیٹوں کی پیدائش کی ہی خوش خبریاں مل رہی ہیں ایک ہمارے گھر ہی دو اکٹھی بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔" اس نے پہلی بار برملا اندر کے احساس، ملال کا اظہار کیا تھا حوریہ کا دل گہرے رنج و غم میں ڈوب گیا وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی شاید عمران پر بھی اس کے گھر والوں کے رویے کا اثر ہو ہی گیا تھا۔

دونوں کے درمیان کچھ پل خاموشی کی نذر ہو گئے جو بھی تھا عمران کی مایوسی اور شکستگی سے حوریہ بے چین ہو گئی تھی پھر بالآخر وہ خود کو سنبھال کے تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

"یہ تو خدا کی مرضی ہے بیٹے اگر دنیا کی زیب و زینت ہیں تو بیٹیاں آخرت میں ماں باپ کے لئے ڈھال اور قرب رسولﷺ کی ضمانت ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ بڑے مان بھرے فخر سے بولا اس کا دل مطمئن ہو گیا۔

لیکن حوریہ عمران کی اس رات کی جانے

والی باتوں اور رویے کے سبب کئی روز تک افسردہ رہی ویسے بھی لڑکیوں کی ماں ہونے کی بنا پر وہ خود کو بھاری ذمہ داریوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتی، ساس کے رویے نے تو وہ پہلے ہی بہت متاسف تھی، لیکن اب اس کا ذہن عجیب الجھاؤ سلجھاؤ کا شکار ہونے لگا۔

"کیا لڑکیاں واقعی ہی کمتر مخلوق اور بھاری بوجھ ہوتی ہیں۔" اس کے اندر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا غور و فکر نے سوچ کے کئی دروا کیے۔

"نہیں، خدا نے عورت کو بھی اتنی ہی محبت سے تخلیق کیا ہے جتنی محبت سے مردوں کے صنف کو بنایا ہے اس کی نظر رحمت تو دونوں کے لئے برابر ہے۔" اس کے اندر کی قوت خیر نے گواہی دی۔

"خدا عورتوں پہ مردوں سے زیادہ مہربان ہے۔" کسی وقت کی پڑھی حدیث پاک نور بن کے بروقت اس کے ذہن میں جگمگائی طمانیت خود بخود دل میں اترتی گئی۔

نور اب اسکول جانے لگی تھی دادی کے اور غیر مشفقانہ رویے کو بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی یہ سب دیکھ کے حوریہ کا اضطراب مزید بڑھنے لگتا۔

کسی بچی کے ساتھ ناروا اور تحقیر امیز سلوک اس کی شخصی نفسیات پہ ضرر رساں ثابت ہوتا ہے یہ بات حوریہ کے ذاتی تجربے میں تھی وہ اس معاملے میں چپ نہیں رہ سکی ایک روز باتوں باتوں میں اماں بی کو ان کے غلط رویے کا احساس دلا گئی تھی، نتیجتاً اماں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اسے تلخ کلامی کا نشانہ بننا پڑا۔

وہ اکثر یہ بات سوچتی کہ اس کی بیٹیوں کی تحقیر اگر اسے اتنا دکھ پہنچاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ عمل کتنا ناگوار گزرتا ہوگا جو انسان کو ستر ماؤں سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔

☆☆☆

وہ رات کا کھانا ٹیبل پہ لگانے میں مصروف تھی جب ایک طرف درشہوار اور درنایاب جھولے میں لیٹیں رو رہی تھیں نور جھولا جھلاتے ہوئے انہیں چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی دوسری طرف علی اس کے دوپٹے کا پلو پکڑے ضدی بنا کسٹرڈ کھانے کی فرمائش کر رہا تھا۔

"مما کسٹرڈ دو۔" وہ چلایا۔

"دو نہیں "دیں" کہتے ہیں۔" حوریہ نے سمجھایا لیکن خلاف عادت ڈپٹ کر، جواباً وہ اور زور سے رو کے شور مچانے لگا افراد خانہ کا خیال کرتے ہوئے حوریہ نے اسے پیار سے بہلایا۔

"دیکھو بیٹا! بہنیں رو رہی ہیں انہیں بھوک لگی ہے پہلے میں ان کے لئے دودھ بنالوں پھر آپ کو کسٹرڈ بنا دیتی ہوں۔"

"بچہ بے چارہ کب سے کسٹرڈ کے لئے رو رہا ہے اور تمہیں ان نحوسوں کے لاڈ اٹھانے کی پڑی ہے مر نہیں جائیں گی ان میں سے کوئی، اگر ذرا دیر کو دودھ نہ ملا تو، ہر وقت رونے چلانے کا شور برپا کیے رکھتیں ہیں، سکون نہیں رہنے دیا ان منحوسوں نے گھر میں۔" اماں بی بے تکان بولنے لگے حسب معمول۔

"موت بھی نہیں آتی انہیں۔" وہ بولتے ہوئے آپے سے باہر ہو چکی تھیں، عمران نے ایک بے بس سی نگاہ اماں پہ ڈالی جبکہ حوریہ کا دل جیسے کسی نے آہنی اوزار سے کاٹ کے رکھ دیا ہو، سلگتی تڑپتی ممتا جرأت مندی بے ساختہ بول اٹھی۔

"اماں بی! آپ میری بیٹیوں کے بارے میں ایسے مت بولا کریں مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" حوریہ کے لہجے میں دکھ کے ساتھ برہمی

بھی اُمڈ آئی۔

وہاں موجود تمام حضرات نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن بولا کوئی نہیں بہرحال اماں بی سیخ پا ہو چکی تھیں۔

وہ ہر طرح کی لعنت ملامت اور طعنوں تشنوں کے وار سہتی گئی آنکھوں سے درد کا پانی برستا رہا، یہ تضحیک وحقارت تو شاید بیٹیوں کی تقدیر ہوتی ہے اٹل، بے لچک، میرے انداز بغاوت سے یہ ریت ختم تھوڑی ہو جائے گی۔

وہ آنسو صاف کرتی کام میں مصروف تھی علی اور نور حیرت کم افسردگی اور دکھ سے ماں کو دیکھتے رہے اس نے درشہوار اور درنایاب کے لئے دودھ بنایا علی کو کسٹرڈ بنا کر دیا اور باقی کسٹرڈ فریزر میں رکھ دیا۔

وہ جب بچوں کے کمرے میں آئی تو علی کے سامنے کسٹرڈ کا پیالہ جوں کا توں پڑا تھا وہ خود بے نیازی سے ایک طرف بیٹھا تھا حوریہ کو حیرت نے آن گھیرا۔

”علی بیٹا! آپ نے کسٹرڈ نہیں کھایا۔“ حوریہ نے شفقت سے اس کے چہرے کو تھام کے پوچھا۔

”بس...... مما میرا دل نہیں چاہتا، نور آپی بھی نہیں کھا رہی، آپ رو کیوں رہی تھیں مما۔“ آخری بات کہتے ہوئے علی کی معصوم آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

”آپ کو دادی جی نے ڈانٹا ہے ناں، میں اور نور آپی ہم دونوں بھی دادی سے بات نہیں کریں گے۔“ اس کی آنکھوں میں ماں کے لئے خاموش سا دلاسا تھا۔

”ایسا نہیں کہتے بیٹا، وہ آپ کی دادی ہیں اور مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔“ اپنے خوش ہونے کا یقین دلانے کے لئے وہ کھل کے مسکرائی اور علی کو سینے سے لگا لیا اور دوسرے بازو کے حصار میں نور کو لیا ماں کے لاڈ بھرے بہلاوے سے کچھ دیر میں ہی وہ سب بھول بھال گئے حوریہ کا موڈ بھی خاصا بہتر ہو گیا۔

دوبارہ کچن میں آ کے اس نے فریزر سے کسٹرڈ کا ڈونگہ نکالا اور ڈائننگ روم کی طرف بڑھنے لگی جہاں فاران کے علاوہ باقی سب لوگ کھانے کے بعد میز کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے کچھ ”آوازوں“ پہ اس کے قدم تھمے اسے لگا جیسے موضوع گفتگو وہی ہے ابا جی (سسر) کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ارے فاخرہ بیگم! مجھے تو لگتا ہے ہم نے رشتہ لیتے وقت ہی بڑی بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے، بھئی پہلے یہ تو سوچتے کہ وہ خود چھ بہنیں ہیں لڑکیوں سے اس کی ماں کا آنگن بھرا پڑا ہے، وہ (حوریہ) بھی تو اسی عورت کی بیٹی ہے اولاد میں زیادہ لڑکیاں ہی پیدا کرے گی ناں، مجھے تو یہ موروثی اثر لگتا ہے۔“ ابا جی یوں بات کر رہے تھے جیسے بڑی تحقیق کے بعد کسی مرض کی وجہ دریافت کر لی ہو۔

”ہاں یہ بات تو ہم نے سوچی ہی نہ تھی۔“ اماں تائیدی انداز میں تھوڑی پہ انگلی رکھ کر بولی۔

”لیکن اس کی باقی سب بہنوں کے ہاں تو صرف بیٹے ہیں بلکہ سب کے دو تین بیٹے تو ضرور ہیں، ارے ایک یہی کمبخت ماری بیٹھی رہ گئی وہاں ہمارے گھر کے لئے۔“ اماں اوٹ پٹانگ انداز میں سوچتے ہوئے بولے جا رہی تھیں۔

”اگر ہمیں پہلے یہ بات معلوم ہوتی کہ حوریہ پر اولاد کے معاملے میں اس کی ماں کا موروثی اثر ہو گا تو ہم اس کا رشتہ کبھی نہ لیتے۔“ حوریہ سرتا پیر پتھر کی مانند ہو چکی تھی کوئی جہالت سی جہالت تھی جس کا مظاہرہ اس وقت اس کے

خلاف ہو رہا تھا اس نے ذرا سا آگے جھک کے عمران کے تاثرات دیکھے اس کے چہرے پہ اضطراب اور تحیر کی کیفیت واضح تھی جتنا غصہ اسے عمران کے ماں باپ پہ تھا اس سے کہیں زیادہ غصہ عمران پہ آیا جو پڑھا لکھا ہو کے حقیقت جاننے کے باوجود منہ میں گھنگھیاں ڈالے بیٹھا تھا وہ بولتا بھی کیوں؟ اول تو ماں باپ کے سامنے اس موضوع پہ کوئی بات کہنے کی ہمت نہ تھی دوسرا اس وقت سارا الزام حوریہ اور اس کی ماں پہ آ رہا تھا وہ کیوں خوامخواہ اپنے سر لیتا۔

حوریہ کا شدت سے جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کے انہیں مذہبی اور سائنسی ہر لحاظ سے مستند حقیقت بتائے کہ ”اولاد کی جنس کا تعین مرد کی طرف سے ہوتا ہے عورت کی طرف سے نہیں، عورت اس معاملے میں بے بس اور بے قصور ہوتی ہے۔“

وہ خود پہ لگے الزام کی تردید کرنا چاہتی تھی، وہ کچھ لمحے سوچتی رہی پھر نا جانے کیوں وہ ہمت نہیں کر پائی کچھ کہے بغیر ہی جلتے وجود کے ساتھ واپس پلٹ گئی کسٹرڈ کا ڈونگہ فریزر میں پٹخا اور کمرے میں آ گئی۔

”کیسے گنواروں سے پالا پڑا ہے۔“ وہ کڑھنے لگی۔

عمران کے کمرے میں آنے کے بعد وہ اس سے خود پہ لگے بے معنی سے الزام اور اس کی خاموشی کا شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکی، اس کا جواب حسب توقع تھا کہ ”وہ اماں بی اور ابا جی کو اس معاملے میں ”حقیقی نقطہ نظر“ کے مطابق قائل نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆

کافی مہینوں کے بعد وہ سب بہنیں ماں کے گھر اکٹھی ہوئی تھیں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے حوریہ نے اپنی ساس کے رویے اور اپنی پریشانی کا ذکر کر دیا، جواباً اس کی آپا صبیحہ بولیں جو خاصی شوخ اور شگفتہ مزاج تھیں۔

”حوریہ تم ایسی باتوں کو دل پہ مت لیا کرو، میری بہن یہ مسئلے مسائل تو ساری عمر ہی چلتے رہتے ہیں عورت کے ساتھ، جب پیدا ہوتی ہے تو شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں اس کی آمد پہ خوشی منائی جائے ورنہ تو سب کی یوں چپ لگ جاتی ہے جیسے زبردستی کا بوجھ لا دیا گیا ہو اور جوان ہونے پہ اگر شادی میں ذرا تاخیر ہو جائے تو تب لوگوں کی زبانوں کو قرار نہیں آتا اور خدا خدا کر کے شادی کے لئے بھی کوئی مل جائے تو شادی کے دوسرے ہی مہینے بچے کی متوقع آمد کے بارے میں تشویشی سوالات ہونے لگتے ہیں جیسے بچے ریڈی میڈ ملتے ہوں، اگر بچوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو جائے تو ایک نیا اعتراض کہ لڑکیاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں لڑکا کیوں نہیں؟“ صبیحہ آپا کا دلچسپ تجزیہ سن کر سب بہنوں کے قہقہے چھوٹ گئے۔

”حوریہ تمہارے معاملے میں تو بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔“ سعدیہ نے محظوظ سے انداز میں حوریہ سے کہا، حوریہ بہت دنوں بعد دل سے ہنسی تھی جنہوں کی باتوں سے خاصی ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد حوریہ کو ادراک ہوا کہ وہ ایک بار پھر تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہے اب کی بار تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خائف تھی جب اس نے اس بات کا ذکر عمران سے کیا تو وہ بدک کے بولا۔

”مجھے اور بچے نہیں چاہیے چار ہی کافی ہیں

میں مزید بچوں کو سپورٹ نہیں کرسکتا، تم کل ہی ڈاکٹر سے بات کرکے ختم کرواؤ یہ سب۔" اسے یوں حتمی اور بے لچک انداز میں کہا کہ جواباً حوریہ کے کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہ رہی وہ اندر ہی اندر کانپ گئی وہ مزید بچے سے نہیں درحقیقت "بیٹی" کی پیدائش سے خائف تھا حوریہ نے اگلے روز جب اماں بی سے یہ بات کی تو وہ بھڑک اٹھیں۔

"توبہ...... توبہ۔" اماں بی نے دونوں کانوں کو چھوا۔

"خدا کا خوف کرو کچھ شرم نہیں آتی تم دونوں کو کفران نعمت کرتے ہوئے۔" اماں بی کی آواز بلند ہونے لگی چھٹی کا دن تھا عمران بھی گھر پہ ہی تھا شیو بناتے ہوئے اس کے ہاتھ کچھ لمحے رکے پھر گہری سانس بھر کے دوبارہ اپنا کام کرنے لگا اماں بی برہمی سے بولتی جارہی تھیں روئے سخن عمران اور حوریہ دونوں ہی تھے۔

"مجھے تو خود ڈر لگتا ہے لیکن عمران......" سر جھکائے بیٹھی حوریہ دھیرے سے منمنائی۔

"میں بات کرتی ہوں اس سے گھر میں رزق ختم ہوگیا ہے جو غربت اور تنگدستی کے ڈر سے اولاد کو مارنے پہ تلا ہوا ہے آنے والا اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے اور اب کی بار لڑکا ہی ہو گا مجھے پورا یقین ہے۔" اماں بی کی آخری بات پر حوریہ کا دل دہلا گئی۔

☆☆☆

گھر میں اچانک فاران کی شادی کی بریکنگ نیوز چل پڑی وہ بھی جلد از جلد ہونا قرار پائی اس نے لڑکی پسند کر رکھی تھی اب رشتہ لے جانے کا حکم جاری کردیا تھا جس پہ اماں اور بہنیں برہم ہوگئیں ایک تو فاران کی من مانی انہیں ایک آنکھ نہ بھائی، دوسرا ان کی "بر" ڈھونڈنے کی کوشش دھری کی دھری رہ گئی۔

"اگر پہلے ہی کہیں عشق لڑا رکھا تو ہمیں بتا دیا ہوتا ہم خوامخواہ خجل خوار ہوتے رہے تمہارے رشتے کے لئے۔" فاریہ ابرو چڑھا کے بولی۔

"میں نے تو پہلے ہی اماں کو بتا دیا تھا کہ میں شادی اپنی مرضی سے کروں گا اب آپ لوگوں اگر اپنے شوق سے رشتے کے لئے گھومتی رہی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

جٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق بجیلہ بیگم بہو بن کے گھر میں آگئی وہ کالج میں لیکچرار تھی اور اک کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں طبعاً وہ شوخ اور خوش مزاج لڑکی تھی چند ہی دنوں میں اس کی حوریہ کے ساتھ گاڑھی چھننے لگی۔

فاریہ کے گھر ایک بیٹا اور بیٹی تھی جبکہ فروا کے ہاں ہنوز اولاد کا کوئی امکان نہ تھا اماں بی اکثر اس کی گود ہری ہونے کے لئے دعائیں اور وظائف کرتی رہتیں۔

☆☆☆

اک سنہرے سے دن صبح اور دوپہر کا سنگم تھا جب نازک گلاب سی ایک اور پری حوریہ کی گود میں اتری وہ دیکھنے میں واقعی اتنی پیاری تھی جیسے روپہلے چاند کا اجالا، اس کے معصوم اور نازک وجود میں سمٹ آیا ہو، بچی کی اطلاع سنتے ہی اماں بی کا رنگ غم وغصے سے لال پیلا ہوگیا۔

"ہائے ہائے ارے اچھا ہی ہوتا اگر دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بدبخت کا کام تمام ہو جاتا میرا ہی دماغ چل گیا تھا جو میں منع کر بیٹھی"۔ وہ صدمے کے مارے سر پکڑ کے بین کرنے لگیں بجیلہ بڑی حیرت اور ناگواری سے ساس کا ردعمل دیکھ رہی تھی جو لاشعوری طور پہ اس کے اندر تنفر اور بیزاری پیدا کررہا تھا۔

کچھ گھنٹے بعد حوریہ گھر آگئی تھی اماں کا

اشتعال اور دکھ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا وہ برہمی میں بولے جارہی تھیں۔

"خوامخواہ ہسپتال کا خرچہ کیا یہ منحوس تو ادھر گھر میں بھی پیدا ہوجاتی، پہلے تین کیا کم تھیں جو ایک اور آگئی سوغات۔"

گھر کی فضا میں اک عجیب سی سوگواریت رچ گئی عمران بھی تھکے سے چہرے کے ساتھ افسردہ بیٹھا تھا جب فاران نے گھر آکے یہ خبر سنی تو وہ سب ردعمل پہ بجیلہ کے ناخوشگوار تاثرات بھی بھانپ گیا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بجیلہ اس کے گھر والوں کے بارے میں کوئی منفی بات سوچے، لہٰذا اس نے دانستہ ماحول پر چھائی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کی وہ اماں کے قریب بیٹھ کے مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

"اماں خیر سے گھر میں لڑکی آئی ہے گئی تو نہیں جو یوں سوگ منایا جارہا ہے بس صف ماتم بچھانے کی ہی کسر رہ گئی ہے۔" اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ بجیلہ کی بے ساختہ ہنسی کھنک اٹھی اماں اور عمران بھی ہنس پڑے۔

حوریہ مجرمانہ اور ملامتی سی خاموشی میں ڈوبی اپنے کمرے میں لیٹی انسو بہا رہی تھی سب کا ردعمل تو وہ جانتی ہی تھی اور اب رویے بھی دیکھ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد عمران کمرے میں آیا اور کاٹ میں لیٹے وجود کو دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ گیا بچے بڑے پیار اور اشتیاق بھرے جوش کے ساتھ اس کے گرد بیٹھے ننھی بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"اگر یہ بچی نہ بھی اس دنیا میں آتی تو کیا فرق پڑتا خوامخواہ، پہلے ہی احساسات کے تحت۔" اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"Undesirable baby"۔" اسی لمحے اس کی نظر ڈریسنگ روم سے نکلتی حوریہ پر پڑی اس کے مغموم چہرے اور آنکھوں میں بے بسی کا درد رقم تھا وہ نگاہیں چرا گیا لیکن حوریہ کی سماعتوں میں اس کے زہریلے الفاظ کی بازگشت چکرانے لگی۔

کچھ دیر بعد بجیلہ حوریہ کے لئے سوپ لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"ماشاء اللہ اتنی پیاری ہے یہ اتنی نرم و نازک۔" بجیلہ پیار اور رشک لئے تازہ دھنکی ہوئی روئی جیسے وجود کو دیکھے جارہی تھی۔

"عمران بھائی! آپ بتائیں ناں یہ کس جیسی ہے یہ۔" اس نے اسی مسرور کیفیت میں عمران کو مخاطب کرکے پوچھا، عمران کے دل میں پدرانہ محبت کی لہر سی پیدا ہوئی تو اس نے رنگ و نور سے دمکتے وجود پہ نظر ڈالی جو فرشتوں جیسی معصومیت سموئے ہوئے تھی اس لمحے، وہ اجالا بکھیرتا چہرہ اسے اپنے وجود کا ٹکڑا لگا کوئی بہت اہم حصہ۔

"یہ تو سب بچوں سے زیادہ پیاری ہے۔" عمران کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اس نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے نازک سے گلابی رخسار کو چھوا تو اس نے کسمسا کے آنکھیں کھولیں غلافی پردوں سے مزین نیلی آنکھیں۔

"اس کی آنکھوں کا رنگ کتنا ڈیفرنٹ ہے۔" عمران نے مسرور مسکراہٹ کے ساتھ حوریہ کی طرف دیکھ کر کہا عمران کو یوں محسوس ہوا جیسے چند لمحوں میں اس کی جان اس سوتے جاگتے وجود میں مقید ہوگئی ہے کچھ دیر پہلے والی سنگدلی کے سبب اس کا دل شرمندگی کی زد میں تھا بچی کو دیکھ کر اس کے اندر جوالوہی سی خوشی اتری تھی اس سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا حوریہ حیرت اور بے یقینی سے پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتے اس انسان کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

بچی اب تقریباً چھ ماہ کی ہو چکی تھی وہ خاصی صحت مند اور پہلے سے زیادہ پیاری ہو گئی تھی ہمہ وقت مسکراتا چہرہ ماں باپ اور بہن بھائی کی آنکھ کا تارا تھا عمران گھر آ کے سب سے پہلے اسے دیکھتا وہ بھی باپ کو دیکھتے ہی خوشی سے قلقاری مار کے ہنستی تو دیکھنے والوں کو اس پہ بے ساختہ پیار آتا۔

حوریہ معمول کے کاموں سے فارغ ہو کے جب رات کو کمرے میں آئی تو عمران بچی کو گود میں اٹھائے باقی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کچھ دیر پہلے اسے بچی کے رونے کی آواز آ رہی تھی وہ جلدی سے کام نمٹا کر کمرے میں آ گئی لیکن اب تک عمران اسے بہلا کے چپ کروا چکا تھا حوریہ کو اب عمران کی بچی سے گہری انسیت پہ حیرت نہیں ہوتی تھی۔

''اس کا فیڈر جلدی سے تیار کر کے لے آؤ بھئی بہت رو رہی تھی یہ، شاید بھوک لگی ہے اسے باقی کام بیشک ادھورے چھوڑ دیا کرو، لیکن میری بیٹی کو رولایا مت کرو۔'' حوریہ کو ہدایت کرتے ہوئے عمران کا لہجہ پدرانہ محبت سے لبریز تھا حوریہ نے بچی کو اپنی گود میں لیا وہ ماں کو دیکھتے ہی مسکرا اٹھی۔

''اس کے نام کے بارے میں کچھ کنفرم ہوا۔'' عمران نے دلچسپی سے پوچھا کیونکہ ان کے اور بچوں کے درمیان کئی روز سے یہی بات موضوع گفتگو چل رہی تھی بچی کو سب ہنوز گڑیا کہہ کے ہی پکارتے تھے۔

''جی ہاں میرے خیال میں ''لیہا'' ٹھیک ہے۔'' حوریہ نے اپنا تجویز کردہ نام بتا کے جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''لیہا!'' عمران نے زیر لب دہرایا۔

''ہوں'' نام تو اچھا ہے معنی کیا ہے اس کا۔'' وہ تکیے سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہوا۔

''جنت کی چڑیا۔'' حوریہ نے مسکرا کر ایک نظر بچی کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے گہری نیند میں اتر چکی تھی۔

''پھر تو بہت ہی خوبصورت اور سوٹ ایبل نام ہے ہماری گڑیا کے لئے ''یہ جنت کی چڑیا ہی تو ہے'' جو ہمارے آنگن میں اتر آئی ہے۔'' عمران نے پیار بھری نظر سے لیہا کی طرف دیکھا۔

''اچھا، اب یہ آپ کو پیاری لگنے لگی ہے آپ تو اسے دنیا میں لانے پہ راضی ہی نہیں تھے۔'' آدھی بات وہ دانستہ ضبط کر گئی اس کے انداز میں خفگی بھرا طنز تھا اور لہجہ شکوہ کناں۔

''غلطی ہو گئی تھی جناب!'' عمران نے فوراً اعتراف کرتے ہوئے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ حوریہ کی طرف دیکھا اس کے لہجے کا خمار حوریہ کو چونکا گیا تھا اس کا مزاج آج کل کچھ زیادہ ہی لطیف و گداز ہو گیا تھا حوریہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اس کی نگاہوں کی وارفتگی محسوس کرتے ہوئے حوریہ کے چہرے پہ پل بھر میں شفق جیسے رنگ بکھر گئے اور لبوں پہ پھیلتی شرمیلی سی مسکراہٹ نے اس کے روپ کو دو آتشہ کر دیا عمران اس کی کیفیت و انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے کھل کے ہنسا، بہت دنوں بعد دونوں کے درمیان محبت کے رنگ و خوشبو کا مانوس سا احساس بکھرا، چند لمحوں بعد دروازے پہ دستک کی آواز پہ دونوں چونکے۔

''کون ہے؟ آ جائیں۔'' عمران کے کہنے پہ دروازہ کھلا ابا اور اماں دونوں کو اندر آتے دیکھ کر وہ حیران ہوئے حوریہ نے لیہا کو بیڈ پہ لٹا کے جلدی سے صوفے پہ بکھرے بچوں کے کھلونے اور دوسری چیزیں سمیٹیں۔

''ادھر آئیں اماں بی، بیٹھیں ابا جی۔''

حوریہ کی حیرت خوشی میں بدل گئی ساس سسر کو اپنے کمرے میں دیکھ کر، پہلے تو دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر اماں کے اشارے پر ابا جی نے اصل بات شروع کی۔

''دیکھو بھئی عمران بیٹا! ہم تم سے ایک ضروری بات کرنے آئیں ہیں۔'' اتنا کہہ کر ابا خاموش ہو گئے تو اماں بولیں۔

''عمران بیٹا! تم جانتے ہو کے اپنی فروا کے گھر چار سال سے اولاد نہیں ہے، بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں اس وجہ سے اس کی زندگی میں، تمہاری خیر سے چار لڑکیاں ہیں اگر تم اپنی چھوٹی بیٹی فروا کو دے دو تو......'' وہ بڑی متانت اور شفقت سے آس بھرے انداز میں بول رہی تھیں۔

''میں اپنی بیٹی نہیں دے سکتی۔'' حوریہ نے تڑپ کے پاس لیٹی لیہا کو اٹھا کے اپنے ساتھ لگایا عمران کے چہرے پہ تذبذب کے تاثرات تھے۔

''ارے یہ صرف تمہاری ہی ''بیٹی'' نہیں ہے پوتی ہے ہماری بھی اور لینے والی اس کی پھپھو ہے۔'' اماں بی کا لہجہ بس اتنی ہی دیر نرم رہ سکتا تھا پھر سے وہی مخصوص تلخی اور برہمی در آئی تھی۔

''ہاں تم بات کرو مجھ سے عمران چپ کیوں بیٹھے ہو۔'' وہ عمران کی طرف رخ موڑ کے متوجہ ہوئیں۔

''پہلے تین بیٹیوں کا بوجھ کیا کم تھا جو چوتھی نے پلڑا اور بھاری کر دیا ایک اگر بہن کو دے دو گے تو اس کا بھی بھلا ہو جائے گا، تمہاری قدر و منزلت بھی بڑھ جائے اور ذمہ داری بھی کم ہو جائے گی۔'' اماں بی نے ایک ایک کر کے سارے فائدے گنوائے حوریہ کا سانس اٹکنے لگا۔

عمران ایک طرف تو والدین کی ناراضگی سے گھبرا رہا تھا دوسری طرف اولاد کو خود سے جدا کرنے کا متحمل نہیں تھا وہ، لیہا کو تو ہرگز نہیں، سوچوں کی کشمکش کی کیفیت میں اس نے کنپٹی پر انگلیاں رگڑیں۔

''اماں بی، میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔'' عمران کا لہجہ کمزور اور ندامت سے بھرا تھا وہ بات ٹالنا چاہ رہا تھا، تسبیح کے دانے گراتے ابا جی نے ایک لمحے کو ٹھٹک کے اسے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے میں کون سا تم سے رشتہ مانگنے آئی ہوں ویسے بھی ان تین لڑکیوں کی پریشانیاں ہی بہت ہیں تمہیں الجھانے کے لئے، چوتھی کی فکر سے بے نیاز ہو جاؤ گے یہ کم ہے کیا؟'' اس کی حیل و حجت اماں بی کو غصہ دلا رہی تھی۔

حوریہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا، کہیں عمران اماں کے دلائل سن کے یا دباؤ میں آ کے بچی دینے پہ رضا مند ہی نہ ہو جائے عمران نے رائے طلب انداز میں حوریہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں التجا تھی اولاد کو جدا نہ کرنے کی۔

''اماں بی ابھی صرف چار پانچ سال ہی تو ہوئے ہیں فروا کی شادی کو یہ کوئی زیادہ عرصہ تو نہیں، انشاء اللہ خدا ضرور کرم کرے گا اس پہ ہم سب دعا کریں گے اس کے لئے۔'' حوریہ نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ارے بس بھی کرو بہو بیگم تم کیا جانو میری بچی کی محرومی کے کرب کو۔'' اماں بی جھلا گئیں۔

''تم جواب دو عمران پھر کیا کہتے ہو؟'' ابا جی نے عمران کو مخاطب کیا وہ شاید عمران کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔

کچھ لمحے خاموشی سے سرکتے گئے سب ہی

اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے جبکہ حوریہ کا دل خدا کے سامنے گریہ زاری میں مصروف تھا۔

''اماں میں اپنی بچی کسی کو یوں نہیں دے سکتا فروا کے ہاں اولاد نہ ہونے کا دکھ مجھے بھی ہے خدا بہتر کرے گا لیکن......'' اماں بی اس کی بات کاٹ کر بھڑک کے بولیں۔

''ارے بہن کو سکھی نہیں دیکھ سکتے تم ہمارا بھی مان نہیں رکھا تم نے خود چل کے آئیں ہیں تمہارے پاس، کیسی پٹی بندھی ہے تمہاری آنکھوں پہ بہن کا رتی برابر بھی احساس نہیں، کل کلاں کو تمہاری بیٹیاں بھی اپنے بھائی کو ایسا ہی بے مروت پائیں گی، ہاں دیکھ لینا تم۔'' اماں بی نے جذباتی دباؤ مزید بڑھا دیا۔

''آپ بھلا میری بیٹیوں کو کیوں بددعائیں دے رہی ہیں۔'' حوریہ کے دل پہ کاری ضرب لگی عمران کو اماں بی کا کوسنا خاصا برا لگا۔

''اٹھیں جی چلیں یہاں سے اب اور کیا رہ گیا ہے سننے کو۔'' حوریہ کی بات پر دھیان دیئے بغیر انہوں نے ابا کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔

حوریہ نے خدا کا شکر ادا کیا، لیکن نا جانے کیوں؟ اماں بی کے رویے سے آج اس کا دل بھر آیا تھا اندر کے کئی زخم کھل اٹھے تھے ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں میں برسات امڈ آئی تھی، عمران نے بغور اس کی طرف دیکھا بے چارگی سے روتی ہوئی حوریہ کو دیکھ کر اس کا دل مضطرب ہونے لگا، اس کے اندر احساس محبت پوری قوت سے بیدار ہوا، یہ سچ تھا کہ حوریہ نے کبھی اس اماں بی کے رویے کی شکایت نہیں کی تھی لیکن وہ بے خبر ہرگز نہیں تھا وہ دل ہی دل میں حوریہ کے حوصلے اور صبر کا قدردان تھا۔

اس نے بے اختیار حوریہ کے گرد نرمی سے بازو حائل کیا حصار میں وہ بے جان سی ہو کے اسی کی طرف لڑھک گئی حوریہ کا سر اس کے سینے سے ٹک گیا وہ ہنوز سسک رہی تھی اور عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا کہہ کے تسلی دے وہ خاموشی سے اس کا کندھا سہلاتا رہا۔

بس اوقات خاموشی خود ہی لفظوں کو اپنے اندر جذب کر کے مسیحائی کی تاثیر دل میں اتار لیتی ہے اور وہ تاثیر لفظوں سے کہیں بڑھ کے اثر انگیز ہوتی ہے۔

☆☆☆

اماں کا رویہ بچیوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ سخت بلکہ رقابت آمیز ہو گیا تھا نور اور علی بڑے ہو رہے تھے دادی کی بے جا ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک سے بدظن ہو کے اکثر ان کے سامنے بول پڑتے آج بھی دادی نے انہیں کسی بات پہ بڑی سختی سے بے وجہ ڈانٹا تھا کہ علی بول پڑا۔

''آپ ہر وقت ہماری مما کو اور ہمیں ڈانٹتی کیوں رہتی ہیں آپ گھر کی میڈم (کلاس ٹیچر) ہیں کیا؟'' علی نے کچھ بے زاری اور معصومیت سے کہا۔

یہ بات سن کے کچن میں سبزی کاٹتی حوریہ اور پاس بیٹھی بجیلہ دونوں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

''بڑے ہی بدتمیز ہو گئے ہو تم دونوں ذرا بھی تمیز نہیں سکھائی تمہاری ماں نے تمہیں، ایسی مار لگاؤں گی کہ یاد رکھو گے تم۔'' دادی نے جوتا اٹھا کے تاک کر نشانہ لگایا جو خطا گیا نور اور علی ہنستے ہوئے آگے پیچھے بھاگتے کمرے میں گھس گئے اماں کا غصہ آسمانوں کو چھونے لگا اتنے میں ''لیہا'' کے رونے کی آواز آئی وہ شور کی وجہ سے جاگ گئی تھی۔

''لو اب یہ لاڈو رانی اٹھ گئی ہے شور مچانے کو اے نور گود میں اٹھا کے چپ کروا اسے ورنہ چپ نہیں ہو گی یہ منحوس ہاتھوں میں اٹھائے رکھنے کی عادت جو ڈال رکھی ہے اسے اور تو اور باپ ہی لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتا جیسے بڑی منتوں مرادوں والی اولاد ہو، بھلا چوتھی بیٹی سے بھی کوئی ایسا ڈلا پیار کرتا ہے۔'' اماں بی اپنی انوکھی منطقیں بیان کرتی حسب عادت ''لیہا'' کو کوسنے لگیں۔

بجیلہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اس نے اماں بی کے اس منفی رویے کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

''ویسے حوریہ بھابھی آپ کی ہمت ہے کہ یہ سب برداشت کر لیتی ہیں اگر میری کوئی بیٹی ہوتی اور اماں بی نے اس کے لئے ایسا جاہلانہ رویہ اختیار کیا تو میں ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گی اگر اماں بی کو پوتیوں پہ پیار نہیں آتا تو نہ سہی، لیکن ہر وقت کوسنے کی کیا ضرورت ہے، اس میں ان بے چاری معصوموں کا کیا قصور ہے، اگر خدا نے انہیں لڑکیاں بنا کے اس گھر میں پیدا کر دیا ہے تو۔'' بجیلہ کی باتوں پہ حوریہ کے چہرے پہ ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھری جس کے پیچھے برسوں کے کرب چھپے تھے۔

''کیا ہوا لیہا کیوں رو رہی ہے۔'' عمران نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا اور جلدی سے نور کے ہاتھوں سے لیہا کو لے کر بازوؤں میں جھلانے لگا لیہا باپ کی آواز پہچان کر مزید زور سے رونے لگی جیسے وہ شکوہ کرتے ہوئے سب کی لاپرواہی اور اپنی ناراضگی کا احساس دلا رہی ہو عمران ہولے ہولے اس کا سر تھپکتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا وہ اس کی گود میں حسب معمول دبک کر چپ ہو گئی جیسے اس کے لمس سے بہت مانوس ہو۔

''لیہا رو رہی تھی تمہاری مما نے اٹھایا کیوں نہیں اسے کدھر ہیں وہ۔'' عمران نے نور سے پوچھا تو اماں بی بول پڑیں۔

''وہ تو کچن سے باہر نکلی ہی نہیں اور نہ ہی بچی کو دیکھا کہ کیوں رو رہی ہے۔'' اماں بی نے گویا حوریہ کی کوتاہی بیان کی۔

''میری تو ابھی نماز کا وقت ہو رہا تھا ورنہ میں ہی اٹھا لیتی بچی بیچاری کو۔'' اماں بی نے کچھ شرمندہ سی ہو کے جھوٹا عذر بیان کیا۔

دراصل اماں نے کچھ عرصے پہلے ہی یہ بات محسوس کی تھی کہ بچیوں کے ساتھ ناروا سلوک یا سخت بات عمران کو خاصی ناگوار گزرتی ہے چاہے وہ اس کی ماں کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو اماں بیٹے کے دل میں اپنے لئے کوئی شکوہ نہیں آنے دینا چاہتی تھیں لہٰذا اس کی موجودگی میں خود پہ ذرا قابو رکھتیں اور پھر لیہا سے اس کی محبت اور انسیت کی تو بات ہی نرالی تھی۔

☆☆☆

لیہا جیسے بڑی ہو رہی تھی خاصی شرارتی ہوتی جا رہی تھی اس کی حرکتیں بھی پہلے سے زیادہ دلچسپ ہو گئی تھیں وہ گیارہ ماہ کی ہو چکی تھی اگلے مہینے اس کی پہلی سالگرہ تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب اچانک لیہا کی طبیعت خراب ہوئی وہ سانس باقاعدہ کھینچ کے زور زور سے لے رہی تھی اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں اس کی حالت پہ حوریہ اور عمران حواس باختہ سے ہو گئے وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ گھریلو ٹوٹکوں کے اثر سے ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

اگلی صبح ہی وہ دونوں لیہا کو لے کر شہر کی

مشہور چائلڈ سپیشلسٹ کے پاس گئے ڈاکٹر کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔

''ڈاکٹر تو ابھی نہیں آئی مجھے آفس میں بہت ضروری کام کے لئے ابھی پہنچنا ہے تم دوا لے کر گھر چلی جانا۔'' عمران کی بات سے حوریہ کچھ جزبز سی ہوئی۔

''تم صالحہ کو فون کر کے بلا لو اپنے پاس۔'' اس کی پریشانی بھانپ کر عمران اسے اس کی بہن کو پاس بلانے کا مشورہ دیا جو یہاں قریب ہی رہتی تھی حوریہ نے عمران کے موبائل سے صالحہ کو فون کیا وہ چند منٹ ہسپتال پہنچ گئی۔

ڈاکٹر آ چکی تھی دو مریضوں کے بعد حوریہ کی باری تھی وہ بظاہر صالحہ سے باتیں کر رہی تھی لیکن نا جانے کیوں اس کے دل میں گھبراہٹ سی اٹھ رہی تھی۔

اچانک لیبا کی سانسیں پھر سے بری طرح سے اکھڑنے لگیں وہ اور صالحہ بھاگ کر اسے نرس کے پاس لے گئیں نرس نے بچی کی حالت پہ گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر کو اطلاع دی اور بچی کو ایمرجنسی میں لے گئی ڈاکٹر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں آئی ایک افراتفری مچ گئی۔

''سانس بہت ڈوب کر آ رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے اسٹیتھوسکوپ سے معائنہ کرنے کے بعد جلدی سے آکسیجن لگا دی۔

حوریہ کو اپنی جان رگوں سے کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی حوریہ اور صالحہ کے ہونٹوں کی جنبش سے بے آواز دعائیں نکل رہی تھیں۔

ڈاکٹر صباحت کے ساتھ عملے کے دوسرے لوگ بھی لیبا کے گرد مصروف عمل تھے، کچھ لمحوں بعد ہی ڈاکٹر صباحت نے انتہائی مایوسی اور بے بسی سے نفی میں سر ہلایا ایک گہری سی سانس بھر کے حوریہ کے قریب آئی از راہ ہمدردی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

''شاید خدا نے اس ننھی گڑیا کی زندگی ہی اتنی لکھی تھی، آپ حوصلے اور صبر سے کام لیں۔''

حوریہ بدحواس سی کچھ سمجھنے نا سمجھنے کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈاکٹر صباحت کو دیکھتی رہی اس کے اندر چیختی ممتا ہنوز بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

اس نے پتھرائی نظروں سے لخت جگر کی طرف دیکھا جو مقدس اجالے کی مانند لگ رہی تھی اسے یوں بے حس و حرکت دیکھ کر دیکھنے والے کا دل دہل جاتا، اس کا دل تو پھر ماں کا دل تھا، نرس نے اس کے سر کے گرد سفید پٹی باندھ دی جسے دیکھتے ہی حوریہ کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی۔

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ حواس کھو بیٹھی تھی صالحہ بمشکل اسے سنبھالے ہوئے تھی ورنہ شاید وہ زمین پہ ڈھے جاتی۔

عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جو دلروز منظر دیکھا وہ اس کی جان سلب کرنے کو کافی تھا کچھ دیر پہلے اسے صالحہ نے فون کیا تھا اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا ابھی تو اپنی لیبا کو ہنستا کھیلتا چھوڑ کے گیا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دوبارہ اسے اس طرح دیکھنے کے لئے لیبا کی سانسیں وفا نہ کریں گی، حوریہ کا ذہن صدمے سے مفلوج سا ہونے لگا۔

''یہ لڑکیاں کہاں مرتی ہیں زندہ رہتی ہیں بوجھ بن کر۔'' اماں بی کی آواز گرم سلاخ کی طرح اس کے دماغ میں ابھری۔

''Undesirable baby۔'' اگلی آواز کسی ہتھوڑے کی طرح برسی پھر اور کئی اضطراب کن آوازیں پردہ ماضی چاک کر کے امڈ آئیں۔

''سب دشمن تھے میری بچی کی جان لے لی سب نے اس کی۔'' وہ مخبوط الحواسی میں چلائی۔

ابلتا ہوا لاوا بھی ایک دن سنگلاخ پہاڑوں کا سینہ چیر کے باہر آ نکلتا ہے اس کے اندر کا آتش نشاں بھی آج پھٹ پڑا تھا۔

ہسپتال میں موجود لوگ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگے لیکن وہ جیسے ہوش خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

''حوصلے سے کام لو حوریہ، پاگل مت بنو۔'' صالحہ نے اس کے کندھے کو ذرا سا ہلا کے گویا حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔

''اپنوں کے دھتکارے اور بدقسمتی کے مارے لوگ پاگل ہی تو ہو جاتے ہیں۔'' حوریہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی فاران اور بجیلہ بھی ہسپتال پہنچ چکے تھے لیبا کو وہاں سے اٹھا کے ایمبولنس میں ڈال دیا گیا تھا۔

بجیلہ اور صالحہ، حوریہ کو بمشکل ہسپتال سے باہر لے جانے لگیں وہ بلکتی ہوئی بے جان قدموں سے چل رہی تھی۔

گھر میں اماں اور پھوپھیاں بین کر کے روتی ہوئیں حوریہ کو دنیا کی مکار ترین عورتیں لگیں لیکن شاید وہ واقعی ہی آزردہ تھی۔

عمران کا دل درد سے پھٹا جا رہا تھا لیبا کے بہن بھائی بھی زار و قطار رو رہے تھے اور پھر حوریہ اور عمران کے وجود کا حصہ، وہ معصوم پری ہمیشہ کے لئے مٹی میں جا سوئی لیکن دلوں میں انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔

☆☆☆

وقت بڑے سے بڑے گھاؤ کا بہترین مرہم ثابت ہوتا ہے، دھیرے دھیرے انسان کا صبر، بے چینی اور درد پہ حاوی ہو جاتا ہے لیکن ایسا ہوتا بہت مشکل سے ہے۔

حوریہ دوسرے بچوں میں خود کو بہلا کے اندر کے غم کو قرار میں بدلنے کی کوشش کرتی وہ کافی حد تک سنبھل بھی گئی تھی لیکن اس کی ذات میں ایک غیر معمولی تبدیلی آ چکی تھی۔

گھر کے در و دیوار پہ اک خاموشی اور سوگواریت سی چھا گئی تھی اماں بی بھی اب بہت چپ رہنے لگیں تھیں انہیں ملال آمیز اور مجرمانہ سی خاموشی نے گھیر لیا تھا۔

حوریہ انہیں خود سے مخاطب نہ کرتی اگر وہ اس سے بات کرتی بھی تو وہ ''ہوں'' ''ہاں'' لاتعلقی سے جواب دیتی اماں اس کے دل میں لگی رنجش کی گرہ جان گئی تھیں۔

حوریہ کے خیال میں اماں کی ضروریات اور ان کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہنا اس کے فرائض میں شامل نہ تھا پہلے خدمتیں کر کے اس نے کون سی قدر کروالی تھی اپنی اور اپنی اولاد کی، حوریہ کے اندر کی کدورتوں نے اسے کچھ باغی سا بنا تھا۔

فاران اور بجیلہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے ان کے الگ رہنے کا فیصلہ تو دونوں کے درمیان شادی سے پہلے ہی طے تھا۔

کبھی کبھی اماں خود کو گھر میں فالتو چیز کی مانند تصور کرنے لگتیں وہ بچوں سے بہت شفقت اور لاڈ پیار بھگارنے لگیں تھیں ان کی زندگی کی دعائیں کرتی لیکن اس سے بھی حوریہ کی بے نیازی پہ کوئی اثر نہ پڑا۔

☆☆☆

آج اماں نے عمران اور حوریہ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی طلب کی جو وہ بچیوں کے ساتھ روا رکھتیں تھیں اور مزید حیرت انگیز بات یہ کہ خود کو حوریہ کا مجرم تک کہہ دیا ان کی آنکھ سے نکلے ایک آنسو نے حوریہ کے دل سے تمام

رنجشوں کے داغ دھو دیئے۔

معافی مانگنا ان کا منصب نہیں تھا لیکن اس مقام تک انہیں ان کے اعمال ہی لائے تھے۔

حوریہ اور عمران نے بڑے احترام اور عزت سے انہیں مطمئن کیا حالانکہ عمران کا اپنا دل ہنوز غم سے چور تھا۔

حوریہ کا رویہ عمران کے ساتھ بہت بے اعتنا اور بیگانگی بھرا تھا جو اس کے لئے مزید سامان اذیت تھا اس سانحے نے عمران کے دل پہ گہرا اثر چھوڑا تھا وہ دھیرے دھیرے سنبھل تو رہا تھا لیکن حوریہ کا ردعمل اور رویہ اس کے مزید الجھانے لگتا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید حوریہ دکھ اور صدمے کی وجہ سے خاموش ہو کے خود میں سمٹ گئی ہے اور اسے غمگین کیفیت سے نکالنے کے لئے اس کے تسلیاں دیتا اس سے باتیں کرتا حالانکہ اسے خود حوریہ کی طرف سے جذباتی سہارے کی شدید طلب تھی، لیکن حوریہ کے چہرے پہ بے اعتنائی اور بیگانگی بھرے ایسے پتھریلے تاثرات منجمد تھے جیسے اس کے لئے عمران کی ہر بات بے معنی اور غیر اہم ہے وہ اس کے اس عجیب ردعمل پہ گھائل اور ششدر ہو کے رہ گیا، اتنی گہرائی اتنی پیچیدگی؟ یہ حوریہ کے مزاج کا کون سا رخ تھی۔

حوریہ نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ عمران میں بہت واضح تبدیلیاں رونما ہوئی تھی وہ بچوں کے معاملے میں خاصے حساس ہو گئے تھے اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ چپ چاپ رہنے لگے تھے بہت مضطرب اور الجھی ہوئی خاموشی، حوریہ اس کی غم خواری کرنے سے پہلو تہی کر رہی تھی کیونکہ وہ اس سے حد درجہ شاکی اور بدگمان تھی اور شاید وہ تو خود سے بھی روٹھی ہوئی تھی، عمران کی پیش رفت بھی اس کے دل پہ جمی دھول کو مٹا نہ سکی، دونوں کے درمیان ان دیکھا سا فاصلہ در آیا تھا، عمران سے حوریہ کا یہ رویہ خاصا اجنبی اور پریشان کن تھا۔

جن لوگوں کو ہم نے ہمیشہ پیکر محبت ہی سمجھا ہو ہم جن کی نگاہ الفت کے عادی ہوں ان کی بے رخی بڑی دردانگیز ہوتی ہے خاص کر اس وقت جب دل تشنہ تسلی بھی ہو۔

☆☆☆

کوئی اضطراب تھا یا کسی بے آواز پکار کا احساس، جو اس کی نیند میں مخل ہوا اس کی آنکھ کھلی تو عمران کمرے میں موجود نہیں تھا اس نے کھلے دروازے سے باہر نظر دوڑائی تو صحن کی بتی روشن تھی کئی لمحے انتظار بے چینی، کشمکش اور ہچکچاہٹ میں بیت گئے، اس نے درشہوار کو دھیرے سے الگ کیا جو اس کے ساتھ لپٹ کے سو رہی تھی اور خود اٹھ کے باہر آئی عمران اکیلا صحن میں بیٹھا تھا کرسی کے پیچھے ہاتھوں کی انگلیوں کو ملا کر ان پہ سر ٹکائے سوچوں میں اس قدر ڈوبا تھا کہ اسے حوریہ کے قریب آنے کا احساس تک نہ ہوا۔

وہ ستاروں کو یوں تک رہا تھا جیسے اس کا کوئی بہت اپنا ستاروں میں جا چھپا ہو، اماوس کے ادھورے پن کی اداسی نے پورے آسمان کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا ہلکی ہوا کی سرسراہٹ رات کی خاموشی سے ہم کلام تھی رات زینہ بہ زینہ دوسرے پہر میں اتر رہی تھی۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہیں آپ۔'' حوریہ کی آواز پہ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا۔

''آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں یہاں اس وقت، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' حوریہ کے انداز میں کافی حد تک پہلے والی اپنائیت اور فکرمندی در آئی تھی حوریہ نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں غضب کا حزن و ملال تھا آنکھوں میں تیرتی سرخی رت جگوں کا پتہ دے رہی تھی اس کی حالت آج سے پہلے حوریہ نے کبھی ایسی نہ دیکھی تھی۔

''کیا وہ بیٹی کی جدائی کے غم میں اتنا ٹوٹ چکا تھا؟'' اس کے ذہن میں منکشف سوچوں کی نئی ڈوری بندھنے لگی اس کی شکستہ حالی پہ اس لمحے حوریہ کا دل موم کی طرح پگھلا تھا۔

''انسان کیا کر سکتا ہے، سوائے حوصلے اور صبر کے، خدا آپ کو صبر جمیل دے۔'' حوریہ کے دل سے بے اختیار دعا نکلی وہ اس کے بالکل قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی اور ہاتھوں کے تمازت آمیز لمس سے اس کے سرد ہاتھوں کو ہلکا سا دبایا سکون آمیز حرارت عمران کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی۔

''مجھ سے اس کی جدائی کا صدمہ سہا نہیں جا رہا حوریہ، اس سے بڑھ کر یہ احساس خطا میری رگوں کو زہر بن کے کاٹ رہا ہے کہ وہ میری وجہ سے، مجھ سے اس کی ناقدری ناشکری ہوئی ہے جو قدرت نے سزا کے طور پہ اسے ہم سے چھین لیا۔'' عمران کے لہجے میں اضطراب بے چارگی اور خوف سے لبریز تھا۔

''اور تم...... تم بھی شاید میری اسی خطا کے سبب مجھ سے بدگمان ہو کے نفرت کرنے لگی ہو۔'' اس کی پریشان کن بات پہ حوریہ کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

''نہیں نہیں بھلا میں آپ سے نفرت کیسے کر سکتی ہوں آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ......'' اس کی بے کل حالت دیکھ کر ہی حوریہ کی ساری ناراضگی ہوا برد ہو گئی تھی وہ پل بھر میں سارے شکوے بھول گئی تھی وہ اس کی جس بات کے سبب بدگمان تھی وہ اسی خطا کے بوجھ تلے سلگ رہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کی پیدائش کے حق میں نہ تھا اس پہ نظر ڈالنے سے پہلے ہی اسے ''ناپسندیدہ'' کہنے کے کلمات کفر بھی میری ہی زبان سے نکلے تھے، لیکن تم بتاؤ حوریہ۔'' اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد سے اس کی زندگی کے آخری لحات تک۔

''ایک لمحے کو بھی میرا سائبان شفقت اس کے وجود سے ہٹا، پل بھر کو بھی میری والہانہ محبت میں کمی آئی؟ بتاؤ حوریہ؟ تم تو اس سے میری بے پناہ انسیت کی چشم دید گواہ ہو۔''

انسان کس قدر دلچسپ تفاوت کا مجموعہ ہے اس کے اندر کا خیر و شر اسے کس وقت کس حالت میں منکشف کرے یہ کوئی نہیں جانتا، شاید انسان کے اندر کا انسان بھی نہیں حوریہ کو احساس ہوا وہ عمران کے کہے جن کلمات کے سبب بدگمان تھی وہ بدگمانی تو سراسر بے بنیاد تھی وہ تو حوریہ سے زیادہ گھائل اور بکھرا ہوا تھا چند لمحے حوریہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیسے اس کی دلجوئی کرے، کون سا فلسفہ سمجھائے جو اس کے لئے حرف تسلی ہو کون سی دلیل دے کے اسے مطمئن کرے۔

''آپ نے اسے سزا ہی کیوں سمجھ لیا ہے جبکہ اولاد تو ہوتی ہی آزمائش ہے کبھی خدا دے کر آزماتا تو کبھی لے کر اور رہا احساس خطا تو اسے مٹانے کے لئے انسان کا ایک اشک ندامت ہی کافی ہوتا اگر آپ نے خدائے رحیم سے معافی مانگ لی ہے تو وہ آپ کو ضرور بخش دے گا، صبر تو انسان کو وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔'' چند لمحے خاموشی سنسناتی رہی جیسے اندر باہر کو ساکت کر دینے والا سناٹا سا چھا گیا ہو۔

''صرف گیارہ ماہ وہ ہمارے ساتھ اس دنیائے فانی میں گزار کے چل بسی یہ اس کا آنا تھا یہ تو اس کے جانے کی تمہید تھی وہ تو شاید ہم پہ بیٹیوں کی اہمیت کا راز آشکار کرنے آئی تھی اور پھر وہ سو گئی۔'' عمران کا ذہن کسی گہری سوچ و ادراک

میں منہمک تھا وہ آج اپنے اندر کی کیفیت شریک سفر سے بیاں کرکے سینے پہ دھرا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔

"میں بھول گیا تھا حوریہ کہ خدا جب کسی انسان سے بہت خوش ہوتا ہے تو وہ اسے بیٹیوں کی نعمت سے نوازتا ہے اور جواباً انسان ناگواری اور ناشکری سے اس کا استقبال کرتا ہے۔" اس کے اندر پھر احساس خطا جاگا، درد کی ٹیسیں اٹھیں کرب واضطراب بڑھنے لگا۔

"خدا نا جانے میری کس ادا پہ خوش تھا جو اس نے میرے آنگن کو تتلیوں کا آشیانہ بنایا۔" حوریہ کو لگا جیسے وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچا ہوا ہے۔

"تم نے کبھی غور کیا حوریہ یہ رنگ برنگی تتلیاں ہمیشہ پھولوں کی نرم پنکھڑیوں پر بیٹھتی ہیں خوشنما باغوں میں ہی ان کا بسیرا ہوتا ہے لیکن تتلی مرجاتی ہے جب وہ......" اس سے آگے وہ بول نہیں سکا حوریہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں درد گہرا ہوگیا، وہ واقعی ہی بہت بکھر چکا تھا اس کا ذہن بار بار ایک ہی نقطے پہ آکے ٹھہر رہا تھا۔

"حوریہ مجھے لگتا ہے یہ ڈاکٹروں کی لاپرواہی کے سبب ہی ہوا ہے اگر اس روز میں تمہارے ساتھ ہوتا تو۔"

"تو بھی آپ اسے بچا نہیں سکتے تھے کیوں اس کی بیماری موت کا پیغام لے آئی تھی، اس کی زندگی بس اتنی ہی تھی۔" آنسو حوریہ کے گال پہ پھسلنے لگے اس نے ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کیا وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اس وقت عمران کے سامنے کچھ لمحے بے آواز سسکتے رہے۔

"جو بھی ہوا لیکن اس کے جانے کے بعد میرا سکون ختم ہوگیا ہے، کوئی مجھے بتائے کہ مجھے سکون کیسے ملے گا۔" وہ بہت بے بس سا ہوگیا۔

"لوگ مجھے کہتے ہیں حوصلہ کرو، صبر سے کام لو، لیکن نا جانے کیوں مجھے صبر نہیں آتا انیہا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں میں اسے کہاں سے لاؤں۔" حوریہ نے بے بسی اور ترحم سے اس کی طرف دیکھا اسے سنبھالنا اس کی مسیحائی، یہ سب اسے اپنے بس سے باہر لگ رہا تھا۔

کچھ لمحے سوچنے کے بعد اچانک حوریہ کے ذہن میں ایک خیال کوندا، شاید اسی عمل سے عمران کے لئے تاثیر مسیحائی ہو۔

"شاید آپ کو اس وقت میری یہ بات عجیب لگے لیکن میرے گمان میں ایک ایسا عمل ہے جو شاید آپ کے اضطراب کو سکون میں بدلنے کا سبب بن جائے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا عمران نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم رقیہ آپا (حوریہ کی بہن جو کچھ عرصے پہلے وفات پاگئی تھیں) کی بیٹی مہ رخ کو گھر لے آئیں وہ یتیم بچی ہے ماں کے بعد باپ کی حادثاتی موت نے اسے بالکل ہی بے سہارا کردیا ہے وہ بہت بے چارگی اور کسمپرسی کی حالت میں جی رہی ہے اگر ہم کسی بے سہارا بچی کا سہارا بنیں گے تو ہوسکتا ہے خدا اس نیکی کے صدقے ہماری زندگیوں میں سکون بھردے۔"

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن وہ اپنے چچا کے پاس نہیں رہتی، وہ مان جائے گا کیا؟" عمران نے متوقع خدشہ ظاہر کیا حوریہ کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

"کیوں نہیں مانے گا اس نے بچی کو جس حالت میں رکھا ہوا ہے وہ سب جانتے ہیں اور میں بچی کی سگی خالہ ہوں کوئی غیر تو نہیں آپ صبح

اماں بی اور ابا جی سے بات کرلیجئے گا وہ مان جائیں گے کیا؟" حوریہ نے اپنے اندیشے کو زبان دی۔

"مجھے نہیں لگتا انہیں کوئی اعتراض ہو اگر انہوں نے کوئی رویہ ظاہر کی بھی تو میں انہیں منا لوں گا۔" عمران کو اپنے اندر جو سکون لہراتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے پل بھر میں اس سے فیصلہ کروادیا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ہم صبح ہی امی کے گھر جائیں گے وہاں ان سے صلاح کرکے انہیں ساتھ لے کے گاؤں جائیں گے اور مہ رخ کو لے آئیں گے اس کے چچا سے بات کرکے۔" حوریہ کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی اپنی اس یتیم بھانجی کو گھر میں اپنے پاس رکھنے کی خواہش، حوریہ کی دیرینہ خواہش تھی جو کے اسے حسرت ہی نظر آتی تھی لیکن اسے حقیقت میں بدلنے کا شاید یہی سبب بننا تھا۔

☆☆☆

حوریہ مہ رخ کو گھر لانے میں کامیاب ہوگئی عمران نے اس کے سر پہ دست شفقت رکھ کے اسے بیٹی کا درجہ دیا وہ ان کے بچوں کی ہم عمر ہی تھی لہٰذا بچوں میں جلد ہی گھل مل گئی۔

وقت کا دھارا اپنی رفتار سے چلتا رہا اماں اور ابا یکے بعد دیگرے داغ، مفارقت دے گئے، حوریہ اور عمران نے بچوں کی پرورش اور تربیت میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی نتیجتاً آج ان کے سب بچے نا صرف اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے بلکہ ہر لحاظ سے کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔

مہ رخ کی شادی علی کے ساتھ اس کی رضا مندی سے کردی گئی وہ ان کی اور احسان مند ہو گئی۔

زندگی کے اس مقام پہ وہ خاصی مطمئن تھی کبھی کبھار اگر اسے اپنی کم سن بیٹی کی جدائی کی کسک سی محسوس ہوتی تو اگلے ہی لمحے وہ خدا کے بے بہا انعامات وثمرات پہ سراپہ شکر بن جاتی۔

قصہ ماضی ختم ہوا اسے اپنے چہرے پہ گرم آنسوؤں کی لڑیاں پھسلتی ہوئی محسوس ہوئیں اس نے ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے چہرہ صاف کیا، خوشی اور غم زندگی میں ہمیشہ ایک دوسرے سے مشروط رہے ہیں۔

ایک ہی زاویے سے بیٹھے رہنے کے سبب اس کا وجود سن سا ہوگیا اس نے کمر اور ٹانگوں کو حرکت دی تو دونوں گھٹنوں سے ایکدم اٹھتی درد ٹیس کے باعث بے ساختہ اس کے منہ سے کراہ نکلی کچھ عرصے سے اسے گھٹنوں میں درد کا مسئلہ رہنے لگا تھا۔

بیڈ کی دوسری طرف لیٹے عمران کی آنکھیں نیم وا ہوئی۔

"کیا بات ہے نیند نہیں آرہی کیا؟" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"ہوں۔" حوریہ نے چونک کے اس کی طرف دیکھا وہ جاگ گیا تھا۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟" عمران نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا حوریہ ہاتھ گھٹنوں پہ رکھے ہوئے تھی۔

"نہیں بس ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔" حوریہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"سو جاؤ رات کافی ہوگئی ہے۔" عمران نے اس کی کلائی کو ہلکا سا دبایا۔

حوریہ نے دراز ہو کے آنکھیں موندھ لیں چند لمحوں میں نیند کی پری نے اس کی ہر تھکن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

☆☆☆

اک جہاں اور

سدرۃ المنتہیٰ

پانچویں قسط کا خلاصہ

علی گوہر اس ویرانے میں لڑکی کو ڈھونڈنے جاتا ہے، اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بے ترتیب اور بکھری چیزوں میں سے اسے امرکلہ کی چٹ مل جاتی ہے، وہ جاتے ہوئے، عمر رسیدہ خاتون کی قبر دیکھتا ہے۔

علی گوہر فنکار کے پاس نڈھال سی حالت میں جاتا ہے، جہاں وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں، واپسی پر وہ عمارہ کو پروفیسر غفور کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور آتے ہوئے اس سے وجہ پوچھتا ہے، وہ بتاتی ہے کہ وہ نوکری ڈھونڈنے نکلی ہے، علی گوہر جلد گھر لوٹنے کا وعدہ کرتا ہے۔

امرت ماں کی دلجوئی کرتی ہے اسے منانے کے لئے اور گھر والوں کے لئے بہت ساری چیزیں لاتی ہے، اسے بار بار عبدالحنان کا فون آتا ہے، جسے وہ نظر انداز کر رہی ہے۔

کبیر بھائی امرکلہ کو لے کر اس درگاہ (مزار) سے نکل آئے ہیں اور اس سے اس کی کہانی پوچھتے ہیں، امرکلہ اپنے ماضی کو لے کر پریشان ہے اور اسے نہیں پتہ کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

چھٹی قسط

ڈیوڑھی پار کرنے کے بعد جو مین روڈ کی پٹی دکھائی دیتی ہے، تھوڑا سا آگے جا کر سواری ملنا مشکل نہیں ہوگا، آج ایک ہفتے بعد وہ ملے تھے، ایک ہفتے بعد بھی سب کچھ ویسا تھا اور وہ ویسی ہی باتیں کر رہے تھے، پورا ہفتہ وہ نواز حسین کی منہ بولی بہن بن کر اس کے گھر رہی تھی اور اب ایک ہفتے بعد وہ اسے لینے آئے تھے۔

''تمہیں نواز حسین کے گھر کا ماحول پسند نہیں آیا ہوگا مجھے اندازہ ہے۔''

''اس لئے آپ مجھے ہمیشہ وہاں رہنے کا مشورہ مت دیجئے گا، وہاں میری جگہ بھی نہیں ہے، اس چھوٹی سی دو کمروں کی کوٹھی میں خود ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا ہے، اس کے بھائی بھابھی ہر وقت آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں، اس کی ماں بیچاری سارا دن باورچی خانے میں گزار دیتی ہے اور اس کا ابا سارا دن کھانستے اور اپنے بیٹوں کو برا بھلا کہتے، وہ بڑے مزے سے اپنے بیٹوں کو گالیاں دیتا ہے اور ان کا بیٹا اپنی بیوی کو گولیاں بکتا رہتا ہے اور بیوی اپنے شوہر کو، ایک بھائی نواز ہی ان سب میں بیچارہ ہے اپنی ماں سمیت سارا دن تانگہ چلاتا ہے اور جب گھر لوٹتا ہے تو کوئی اسے کھانا پانی کا پوچھے نہ پوچھے پیسوں کا پوچھتا ہے، ساری جیب جھاڑنے کے بعد صبح گھوڑے کی گھاس کے لئے پھر وہ گھر والوں سے ادھار پیسے لیتا ہے اور سو جھڑکیاں کھا کر بھی چپ رہتا ہے، میں کہتی ہوں ایسی معصومیت خدا کسی کو نہ دے۔'' ڈیوڑھی قریب تھی وہ سانس لینے کو رکی۔

''تمہارے منہ سے خدا کا نام سن کر بہت بھلا لگتا ہے امر کلہ۔''

''میں نے سوچا آپ پھر مجھے کلثوم، زینب، جویریہ کہیں گے وغیرہ۔''

''اب تمہیں کوئی کلثوم، جویریہ، زینب نہیں کہے گا۔'' ان کا لہجہ یاسیت بھرا تھا۔

''آپ جاتے جاتے مجھے سلو پوئزن دے دے کر مار دیں گے۔''

''ایسی امید رکھتی ہو اپنے کبیر بھائی سے؟'' وہ شکوہ بھرے لہجے میں اسے دیکھنے لگے۔

''آپ نے کہا تھا آپ میری کہانی سنیں گے، پر نہیں سنی۔''

''میرے پاس وقت کی بڑی قلت ہے امر کلہ۔''

''کلثوم کہیے، کہہ دیجئے زینب، جویریہ، آمنہ، فاطمہ، عائشہ، جو بھی۔''

''کس سے بھاگ رہی ہو، اپنے ماضی سے، اپنے نام سے خود اپنے آپ سے یا پھر اپنے خدا سے؟'' وہ نڈھال سی ہو کر دیکھنے لگی تھی۔

''اپنے خدا سے بھاگتی ہو تو سن لو وہ تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہے، چاہے کبیر بھائی چھوڑ دے، چاہے وہ مشکل نام والا چھوڑ دے، چاہے علی گوہر چھوڑ دے، مگر خدا کبھی نہیں چھوڑے گا، وہ تمہیں زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ دیتا رہے گا، کوئی نہ کوئی امید دیتا رہے گا، وہ تمہیں بیماری میں زندہ رکھے گا، بھوک میں کھانا کھلائے گا، پیاس میں مٹکا دکھائے گا صحرا میں رستہ دکھائے گا، جنگل میں خوراک دے گا۔''

''اسے چاہیے یا تو وہ مکمل طور پر مہربان ہو جائے کبیر بھائی یا پھر......''

''کبھی بھی اس سے اس کا غضب مت مانگنا بھول کر بھی نہیں امر کلہ۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''دوزخ کون مانگتا ہے کبیر بھائی ہر کوئی جنت کی تمنا میں پھرتا ہے موت تو مانگتا ہے نا جب زندگی

سے بیزار ہوتا ہے تو......تو گویا موت اس کا غضب ہے؟''

''اگر وہ دے تو عافیت ہے زندگی سے عافیت، چھٹکارا سو پریشانیوں سے لمبی پرسکون نیند، قیامت تک کی نیند، باڈی ریسٹ، اگر خود مانگی جائے، یا لی جائے تو دہکتی ہوئی آگ، پریشانی، ہمیشہ کا جاگنا۔'' وہ ابھی سانس لینے کو رکے تھے۔

''اور کچھ نہ کہیے گا کبیر بھائی۔''

''تم اس سے ڈرتی ہو بچے؟''

''لگتا ہے میرا اس کے ساتھ کوئی گہرا تعلق نہیں ہے، نہ ڈر نہ محبت کا۔''

''اس کے ساتھ کوئی تو لنک رکھو زینب، وہ ہمیشہ ساتھ ہونے کا احساس دیتا رہے گا جویریہ، وہ بڑا مہربان ہے کلثوم۔''

''وہ امر کلہ کے لئے کیا ہے کبیر بھائی؟ کیا کچھ نہیں، اس کے سارے تعلق جویریہ، کلثوم، زینب کے ساتھ ہیں۔''

''اس کا تعلق تو ہر اس چیز کے ساتھ ہے جو اس نے بنائی ہے جو اس نے نہیں بھی بنائی مگر دسترس میں تو سب ہے اس کے، وہ ان ساری چیزوں کا خدا ہے اور تم تو پھر بھی انسان ہو۔''

''وہ مجھ جیسی عام سی گنہگار بندی سے بھلا کیوں محبت رکھیں گے اس کے پاس تو آپ جیسے ہونہار پڑے ہیں۔''

''نہیں امر، ہم سے کہیں زیادہ ہونہار ہے اس کے پاس، ہم تو راہوں سے ابھی لڑ رہے ہیں ابھی رستے میں منزل کے متلاشی ہیں، پر وہ سب سے محبت رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے ہم اسے یاد کریں، کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ وہ کہتا ہے، چلو ایسے ہی ذکر کر دو جیسے اپنے ماں باپ کا کرتے ہو، جیسے آباؤ اجداد کا کرتے ہو، بس اس سے تھوڑا سا زیادہ تاکہ لگے کہ تم لوگ بھی مجھ سے محبت کرتے ہو، وہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اس سے محبت کریں، تم اگر اس سے کوئی رشتہ رکھنا چاہو تو محبت کا رکھنا۔''

''میں بہت بری ہوں کبیر بھائی، میرے اندر ناشکری، شکوہ شکایات کا ڈھیر ہے آپ سنیں گے تو آپ کا ایک اور ہفتہ نکل جائے گا۔''

''امر تم سارا کچھ اسے سنا دو۔''

''میں اپنی کہانی کسے سناؤں کبیر بھائی، ایک عام سے انسان کو سنانا چاہتی ہوں جو میری بات کا جواب دے، میں رونے لگوں تو میرے آنسو پونچھے، مجھے تسلی دے۔''

''تمہیں کوئی اچھا سا دوست ضرور ملے گا تمہیں کسی اچھے سے دوست کی ضرورت ہے امر کلہ۔''

''نہیں ملے گا کبیر بھائی اب لگتا ہے کہ میں اکیلے رہوں گی۔''

''کیسے نہیں ملے گا بچے، کیا تمہیں اتنی پریشانی میں وہ مشکل نام والا ھالار نہیں ملا تھا۔'' وہ بے ساختگی میں چونکا دیتے تھے۔

''کیا پھر امر ت نہیں ملی جو رحم کا جذبہ رکھتی تھی، کیا پھر میں نہیں ملا، پھر علی گوہر نہیں ملا؟ خدا نے کبھی تمہیں تنہا نہیں کیا امر کلہ۔'' وہ جیسے سن کھڑی تھی، کبیر بھائی ایک دفعہ پھر اپنے کہے ہوئے نام دہرائیں۔

''میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا؟'' وہ الجھ گئے۔

...آپ حالار کو اور امرت کو جانتے ہیں اور کس کس کو جانتے ہیں آپ؟"

"امرکلہ!" وہ سر پکڑ کر پکی سڑک کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔

"آپ مجھ سے کتنے جھوٹ بولیں گے کہ آپ میرا ماضی نہیں جانتے، یا آپ کو پتہ نہیں ہے، آپ کون ہیں کبیر بھائی، کس قسم کے بندے ہیں مجھے سچ سچ بتائیں آپ کو اس شہر کی قسم جہاں جانے کے لئے آپ بے چین پھرتے ہیں۔" وہ ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"اس شہر پر میری جان قربان، تمہیں میں کیا بتاؤں میں خود کتنا بے بس ہوں امرکلہ تمہیں کیا پتہ۔"

"مجھے سب بتائیں، کبیر بھائی مجھے اپنی کہانی سنائیں۔"

"برسوں کی کہانی لمحوں میں کیسے سناؤں گا امرکلہ، مجھے لگتا ہے تم نے مجھے باندھ دیا، مجرم بنا دیا، میں اپنا کہا ہوا بہت بھگتتا ہوں، اسی لئے میں تمہیں علی گوہر کے حوالے کر کے چلا گیا تھا کہ میں پھر کچھ کہہ کر گڑبڑ نہ کر دوں، مگر اس کے جانے کے بعد مجھے ہی تمہارے ساتھ رہنا تھا۔"

"آپ کس سے چھپتے پھرتے ہیں کبیر بھائی لوگوں سے یا خود سے۔" اس نے خدا کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ اسے پتہ تھا یہ شخص خدا سے آشنائی رکھتا ہے، وہ اس ہستی سے بھاگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

"میں یہ سب کرنا نہیں چاہتا، مگر مجھ سے ہو جاتا ہے امرکلہ، اب جب میں تم سے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہنے لگا ہوں تو میں تمہیں اپنی پوری کہانی نہ سہی مگر کچھ کچھ ضرور بتا سکتا ہوں، مجھے پتہ ہے گاڑی گھنٹہ لیٹ ہے، میرے پاس تھوڑا وقت ہے، میں چاہتا ہوں اس میں تم اپنی کہانی سنا دو۔"

"اور تمہیں مجھ سے سننا ہے بتاؤ کیا کریں؟"

"آپ کا ویزا لگ گیا؟"

"وہ کہتے ہیں نہیں، مگر مجھے پتہ ہے دو دن میں میری فلائٹ ہے کل مجھے ایئر پورٹ پہنچنا ہے پھر کسی بھی وقت میرا طیارہ پرواز پکڑے گا۔"

"میں دعا کرتی ہوں آٹھ گھنٹے کا سفر آپ کا چار گھنٹے میں طے ہو، آپ چار گھنٹے میرے ساتھ رہیں۔"

"تم چار گھنٹے کہو گی تو آٹھ گھنٹے لگ ہی جائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں کبیر بھائی جہاں پہنچنا آپ کا نصیب ہے وہاں آپ پہنچ کر رہیں گے، مجھے بس کچھ باتیں آپ سے پوچھنی ہیں اور کچھ بتانی ہیں۔"

"تم بڑی چالاک ہو امرکلہ! مجھے بار بار باندھ دیتی ہو، میں بھی کہوں پچھلے کئی سالوں سے میرے جانے کا پروگرام کیوں نہیں بن پاتا، اس روز بھی جانے لگا تھا کہ ٹرین میں ایک فنکار مل گیا، پھر جانے لگا تھا کہ تم نے روک لیا، بڑی بی کی وجہ سے رکا رہا، وہ بھی گزر گئیں، مگر اللہ نے تمہارے لئے مجھے یہیں روکے رکھا اب اگر آٹھ گھنٹے اور چاہئیں تو تمنا ہے کہ خدا تمہاری دعا قبول کرے گا اور میں آٹھ گھنٹے کا سفر چار گھنٹوں میں کر پاؤں گا۔"

"تو آپ بتا رہے تھے کچھ اپنے بارے میں، یہ بتائیں آپ غائب کیسے ہو جاتے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ مکمل بے بسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے، حالانکہ اسے ان کی بات پر یقین نہیں آیا تھا نہ ہی بے بسی پر رحم۔

☆☆☆

کسی طرح سے اس نے نئی ترتیب دے کر ایک اضافی ورکر کی جگہ نکال ہی لی تھی، تینوں پرچوں کا کام اس نے ایک کمرے میں سمیٹا ہوا تھا۔

ایک طرف سے مس یاسمین تھیں، جواب بچوں کی میگ کی ذمہ داری لئے ہوئے تھیں، ادبی پرچے میں امرت کی حد درجہ مداخلت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا انہیں اندازہ تھا کہ یہ لڑکی اسے ہارڈ ورکر بنا کر چھوڑے گی اور اسے لگ رہا تھا یہیں سارا ہارڈ ورک کرنے کے بعد وہ گھر کے کسی کام کے قابل شاید نہ رہیں، کیونکہ بہت زیادہ کام نہ کبھی سر پہ لیا تھا نہ ہی اتنا سنجیدگی سے دماغ کھپانے کی عادت تھی، بس کام چل رہا تھا ان کا بھی اور پرچے کا بھی، پھر کی پیشی کہاں تھی اور کیوں تھی اس سے نہ انہیں فرق پڑتا تھا نہ ہی ادارے کو۔

مگر یہ امرت ان سب کے لئے سر درد کا سبب ضرور بنی ہوئی تھی کچھ تو اپنی ہوشیاری کی بنا پر اس نے سیکریڑی کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا اپنے کام کی وجہ سے وہ اس کی ہر بات پہ لبیک کہہ بیٹھا تھا وجہ یہ بھی تھی کہ سب سمجھ رہے تھے کہ ابھی اس لڑکی کی اس سیٹ پر کتنی ضرورت ہے، اگر وہ اکیلے سارا کام سنبھال رہی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اب تھوڑا سا سر درد دیگر ورکر کے لئے کیا جان عذاب کرنے کے متبادل بھی نہیں سو تھوڑا تھوڑا سر درد سب ہی نے لے رکھا تھا کہ یہ لڑکی کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تبدیل کرواتی رہے گی، بس یہ اطمینان تھا سب کو کہ نوکری پکی ہے اس کی چیخ و پکار سے پرچے کی صحت پر اثر پڑ سکتا ہے مگر کسی کی سیٹ خالی نہیں ہو سکتی، سب اپنی اپنی جگہ پر فٹ تھے اور کسی نئے ورکر کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ دو لوگوں کا کام ایک مس امرت نے سنبھال رکھا تھا، مگر یہ چالاک لومڑی یہاں بھی ہوشیاری دکھا گئی، ابھی تک سب کو پتہ تھا کہ لڑکی کو کام سنبھالنا خوب آتا ہے، مگر جس خوبصورتی سے وہ کام کو پھیلا رہی تھی اس کا اندازہ اب جا کہ ہوا تھا، جب پوری ٹیم سیکریٹری کے روم میں جمع تھی۔

اور وہ نئے انگریزی میگ کے بارے میں ایڈوائس کر رہی تھی اور اس نے بہر حال یہ ثابت کر چھوڑا تھا کہ ایک نیا میگ نہ بلکہ شروع ہو سکتا ہے بلکہ چل بھی سکتا ہے جس کے لئے اندازاً دو ورکر چاہئیں مگر پوری ٹیم کو ملا کر فی الحال صرف ایڈیٹوریل کے لئے ایک ہی کافی ہے باقی کے چھوٹے موٹے کام اسی طرح بانٹ کر ہوتے رہیں گے دوسرے پرچوں کے ساتھ ہی، سیکریٹری کو کچھ خاص اعتراض تو نہ تھا کیونکہ پیسے اس کی جیب سے نہیں جانے تھے مگر ورکرز نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی تھی، سب کو یہی اعتراض تھا کہ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر بیٹھ جاتی ہے، ابھی کچھ دن پہلے اس نے رائٹرز کو پرچہ نہ بھیجنے پر اودھم مچایا ہوا تھا، حالت یہ تھی سندھی ادب کے پرچوں کی کہ مستقل لکھاری جن کی وجہ سے پرچے میں روشنی تھی وہی پرچے کی شکل دیکھنے کو ترسے ہوئے تھے، خود سے وی پی کرانے پر بھی پرچہ کبھی کبھار ہضم کر لیا جاتا تھا بڑی مشکلوں سے اس نے ادارے کی شاپ پر کئی دن چکر لگا کر احتجاج کیا تھا اور کئی لکھاریوں کو مفت پرچہ جاری کروایا تھا اس کا بس چلتا تو ایک اچھا اعزازیہ بھی جاری کروا دیتی مگر فی الحال یہ اس کے بس کا کام نہ تھا، ابھی کئی ایشو تھے جنہیں باری باری ہینڈل کرنا تھا، اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کبھی بورڈ والے اگر اس کی کارکردگیوں سے جوں ہی بیزار آ کر چلانے لگے تو اسے نکال باہر کیا جائے گا

مگر فی الحال ایسا ممکن نہ تھا کہ پرچے اس پر پوری طرح ڈپینڈز تھے اور ایک ڈیڑھ سال تک اس کے یہاں جانے کے چانسز ناممکن تھے، اسی لئے وہ بھی پوری طرح اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھا رہی تھی اور چار گھنٹے کی مغز ماری کے بعد سیکریٹری نے پرچے کی منظوری چیئرمین کے سپرد کر دی تھی، ہفتے کو چیئرمین کو بلا کر کوئی حتمی فیصلہ کرنا تھا، اس ضمن میں چھوٹی سی میٹنگ بھی رکھی گئی تھی اور وہ پوری طرح سے پرامید تھی کہ وہ اپنی بات منوانے میں نوے فیصد کامیاب رہے گی، باقی کہ دس فیصد کو دیکھ لیا جائے گا۔

☆☆☆

آج تو انہونی ہی ہو گئی وہ شام میں گھر پہنچی تو دروازہ کھولتے ہی سب سے پہلے عبدالحنان کو پایا ایک قدم دروازے کے اندر تو دوسرا باہر تھا۔

''آ گئیں آپ؟'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''السلام علیکم، کیسے ہو؟'' وہ دوسرے ہی لمحے اپنی حیرت پر قابو پا گئی تھی۔

''تمہیں پوچھنے کا خیال آ گیا جب سر پہ آ کھڑا ہوا ہوں تب۔'' وہ واقعی اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا تھا۔

''کب آئے تم بتایا نہیں۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی آہستگی سے۔

''بتا کر آتا تا کہ تم گھر ہی نہ لوٹتیں۔'' وہ طنزیہ مسکرا رہا تھا۔

''ایسا تو کچھ نہیں ہے حنان، تم بیٹھو، بیٹھو نا، کھڑے کیوں ہو۔''

''مجھے تم سے بات کرنی ہے امرت، ابھی اسی وقت، رہی بات بیٹھنے کی تو سوا تین گھنٹے سے میں بیٹھا ہی ہوا تھا اب بور ہو گیا ہوں، اچھا ہوا تم آ گئیں میں بس نکلنے ہی والا تھا۔''

''تو کھانا وغیرہ کھا لیا ہو گا آپ لوگوں نے۔'' وہ اس کی طرف اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑی ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''نہیں تمہارا انتظار کر رہے تھے، تم بیٹھو میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''امی مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے آپ حنان کو کھلا دیں، میں یہ دوائیاں انکل کو دے آؤں ذرا اور چینج کر لوں پھر بات کرتے ہیں، تم کھانا کھاؤ نا حنان۔'' اس کے لہجے سے کچھ گھبراہٹ ظاہر ہو رہی گئی۔

''بھوک تو میری بھی اڑ گئی ہے، چائے پی کر بیٹھا ہوں، تم دو منٹ بیٹھ کر بات کر لو پھر جانا ہے مجھے۔''

''جب اتنا انتظار کیا ہے تو دو منٹ بیٹھ جاؤ میں بس انکل کو دوائی دے کر آتی ہوں۔'' وہ دوائیوں کا تھیلا لئے کمرے میں چلی گئی اور جب ان کو دوائی کھلا کر باہر آئی تو وہ جوں کا توں کھڑا ٹہل رہا تھا۔

''میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔'' وہ بغیر رکے کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی، اب اسی بلا کو جھیلنا تھا۔

تیزی سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی اور جب باہر آئی تو وہ کمرے میں کھڑا اس کی وال پر لگے ایک اسکیچ کو دیکھ رہا تھا۔

''اب تو کوئی بہانہ نہیں ہے نا۔'' عجیب چبھتا ہوا لہجہ تھا اس کا، وہ بال باندھتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''تم سمجھ رہے ہو میں بہانہ کر رہی ہوں، کس چیز کا بہانہ۔''

''یہ تو تم خوب اچھی طرح جانتی ہو کہ کس چیز کا بہانہ، میں روز فون کرتا ہوں یا نمبر بزی ملتا ہے یا بند یا اٹھایا ہی نہیں جاتا۔''

''حنان میں اکثر سیل فون گھر بھول جاتی ہوں۔''

''میں رات کے وقت کرتا ہوں اکثر۔''

''میں سو رہی ہوتی ہوں۔''

''جب تمہیں خود پتہ ہے کہ تم جھوٹ مہارت سے نہیں بول پاتیں تو بہتر نہیں کہ یہ کوشش ترک کی جا سکے۔''

''حنان! او کے تم کہو، تمہارے شکوے بجا ہیں، مگر میں پچھلے کئی مہینوں سے بہت برے حالات سے گزری ہوں ایسے میں بات کرنے کا دل نہیں کرتا کسی سے بھی، کیا بتاؤں میں تمہیں۔''

''دفتر میں گونگی ہو کر بیٹھتی ہو کیا یا گھر آ کر زبان بند ہو جاتی ہے۔''

''دفتر والوں کو تو میرے بولنے پر ہی اعتراض ہے وہ تو میری زبان بندی کی دعائیں مانگتے ہوں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ماحول کو خوش گوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تم سارے جہان کو ڈیل کر رہی ہو، مل ملا رہی ہو سوائے میرے، پوچھنا چاہتا ہوں اس کی وجہ کیا ہے؟''

''تم خود سوچو اس کی کیا وجہ ہے، مگر ایسا سمجھتے ہو تو۔''

''صرف ایک وجہ ہے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے، جب تھی تب میں پورے جہان کے آگے تمہارے لئے اہم تھا اور جب نہیں ہوں تو پورے جہان میں میری جگہ کہیں نہیں، ہر رشتے کے ساتھ یہ گیم کھیلتی ہو تم امرت۔''

''مجھے گیم کھیلنا نہیں آتا حنان، اگر کھیلنا چاہوں تو بہت برا پرفارم کروں گی، اس سے بہتر ہے کہ کھیلوں ہی نہ۔''

''فی الحال تو صرف مسائل حل کرنے دو کرائسس سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہوں حنان۔''

''ایک بات بتا دو مجھے صرف، شادی کرو گی بھی یا مجھے ہمیشہ لٹکائے رکھو گی تم۔''

''تم سمجھتے ہو میں تم سے شادی نہیں کروں گی؟'' وہ اس کے منہ سے سننا چاہ رہی تھی۔

''مجھے سیملی جواب دے دو، تم کیا چاہتی ہو۔''

''فی الحال نہیں حنان، کچھ مسائل حل ہو جانے دو پلیز۔''

''تمہارے مسائل زندگی بھر کا روگ ہیں، مسائل سے شروع ہو کر مسائل پر ختم ہوتی ہے تمہاری زندگی۔''

''تو مت ان مسائل میں الجھو تم۔''

''اچھا، بہت خوب انکار کا عجیب جواز، بندوق میرے کندھے پر رکھ کر چلانا چاہتی ہو۔''

''بندوق چلانے والوں کے سخت خلاف ہوں عبدالحنان۔''

''مجھے غیر ضروری باتوں میں مت الجھاؤ امرت، ایک بات سن لو میری آسانی سے تمہاری زندگی سے نہیں نکلوں گا میں، بہت وقت لیا ہے تم نے میرا، استعمال کیا ہے مجھے، میرے احساس کو میری فیلنگو کا

فائدہ اٹھایا ہے تم نے وہ بھی ناجائز فائدہ، وہی حنان ہوں میں جس کے کندھے پر سر رکھ کر تم کبھی روتی تھیں۔"

"وہی حنان ہوں جو لمحہ لمحہ تمہارے ہر دکھ میں تمہاری ڈھال بن کر رہا ہے، وہی ہوں جس کے علاوہ تمہیں کوئی نظر نہیں آتا تھا، کانٹا بھی چبھتا تو مجھے آواز دیتی تھیں تم، وہی ہوں جس نے تمہاری خاطر اپنے بچپن کی منگیتر چھوڑ دی، تم سے تعلق جوڑ لیا اور اب تم اتنی سنگدل، مفاد پرست اور سلفیش ہو گئی ہو جو مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینک رہی ہو، ایک بار پھر سن لو، انسانوں کے ساتھ کھیلنے والے کبھی خوش نہیں رہتے مجھے دکھ دے کر تمہیں کبھی بھی، کہیں سے بھی وفا یا محبت نہیں ملے گی، مجھے اگر اپنی زندگی سے نکالو گی تب بھی میرا ماضی اور میں تمہارا پیچھا کروں گا، زندگی میری حرام کی ہے تم نے تو تمہاری بھی حرام ہو کر رہے گی۔" وہ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"اس بار جا رہا ہوں، اب آخری جواب چاہیے، اب یا تو بارات لے کر آؤں گا یا پھر جنازہ اپنا یا تمہارا، مار دوں گا میں تمہیں بھی اور خود کو بھی ختم کر دوں گا۔" وہ اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

"حنان رکو بیٹا میری بات سن لو۔" وہ اس کے پیچھے دوڑیں تھیں مگر وہ گیٹ پار کر گیا۔

"کہا تھا ایسا نہ کرو، ایک بار اس سے فون پر بات کر لو مگر تم اپنی ضد کے آگے کسی کی مانتی ہو۔" وہ اس کے جانے کے بعد فوراً کمرے میں آئیں جہاں وہ سر پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کتنے دکھ اور غصے میں گیا ہے وہ، اچھا نہیں کیا تم نے امرت۔"

"فی الحال جو لیکچر وہ پلا گیا ہے وہ کافی ہے، آپ کل کے لئے رکھ لیں یہ ملامت ایک وقت میں ڈبل ڈوز تو ری ایکشن کر دے گا۔"

"تمہیں ذرا اثر نہیں ہوا اس کی بات کا۔" وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگیں۔

"بہت اثر ہوا ہے یقین جانیں، اپنی موت اس کے ہاتھوں یقینی لگ رہی ہے۔"

"امرت اسے سنجیدگی سے لینا شروع کرو، کر لو شادی مت تنگ کرواسے۔"

"ٹھیک ہے آپ کوئی بزنس شروع کر لیں اپنے اور انکل کے لئے، میں کر لیتی ہوں شادی میری طرف سے سب جائے بھاڑ میں۔" امرت کے اندر آگ لگی ہوئی تھی جو وہ لگا گیا تھا اپنی زہریلی باتوں اور لہجے سے، گولی یا زہر سے ہی نہیں۔

مرا جاتا کچھ اور بھی ہوتا ہے اندر سے مارنے کے لئے، وہ حللوار جو انسان اپنے منہ میں لئے لئے پھرتا ہے اور خصوصاً عبدالحنان کی وہ حللوار بس اسی کے خلاف کام کرتی تھی، جو ابھی بھی کام دکھا گئی۔

☆☆☆

وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے سو رہا تھا، اتنی طویل نیند ہوش سنبھالنے کے بعد شاید پہلی مرتبہ لی تھی اس نے، اس نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر تجوری کے ادھ کھلے خانے پر جس سے سرخ کوٹ کا کپڑا جھانک رہا تھا، اس سرخ کوٹ کو شاید زبردستی دھنسایا گیا تھا اس تجوری میں، جیسے کسی کتے بلی کے بچے کو پنجرے میں ڈالا جاتا ہے اور وہ باہر آنے کے لئے سلاخوں سے دو پر مار رہا ہوتا ہے اسے لمحہ بھر کے لئے سرخ کوٹ کے ساتھ کی گئی ناانصافی پر رحم سا آیا تھا اور اس نے جیسے ہی سیف کی تجوری کا خانہ کھینچا چرڑاٹ کی

آواز سے وہ رک گئی، تجوری جام ہو گئی تھی جس کی درزوں میں زنگ لگ گیا تھا، اس نے سرخ کوٹ پر ہاتھ مارا تو کسی اور کپڑے کی گٹھڑی کا احساس ہوا ابھی وہ اٹھانے ہی لگی تھی گوہر کی طرف دیکھا تو وہ نیند کی حالت میں کروٹیں بدل رہا تھا، گویا اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو، تو گویا تمہاری ٹیلی پیتھی کی آزمائش ہے، وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرائی تھی۔

مگر وہ چوری ہی کیا جو پکڑی نہ جائے، تجوری میں ہاتھ ڈالا تو دروازہ فوراً کھلا تھا۔

"عمارہ جانا نہیں بیٹا امرت کے دو فون آ چکے ہیں۔" وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھیں۔

"اوہ اماں جی بس جا رہی ہوں۔" شرمندگی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا، گوہر اب دوسری طرف کروٹ لئے خراٹے لے رہا تھا۔

"اس کے کپڑے سوکھ گئے ہیں، پورا تھیلا گندا ہو رہا تھا، ساری چیزیں نکال کر دھو کر رکھا ہے مگر کپڑے بعد میں رکھ لینا تجوری صاف کر کے پہلے نکلنے کی کرو بچے۔" وہ اس کے سفری بیگ کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔

"جی بہتر۔" اس نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔

"تو چوری ادھوری اور پکڑ بھی، شکر ہے اللہ کا، زندگی کی پہلی چوری کرتے کرتے لوٹ آئی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا تھا اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے، چینج کیا اور فائل اٹھائی، وہی ڈگریوں والی اور بیگ کندھے سے لگا کر کمرے میں جھانک کر اللہ حافظ کہا اور گھر سے باہر کی راہ لی، رکشے والا تو پہلے سے ہی آ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

صبح سویرے بچے اسکولوں کی طرف اور کاروباری کاروبار کی نوکریاں والے نوکری کو اور مزدوری کرنے والے مزدوری کو جا رہے تھے، ہر کوئی اپنے اپنے کام سے لگا ہوا تھا۔

وہ فکرمندی سے اردگرد پر نظر رکھے ہوئے بہت کچھ سوچ رہی تھی اس کے بارے میں جو کروٹ لے کر سویا ہوا تھا، بے فکر سا۔

☆☆☆

"آؤ عمارہ تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے۔" وہ کمپوزر کے ساتھ بات کر رہی تھی جب اسے سامنے سے آتا ہوا دیکھا تھا۔

"تو آپ یہ پیپر لے جائیں اور دیکھئے گا پہلے کی طرح غلطی نہیں ہونی چاہیے مشین کو فیشن لکھ دیتے ہیں۔" وہ اسے تاکید کر کے اس کی طرف مڑی۔

"کیا حال ہیں عمارہ گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ بولے میں اس کا حال احوال بھی نہ پوچھ سکی تھی، وہ اسے لے کر سیکریٹری کے روم میں آ گئی، کچھ دیر بات چیت کے دوران سیکریٹری اس کے پیپرز چیک کرتا رہا اور پھر سرسری بات چیت کے بعد اوکے کر دیا گیا، اس کا ورک آج سے شروع تھا، مگر آج تعارفی مراحل طے ہونے تھے، وہ امرت کے ساتھ اپنے روم میں آئی جہاں اسے اس کی ٹیبل دکھائی گئی اور وہ اسے کام سمجھانے لگی۔

"اصل میں ہم نیا پرچہ شروع کر رہے ہیں، انگلش میگ تم اگر چاہو تو اس کے لئے کام کرو کیونکہ انگریزی تو تمہاری بہت اچھی ہے مگر میرا پرچہ بھی تمہارے سامنے ہے چاہو تو مل کر کر لیں گے، لٹریچر کی

بک پڑھ سکو ان دنوں تو اور بھی اچھا ہوگا، اندازہ تو ہوگا تمہارا خیر مگر......'' وہ بولتے بولتے کچھ سوچتے ہوئے رکی۔

''مجھے لگتا ہے میں یہ کام نہیں کر پاؤں گی۔'' وہ عجیب سا محسوس کر رہی تھی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے یہاں ہونے کی وجہ امرت ہے اور اس کی کوششیں شاید۔

(اب اس سے مسکرا مسکرا کر بات کرنا پڑے گی، بات بات پر شکریہ ادا کرنا پڑے گا) وہ سوچ کر رہ گئی اور یہ سوچتے ہوئے اس کی پیشانی پر شکن ابھری تھی۔

''تو اگر تم چاہو تو کل سے کام شروع کر دو۔'' امرت اس کی بیزاری کو محسوس کر چکی تھی۔

''نہیں...... میں ابھی کرتی ہوں۔'' اس نے ٹیبل پر پڑے پیپرز اٹھا لئے۔

''تم یہ کہانی پڑھ لو دیکھو اس میں کہیں جھول تو نہیں ہے۔'' اس نے ایک افسانہ اس کے سامنے رکھا تھا۔

''مجھے نہیں اندازہ ہو سکتا میں نے کبھی کہانیاں نہیں پڑھیں، دیکھو یہ بات مس یاسمین کے سامنے مت کہنا شکر ہے وہ ابھی باہر ہیں۔''

''وہ کون ہیں؟''

''وہی جو تیسری ٹیبل پر بیٹھتی ہیں سب سے، سینئر ہیں یہاں پر۔''

''میں...... جا رہی ہوں مجھے یہ واقعی کام نہیں آئے گا، سوری۔'' وہ فوراً اٹھی تھی کرسی سے۔

''عمارہ! بیٹھو کیا کر رہی ہو۔''

''نہیں سوری مجھے چلنا چاہیے یہ کام میرے بس کا نہیں ہے، مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، تمہارا شکریہ، تم لوگ کسی اور کو رکھ لو۔'' وہ تیزی سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''عمارہ رکو تو سہی۔'' وہ اس کے پیچھے باہر آئی تھی مگر سامنے سے آتی مس یاسمین اور سیکریٹری کو دیکھ کر وہ وہیں رک گئی۔

''یہ کہاں جا رہی ہیں؟'' سیکریٹری نے عمارہ کو نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''یہ کل سے کام پر آئیں گی آج ویسے بھی پرچہ نکل گیا ہے، بس کچھ چیزیں رہتی ہیں جو میں دیکھ رہی ہوں، ایک خطوط کا سلسلہ ہے اور کچن کا، وومین میگ کے لئے جو مس یاسمین کر رہی ہیں اور کمپوزر سے تو میں بات کر آئی ہوں۔''

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے، پہلے بھلے وہ کام کچھ سیکھ لیں ویسے بھی ہم اگلے ماہ سے نئے میگ کی تیاری شروع کریں گے۔'' سیکریٹری مطمئن ہو کر باہر نکل گیا تھا اور مس یاسمین کمرے میں اصولاً تو اسے بھی کمرے میں ہی جانا تھا مگر مس یاسمین کے سوالوں سے بچنے کے لئے اس نے کمپوزنگ ڈیپارٹمنٹ کی راہ لی، دل میں خدشے سر اٹھا رہے تھے۔

''کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑنا عمارہ میڈم۔'' اسے رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے، آج پہلی بار وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی کہ آف ہو اور وہ فرار ہو جائے، ادھر عمارہ رکشے میں بیٹھی کیسی مطمئن تھی۔

(نہ اب بات کرنا پڑے گی نا شکریہ ادا کرنا ہوگا۔)

☆☆☆

وہ آئی تو گوہر نے چھڑی تھام رکھی تھی اور جالے اتار رہا تھا، وہ صحن میں ہی ٹھہر گئی تھی۔

''اس طرف سے گزر کر اندر جاؤ ادھر ڈسٹ ہے۔'' اس نے رومال سے ناک تک چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اسے سامنے دیکھ کر رکا اور کہنے لگا۔

وہ دوسری طرف سے ہوتی اندر گئی اور کمرے کی کھڑکی سے برآمدے پر نگاہ کی تو کچھ تبدیلی کا احساس ہوا، وہ بھاری اسٹول اور لکڑی کی سیڑھی جسے برآمدے کے کونے پر لگا کر وہ چھت پر جاتے تھے اور اسٹول جو گھر کی مرمت کے دوران رکھا گیا تھا اور پھر وہیں رہ گیا تھا کہ اتنے بڑے اور بھاری لکڑی کے اسٹول کا عمارہ کے ہاتھوں تو کیا ابا کے کمزور ہاتھوں سے سرکنا دشوار تھا سو بہرحال ان لوگوں نے اس برآمدے کی چھت کو چھوتے ہوئے اسٹول کو گھر کے فرد کی طرح قبول کر لیا تھا، مگر آج وہ صحن کے احاطے میں بالکل کونے پر رکھا تھا جہاں سے دیوار کا پلستر اکھڑا ہوا تھا سو وہ اکھڑی دیوار کو ڈھانپنے کا کام دے گیا اور میز کی ایک چادر سے اچھی طرح سے اس اسٹول کے سر کو کور کیا گیا تھا، باقی کی کچھ چیزوں کی ترتیب بھی مختلف نظر آئی تھی، ٹیبل کو دو کرسیوں کے ساتھ کچن کے سامنے رکھا گیا تھا، ایک کرسی جو ٹوٹی ہوئی تھی اسے لوہے کی پٹی اور کیلوں کی مدد سے جوڑا گیا تھا اس طرح کے وہ بیٹھنے کے قابل بن گئی تھی۔

دروازوں پر سفید چونے کا رنگ کیا گیا تھا جو ابھی تازہ تھا اور اب جالے اتارنے کا کام باقی تھا، گھر کچھ کھلا ڈھلا اور زیادہ ہی صاف ستھرا سا لگ رہا تھا۔

وہ قدرے حیران تھی اور اس خوشگوار حیرت نے باقی لوگوں کو بھی جکڑ رکھا تھا، وہ اماں ابا کے کمرے میں گئی تو وہاں کا نقشہ اور تھا اور کچھ نہیں تو چیزوں کی ترتیب بدل دی گئی تھی الماری کی جگہ چارپائیاں دونوں ایک ساتھ سائیڈ پر چھوٹی سی میز جس پر ابا کی دوائیاں اور ڈائری رکھی تھی، ترتیب بدلنے سے کچھ نئے پن کا احساس ہوا تھا اور گوہر نے اپنے کمرے کے پردے اتار کر یہاں لگا دیئے تھے، اس سے خستہ دیواروں کا اکھڑا ہوا روغن ڈھک گیا تھا، وہ حیران حیران سی ہر اک چیز پر توجہ کر رہی تھی جب ابا کے قہقہے اور اماں کی مسکراہٹ نے متوجہ کیا۔

''کیسا لگا عمارہ یہ سب ہمارے گوہر نے جوہر دکھا ہی دیئے۔'' ابا بالآخر ماننے کو تیار تھے۔

''میں سوچ رہی ہوں ابا کہ اماں کے بیٹے میں سگھڑ بیٹیوں جیسی خصلت پیدائشی ہے یا ابھری گئی، اگر ہاں تو کہاں سے؟ اور اگر تھی تو عمر کے چھبیسویں سال کے بعد کیوں رونما ہوئی۔''

''بچے وہ مشہور کہاوت ہے نا کہ اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، بلکہ بھول ہی جاتے ہیں، میں سوچ رہی ہوں اب گھر کے کاموں میں کوئی ہاتھ بٹا دے گا۔'' گھر آتے وقت اس کا موڈ بہت برا تھا مگر آنے کے بعد اس کا موڈ اچھا سا ہو گیا تھا۔

''تم بتاؤ نوکری کا کیا بنا، دیکھو لڑکوں والی ذمہ داریاں ہماری بچی نے اٹھا رکھی ہیں۔'' وہ آج خاصے پرامید نظر آ رہے تھے۔

اسے سمجھ نہیں آیا فوری طور پر کیا کہے، کہ ہاتھ پر دھری نوکری کو لات مار کر چلی آئی۔

''ابا آج انٹرویو دیا ہے اچھی امید تو ہے پھر دیکھتے ہیں آ جائے گا ایک دو دن میں جواب۔''

''انشاء اللہ اچھا آئے گا بچے، پریشان نہ ہونا تم۔''

''نہیں ابا بس بیٹھوں گی نہیں پروفیسر غفور نے ایک اور جگہ متعارف کروایا تھا کل وہاں جا کر بھی

دیکھوں گی پھر دیکھتے ہیں۔"

"بیٹا پہلے ایک پرچے کا رزلٹ تو آنے دو پھر کہیں اور جانا۔"

"ہاں خیر، کچھ کھایا پیا ہے یہ کام بھی آپ کے سگھڑ بیٹے نے تو نہیں کرلیا۔" (اسے عجیب سی جیلسی سی ہو رہی تھی اس سے)۔

"یہ کام تو تمہارا ہے، آٹا گوندھ آئی ہوں میں چپاتی ڈالتی ہوں تم سالن بھون لو۔"

"نہیں اماں بیٹھیے آپ، میں دیکھ لیتی ہوں، پالک ابال لی ہوگی آپ نے صرف بھوننا ہی تو ہے، میں دیکھ لیتی ہوں۔" وہ باہر آئی تو جھاڑو دے کر گوہر سارا کچرا ایک ڈبے میں لے کر باہر جا رہا تھا، اس کی ہنسی چھوٹ گئی کچن کی طرف جاتے ہوئے۔

"یہ دن بھی دیکھنا تھا، باہر کی آوارہ گردیوں سے فرصت ملی تو کیا ذمہ داری گلے میں ڈال دی۔" وہ ہنڈیا چڑھا کر دوسری طرف آٹا نکالنے لگی۔

"عمارہ پہلے سالن بھون لو پھر روٹی ڈالنا۔" اندر سے اماں کی آواز آئی، وہ بھی جانتی تھیں کہ دو کام ساتھ کرتے ہوئے ہمیشہ ایک بھی نہیں دونوں کام خراب ہوتے ہیں۔

عمارہ نے سر جھٹک کر آٹا واپس فریج میں رکھا اور سالن میں مسالے اور تیل ڈال کر بھوننے لگی۔

"کوئی تو کام ڈھنگ سے کر عمارہ بی بی۔" وہ خود کو ملامت کر رہی تھی کام کرتے، اس کا سالن مکمل ہوا تھا اور گوہر نہا دھو کر فریش ہو کر باہر آیا تھا اور کچن سے کھانا پکانے کی خوشبو اسے اندر لے آئی۔

"بڑی بھوک لگی ہے عمارہ جلدی سے دو چپاتیاں نکال دو۔" وہ کف فولڈ کرتا ہوا فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پینے لگا۔

"بڑی احساس ذمہ داری جاگ اٹھی ہے۔" وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

"تمہیں اس پر بھی اعتراض ہے کیا؟" وہ فریج بند کر کے اس کی طرف مڑا۔

"مجھے کیوں اعتراض ہوگا، اچھی تبدیلی ہے۔" وہ اس کی طرف بغیر دیکھے بات کر رہی تھی۔

"میں نے سوچا تم باہر کے کام کرتی ہو تو میں اندر کے کام دیکھ لوں۔" وہ خود اپنی ہنسی اڑانے لگا تھا۔

"میں اندر کے کام بھی دیکھ لیتی ہوں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں پریشان تو نہیں ہوں، تم سالوں سے مشقت کرتی ہوئی آئی ہو سوچا تمہارا ہاتھ بٹا لوں، کل ایسا کریں گے ہم دونوں مل کر نوکری ڈھونڈنے جائیں گے، پھر واپسی پر گھر کے کام بھی ساتھ کرلیں گے اچھے بہن بھائیوں کی طرح۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

چپاتی اتارتے ہوئے عمارہ کا ہاتھ توے سے مس ہو کر جلا تھا اس نے فوراً انگلی منہ میں ڈال دی تو پوری طرح جل رہا تھا اور چپاتی آدھی جلی ہوئی تھی۔

گوہر نے ہاتھ بڑھا کر گیس ہلکی کی اور اسے چپاتی ڈالنے کا اشارہ کیا۔

"میری کوئی بہن نہیں ہے نا، بس منہ سے نکل گیا، تم میری بہن نہیں مگر دوست تو ہو نا۔" وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

"تم جو سمجھو وہی ہوں، جو رشتہ رکھنا چاہو، چاہے تو کوئی رشتہ نہ رکھو۔" اس نے اوپری دل سے کہا تھا۔

"عمارہ! بچپن میں جب میں کچھ بھی غلط کرتا تھا تو تم مجھے چھتر مار کر کہتی تھیں میں تم سے آٹھ ماہ بڑی ہوں اور تمہاری بہن بھی میں ہوں، بھائی بھی میں ہوں، دوست بھی میں ہوں، خبردار کسی کے ساتھ کھیلنے کی ضرورت نہیں، محلے کی لڑکیاں ہمیشہ مجھے مارتی تھیں اور تم میری طرف سے ہر ایک کے ساتھ لڑ آتیں اور مجھے بچوں کی طرح تحفظ دیتی تھیں، ایسا کیا ہو گیا ہے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے درمیان اتنے فاصلے اتنی اجنبیت آگئی ہے۔"

"تمہیں آج یہ فاصلے نظر آئے ہیں مجھے ہمیشہ سے نظر آتے تھے، تمہارے خواب، تمہاری ترجیحات ہمارے ماحول، ہمارے ذہنوں سے بہت نرالی ہیں، تم نے خود ہی عجیب رستوں پر قدم رکھ دیئے اور کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا، میٹرک میں برے نمبر آنے کے بعد جیسے تم نے کبھی پڑھائی پر توجہ نہیں دی، تم نے کچھ بھی ٹھیک نہیں کرنا چاہا بلکہ رستہ بدل لیا، تب سے تمہاری بغاوت تمہاری آوارہ گردی، تمہاری لاپرواہی کا بھگتان بھگت رہے ہیں اور اب بھی مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم چیزیں بدل کر اس گھر کو خود کے لئے کچھ قابل بنا رہے ہو، تم شاید زیادہ دیر تک یہاں ٹک نہ پاؤ، چار دن میں دل پھر بھر جائے اور پھر راستہ بدل لو۔" اس نے توے پر آخری روٹی ڈالتے ہوئے جیسے گفتگو کا اختتام کیا اس پر اپنی بے یقینی پوری طرح آشکار کر کے۔

"سب چھوڑ دیا ہے میں نے لور لور پھر کے تھک گیا ہوں، اب سوچ رہا ہوں مشقت کے معنی تبدیل ہونے چاہئیں، جو وقت اِدھر اُدھر دیا ہے وہ گھر والوں کو دوں گا، جن کا حق ہے نوکری ڈھونڈوں گا عمارہ، نہیں ملے گی تو مزدوری کروں گا اس قابل بھی نہ رہا، کسی ہوٹل کا بیرا لگ جاؤں گا، پتھر ڈھونے والا کام کروں گا، کسی کے گھر کا نوکر لگ جاؤں گا، زیادہ نہیں تو رکشہ ڈرائیور بن جاؤں گا، مگر بھوکا نہیں مروں گا نہ کسی کو مرنے دوں گا، دیکھنا ایک دن تمہاری بڑے گھر میں دھوم دھام سے شادی کروں گا، ڈھول شہنائیوں کے ساتھ، تمہیں ڈھیر ساری خوشیاں دوں گا عمارہ، پتہ ہے میرے سارے رشتے تمہارے ساتھ ہیں، میری بہن، میرا بھائی، میری دوست میری ساتھی، سب رشتے تمہارے ساتھ ہیں سارے رشتے نبھاہوں گا۔" اس کی آنکھوں میں پانی جب آنسوؤں کی شکل اختیار کر گیا اور گلہ بیٹھ گیا آواز بھر آئی جب الٹے کف سے آنکھیں رگڑ کر، پیالی میں نکالا ہوا سالن پلیٹ میں رکھی دو چپاتیاں جن میں ایک جلی ہوئی شامل تھی اٹھا کر کچن سے باہر نکل کر سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا، اسے پتہ تھا اب اس کے لئے کھانا کھانا مشکل ہو رہا ہوگا۔

ادھر عمارہ نے دوپٹے سے چہرہ رگڑا، ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اماں ابا کے سامنے روٹی رکھ کر اپنا حصہ اپنے کمرے میں لے آئی جس کی ترتیب بھی کچھ نیا ہونے کا اعلان کر رہی تھی ایک طرف عمارہ آنکھیں رگڑتے ہوئے نوالہ نگلنے کی کوشش کر رہی تھی اور دوسری طرف علی گوہر کا حلق کڑوا ہو چکا تھا اور وہ کتنے دنوں بعد ویسے رو رہا تھا جیسے بچپن میں ضد کرتے وقت روتا اور موٹے موٹے نوالے ساتھ لیتا رہتا تھا تب اماں کہتی تھیں روتے ہوئے نوالہ اٹک جائے گا بچہ کھاتے وقت نہیں روتے اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ روتے وقت نوالہ اٹک جائے تو روتے وقت نہیں کھاتے، مگر وہ کھا رہا تھا اور نوالہ بھی اٹک رہا تھا اور وہ روتے روتے ہنس بھی رہا تھا خود پر۔۔

نام ہے اس کا علی گوہر اور کام ہے اس کا لور لور پھرنا، وہ خود پر ہمیشہ سے ہنستا ہوا آیا تھا۔

☆☆☆

"یار ھالار اب میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ پہلے میں تمہیں ہی یاد کر کر کے رولیا کرتا تھا اب اپنا قائم مقام شہزادہ بڑا یاد آتا ہے مجھے، کوئی دو تین سال چھوٹا ہو گا تم سے مگر لگتا سترہ سال کا شہزادہ ہے، جتنا وہ جانتا ہے اتنی معصومیت اور بے خبری چھائی ہے اس کے چہرے پر۔"

"بہت ہو گئیں تعریفیں ابا جل جل گیا ہوں بخش دیں اب، مجھے دیکھنے کے لئے ترستے تھے اور اب محبوبہ بدل ڈالی آپ نے، دیوار پر دے ماریں یہ ٹیبلیٹ کیونکہ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی، میں تو سمجھ رہا تھا آپ مجھے دیکھتے ہی فدا ہو جائیں گے کہ کیسا فٹ رکھا ہے خود کو کوئی غم نہیں لگنے دیا ہے مگر آپ کی توٹون ہی بدلی ہوئی ہے۔" وہ بہت زیادہ ناراض ہو گیا تھا ان سے۔

"یار مت خفا ہوا کر ھالار، تجھے دیکھ دیکھ کر تو جیتا ہوں یار میرے۔"

"رہنے دیں ابا فنکاری نہ کریں آپ میں آف لائن ہو رہا ہوں، سچ کہتے ہیں جب کوئی قریب آئے تو اس کی اہمیت نہیں رہتی، اب آٹھ سال انتظار کرتے رہیں میرا، میری بلا سے۔" وہ کہتا ہوا آف لائن ہو گیا اور فنکار نے جذباتی اور ضدی بچوں کی طرح ٹیبلیٹ اٹھا کر دیوار پر دے مارا، پھر اٹھایا، پھر مارا، یہاں تک کہ وہ نازک سا ٹیبل پرزوں میں تبدیل نہ ہو گیا اور پھر وہ فرش پر بیٹھ گئے یہ بھی نہیں سوچا کہ کتنے پیسے لگتے ہونگے چیزوں پر۔

اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"عبدالہادی کبھی یہ پیسہ تیرے پاس نہیں ٹکے گا کیونکہ تو نے کبھی اس روپے کی قدر ہی نہیں کی۔" اسے کسی کی کہی گئی بات یاد آ گئی۔

"ترسے کا تو ٹکے ٹکے کو۔" اپنے سگے بھائی کی دی ہوئی بددعا جو تھی۔

"میرے ھالار کے پیسے، کتنی محنت کرتا ہو گا وہ، پڑھنے کے ساتھ ساتھ کماتا بھی ہے، سب پیسے ضائع۔" وہ دکھ سے ٹوٹے شیشے کی کرچیاں پرزے اکٹھے کر کے ایک تھیلے میں بھرنے لگا اور تھیلی اپنی الماری کی تجوری میں رکھ دی جہاں باقی کچھ ٹوٹی پھوٹی نشانیاں چھپا رکھی تھیں، ان میں اب ایک اور کباڑے کا اضافہ ہو گیا تھا، وہاں سے ایک سرخ کوٹ غائب تھا اور انہیں فوراً احساس سا ہوا۔

مگر دوسرے ہی لمحے تسلی ہوئی قائم مقام شہزادے کے لوٹنے کی، کیونکہ وہ امانتیں لوٹانے صحراؤں میں بھی نکل جاتا تھا۔

فنکار کو پتہ تھا کہ گوہر سرخ کوٹ کے بہانے ہی آئے گا، یہی سوچ کر ذرا تسلی ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی تھی، دوڑ کر فون اٹھالیا جو اپنے شہزادہ اول کا ہی تھا جس سے ابھی ٹکر ہوئی تھی، وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔

"ھالار! میں نے ٹیبلیٹ دیوار پر دے مارا، وہ پرزے پرزے ہو گیا، ھالار آئندہ مجھ پر پیسہ ضائع مت کرنا۔"

"اب جب میں لوٹوں گا تو مجھے بھی دیوار پر دے ماریئے گا ابا، جب تک میرے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، کیونکہ خود آپ کے پیچھے ضائع کرنے کا عہد تو کر ہی چکا ہوں پھر اس معمولی سے ٹیبلیٹ کی کیا حیثیت تھی بھلا۔"

"ھالار اس سے پہلے میں خود کو نہ دیوار پر دے ماروں یہاں تک کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں۔"

"ابا خدا کے لئے عزت دینے کا کوئی ایک حربہ تو چھوڑ دیں۔"

"ھالار مجھے جدائی راس آ گئی ہے، مجھے بھوک راس آ گئی ہے، مجھے تنہائی راس آ جانی چاہیے، میں تمہیں اب نہیں تنگ کروں گا یہاں تک کہ آٹھ ماہ دس دن گزر جائیں گے اور تمہیں اسی فون سے کوئی افسوس ناک خبر ملے گی پھر دوڑے دوڑے آنا بچے۔"

"سچ ہے کہ اذیت کا کوئی حربہ نہیں چھوڑیں گے آپ، دل کرتا ہے سر دے ماروں دیوار پر، یہ تین سال میں نے یہاں کیسے گزارے ہیں اس کا مجھے ہی پتہ ہے۔"

"ایسا سوچنا بھی مت ورنہ وہ آٹھ ماہ آٹھ دنوں میں آ جائیں گے۔"

"ابا! کبھی تو دل خوش کرنے والی بات کیا کریں یار۔"

"کیا دل خوش کرنے والی بات کروں، شادی کے لئے تو نہیں مانتا، جاؤں تو کہاں جاؤں ھالار۔"

"ابا اس کے علاوہ خوشیاں مر گئی ہیں کیا بھلا۔"

"ابا کی جان...... لوٹ آؤ، فنکار ٹوٹ چکا ہے۔"

"تو بلا لیں نا، اپنے قائم مقام شہزادے کو۔"

"ھالار دیکھ اب کوئی قیمتی چیز نہیں میرے پاس توڑنے کے لئے سوائے خود میرے اگر وہ چاہتا ہے تو صاف صاف بتا دے۔"

"اُف ابا! اچھا چھوڑو، چلو نئی بات کرتے ہیں۔"

"نئی بات کیا ہے بھلا، تمہیں لڑکی مل گئی، تم نے نکاح کر لیا۔"

"ابا نکاح سے پہلے افیئر چلایا جاتا ہے۔"

"اب ایک افیئر ناکام رہ چکا ہے اب کیا چلنا ہے اور نکاح کے لئے سیدھا رشتہ لے جانا پڑتا ہے لڑکی کے گھر میاں، یہ افیئروں اور چکروں والی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں بچے، مجھے ہی دیکھ لے۔"

"ابا ہر چیز پر اپنی مثال مت دیا کریں۔"

"یار تیر کسی اور پر پھینکنے کی بجائے خود پر نشانہ رکھنا چاہیے بچے تاکہ پتہ چلے کہ درد کیا ہوتا ہے اور درد کا احساس کیا ہوتا ہے۔"

"روز نیا تیر مارتے ہیں خود کو، حد ہے۔"

"ہاں یار اب تو سوؤں کا ڈھیر ہو گیا ہے، وہ کہانی یاد ہے نا کہ ایک شہزادے کے پورے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں کوئی شہزادی رستہ بھول کر آتی ہے پانی کی تلاش میں اور شہزادے کو پار کر کے مٹکے تک جانا ہوتا ہے، پھر وہ بیچاری سوئیاں نکالنے بیٹھ جاتی ہے اور آخری سوئی نکالنے کے بعد شہزادہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔" کہانی ابھی رستے میں تھی کہ دروازہ بری طرح بجا تھا۔

"کیا ہوا ابا کوئی خود کو دیوار سے مار رہا ہے کیا۔" وہ جان بوجھ کر مسکرایا۔

"نہیں شہزادے کوئی خود کو دروازے سے مار رہا ہے۔"

"جائیں ابا دیکھ لیں شاید پانی کی تلاش میں کوئی سوئیاں نکالنے والی شہزادی ہو۔" وہ باقاعدہ ہنسا تھا۔

"بہت بڑا بدمعاش ہے تو ھالار، بالکل اپنے باپ فنکار پر گیا ہے۔"

"میرے منہ کی بات چھین لی ابا۔" قہقہہ پھر بے ساختہ تھا۔

"تو نے تو نوالہ چھین رکھا ہے میرے منہ کا جب کھاتا ہوں تیری یاد آتی ہے پتہ نہیں کھایا ہوگا کھانا یا سڑکیں ناپتا ہوگا۔"

"اچھا جائیں دروازہ نہ زخمی ہو جائے ابا۔" اس نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون رکھا اور فنکار ہانپتا ہوا دروازے تک پہنچا۔

"کیا مصیبت ہے بھائی صبر کرو ذرا۔"

"انکل پانی چاہیے۔" دو چار بچے میدان سے کھیلتے ہوئے لوٹے تھے۔

"چلو میرے باپ چچا تایا ماموں، پانی پلوادوں۔" وہ سب کو اندر لے آئے اور باری باری پانی پلوایا اور بچے پانی پیتے ہی بھاگ گئے۔

"یہ ھالار ہمیشہ خواب دکھاتا رہے گا مجھے......اوں ہاں، سوئیاں نکالنے والی شہزادی آئی ہے۔"

☆☆☆

شام نے اپنے پر پھیلائے تھے اور چھوٹا سا گھر جگمگا رہا تھا، گوہر نے برآمدے کی بیرون دیوار پر رنگین ٹیوب لائٹس نصب کی تھیں۔

"دیکھنا اس بار بجلی کا بل زیادہ آئے گا، یہ لڑکا بھی نہ، اب کیا ضرورت تھی یہ لائٹس لگانے کی۔" انہیں زندگی میں پہلی بار گوہر کی کسی حرکت سے اختلاف ہوا تھا۔

"ارے بی بی آجائیں گے پیسے تم بھی نا، بچے نے خوشی سے لگائی ہیں اب ان دو لائٹوں کا کوئی ہزار روپے بل تھوڑا ہی آئے گا۔" اور وہ پہلی بار اس کی حمایت میں بولے تھے۔

"مگر وہ ہے کہاں؟" وہ چائے بنا کر آئی تھی۔

"شاید اپنے کمرے میں ہوگا، بیٹا اسے چائے دے آؤ۔"

"جی اچھا۔" وہ چائے کا کپ لے کر اس کے کمرے میں آئی، وہ اسی تجوری کے سامنے کھڑا تھا جب اس نے دروازہ ناک کیا۔

"عمارہ آجاؤ۔" دروازے کے اس پار کون ہوگا اسے اندازہ تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے اس سے پہلے تو شریفوں کی طرح ناک کر کے نہیں آئیں۔" وہ تجوری بند کر کے اس کی طرف مڑا تھا۔

"پوچھ سکتی ہوں اس میں کیا راز ہے؟" اس کا اشارہ تجوری کی طرف تھا۔

"ہاں پوچھ تو کچھ بھی لیتی ہو پھر بھی اجازت مانگ رہی ہو، کچھ زیادہ تمیز دار نہیں ہو گئیں تم۔"

"تمیز دار بننے کی عمر آگئی ہے علی گوہر صاحب۔"

"میں صاحب کب سے بننے لگا ویسے، سنو اس میں کسی کا راز ہے جو میرے علم میں بھی نہیں ہے، کسی کی امانت ہے جو لوٹانی ہے اور سرخ کوٹ بھی کسی کی امانت ہے، واپس کرنے جاؤں گا مگر فی الحال نہیں کچھ عرصے بعد۔"

"وہ لڑکی کہاں گئی؟"

"کون لڑکی؟" وہ چائے کا کپ لے کر مسکرایا۔

"وہی جس کے بہت سارے نام ہوتے ہیں، تم اس سے یقیناً ملنے گئے ہوگے۔"

"تمہیں کب میری باتوں کا یقین آنے لگا ہے عمارہ۔"

"الجھاؤ مت گوہر۔" وہ چائے کے سپ لیتی ہوئی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آج سے پہلے جتنی غیر معمولی باتیں کرتا رہتا تھا سب ڈرامہ تھیں جھوٹ تھیں، یا پھر من گھڑت کہانی تھی۔"

"ایسا نہیں ہے گوہر۔" وہ کافی سنجیدہ تھی۔

"تم تو یہی کہتی تھیں میرے بارے میں۔" وہ شکوہ کیے بنا رہ نہ سکا۔

"اس وجہ سے نہیں بتاؤ گے، تو ٹھیک ہے، ویسے ہر کوئی یہی کہتا اگر سنتا تو۔"

"اوروں کی پرواہ نہیں تھی مجھے۔"

"دیکھو تم ہمیشہ ادھوری اوپر سے حیران کر دینے والی بات کرتے ہو، پھر بھی مجھے تمہاری لایعنی باتوں سے کوئی سروکار تو نہیں ہے، مگر اس لڑکی کے لئے تم کچھ سنجیدہ تھے اس لئے پوچھ رہی تھی میں۔"

"تمہیں کیسے لگا؟"

"تمہاری باتوں سے، کیا تم بتا سکتے ہو۔"

"کچھ باتیں الجھے دھاگوں کے لچھے اور ڈھیریاں ہوتی ہیں، انہیں سلجھانا چاہو تو اور الجھتے ہیں، لوگ بھی ایسے ہوتے ہیں الجھے دھاگوں جیسے، وہ لڑکی عجیب تھی، اس کا ماضی عجیب تھا اور شاید حال کے ساتھ مستقبل بھی عجیب ہو۔"

"بہر حال المیہ یہ ہے کہ وہ تھی، وہ اب نہیں، مجھے اس کے حال پر رحم آتا تھا۔"

"تم ضرورت سے زیادہ اس کے بارے میں سوچتے ہو، تو بات کر لو اس کے ساتھ، بلکہ مجھے ملواؤ کرتے ہیں کچھ۔" وہ امید کا دروازہ دکھا رہی تھی۔

"وہ نامعلوم جگہ سے آئی تھی، نامعلوم جگہ چلی گئی، صرف چار روزہ ملاقات تھی، یہ گٹھڑی اسی کی ہے کبھی ملی زندگی میں تو دوں گا، ورنہ ساری عمر نہیں کھولوں گا، کسی کا راز، راز رکھنا، خدا کو یہ عادت پسند ہے۔"

"آں...... گوہر میں چاہتی ہوں کہ" "میں چاہتا ہوں کہ تم اب مجھ سے کبھی اس کے بارے میں نہ پوچھو۔" وہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔

"کیونکہ عمارہ کسی کے بارے میں بات کرتے کرتے جب ہم اس کے راز تک پہنچتے ہیں اور خود سے اندازے لگاتے ہیں تو بہت کچھ بگڑ جاتا ہے، میں اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگانا چاہتا، کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کہاں چلی گئی ہوگی۔"

"تمہارے پاس اس کی امانت کس بات کا اشارہ کرتی ہے گوہر۔" وہ پھر بھی گتھی سلجھانے میں لگی ہوئی تھی۔

"کہا نا خدا کو معلوم ہے، کیا ہم اس ٹاپک کو اسی چائے کی پیالی میں نہیں ختم کر سکتے۔"

"اوکے۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"تو ہم باہر چلیں۔" وہ پیالی خالی کر چکا تھا۔
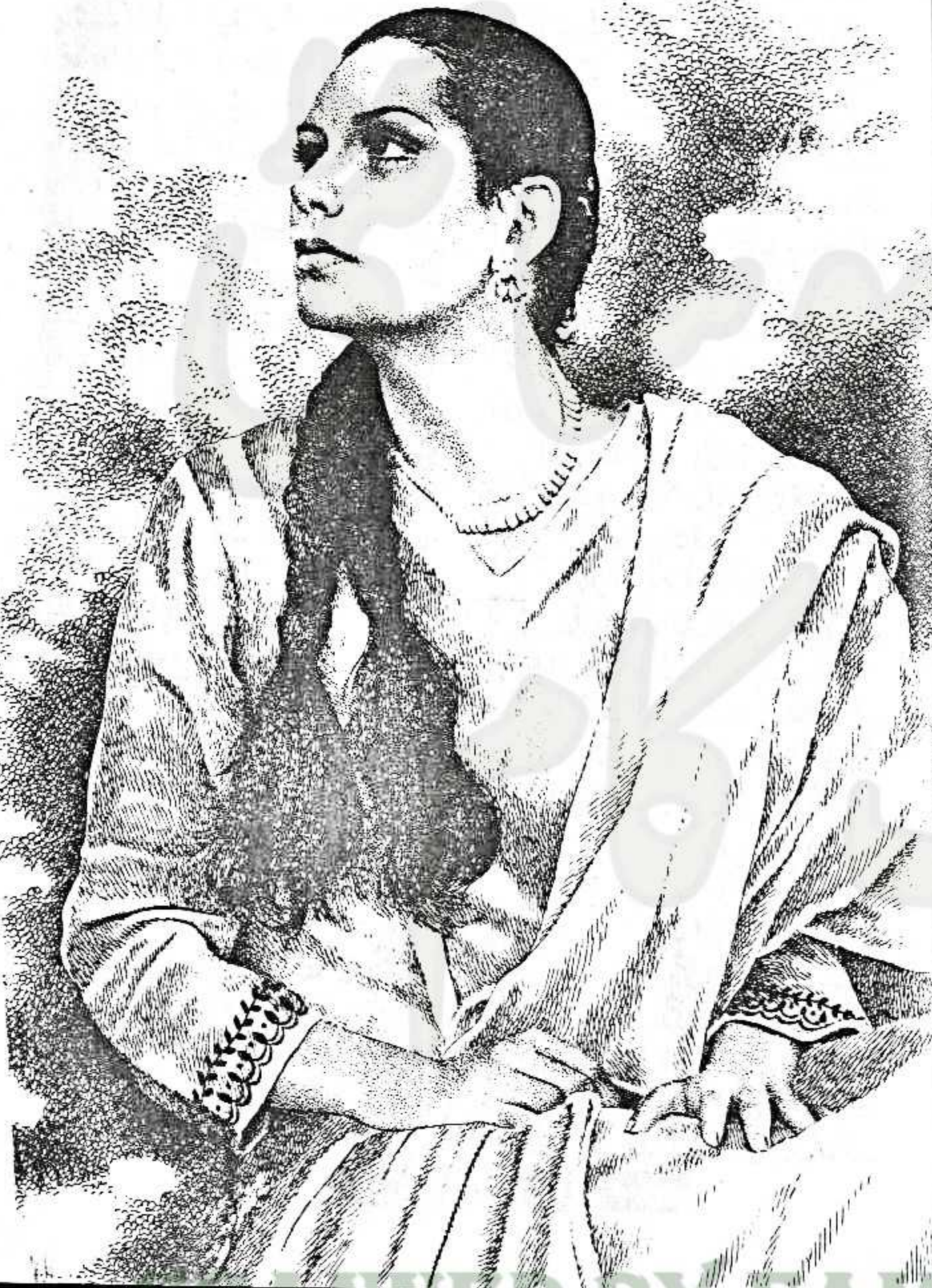
قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے۔

''ہاں چلو، تم نے جو ٹیوبز لگائی ہیں وہ اچھی ہیں۔''

''ہم۔'' وہ اس کے ساتھ باہر نکلا تھا۔

آج پتہ نہیں کیوں وہ اتنا سنجیدہ، اتنا صوبر، اتنا میچور لگ رہا تھا وہ کہنا چاہتی تھی کہ اچھے لگ رہے ہو مگر مجھے تو تمہارا دوسرا روپ اچھا لگتا ہے، جیسے ہم پہلا کہتے ہیں۔

☆☆☆

''تو میں پوچھ رہی تھی کبیر بھائی کہ آپ غائب کیسے ہو جاتے ہیں۔''

''پہلے میں تمہیں پچھلے سوالوں کا جواب نہ دے دوں امر، کہ میرے منہ سے سچ کیسے نکل جاتا ہے، اس کی وجہ کچھ اور ہو نہ ہو میری ماں ضرور ہے۔''

''وہ کیسے کبیر بھائی، کیا وہ نیک خاتون تھیں۔''

''ہم نسل در نسل فیض یاب ہوتے ہوئے آ رہے ہیں، میرا دادا، جس نے کوئی چلہ نہیں کاٹا، کوئی وظیفہ نہیں کیا، مگر اسے کبھی کبھار خواب میں الہام ہوتے تھے، عجیب غریب واقعے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ آٹھ گھنٹے بہت کم ہیں، دوسرا مسئلہ یہ ہے تمہیں صرف میری کہانی سننی ہے اور تیسرا اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کسی کے راز جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے آئے ہیں ان کو صیغہ راز میں رکھنا ہے، امانت میں خیانت خدا پسند نہیں کرتا۔''

''تو کبیر بھائی آپ غائب کیوں ہو جاتے ہیں، یہ مت کہیے گا کہ میں نہیں جانتا۔''

''میں واقعی غائب ہو جاتا ہوں نا، تم کہیں میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہی امر کلہ۔''

''کبیر بھائی کسی چیز کی انتہا ہوتی ہے، مگر......'' وہ غصے میں آ گئی۔

''واقعی کسی چیز کی انتہا ہوتی ہے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''ابتدا، ارتقاء، انتہا۔'' وہ نقطے سے نقطے ملا رہے تھے۔

''مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا امر کلہ۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

(باقی اگلے ماہ)

رات تاریک اور گہری تھی مگر اس کے نصیب سے زیادہ نہیں، جنوری کا اینڈ تھا اور آج کی رات ہمیشہ والی گزری راتوں سے زیادہ خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی، بارش برس رہی تھی تیز سرد ہوا کا شور کانوں کے پردے پھاڑنے کو کافی تھا پتے اس شور سے شرسرا رہے تھے، ہوا کی اس شودیدہ سری نے اپنا کام کر دکھایا تھا، وہ بیڈ پہ گھٹنوں میں دونوں سر دیئے آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی۔

ابھی تھوڑی دیر میں ان کے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جائے گا اور اسے ہی گھر کا دروازہ کھولنے کو اٹھنا ہوگا کیونکہ آپا جان تو نیند کی دوا کھا کے اس وقت تک سو جاتی ہیں، آنے والا نشے میں دھت گرتا پڑتا وجود لئے اسے ہراساں کرے گا اور وہ سانس روکے اس کی خدمت کرنے کو مجبور ہوگئی وہ کتنی دیر میں کھانا کھا کر چائے مانگے گا، یہ روز کا معمول ہونے کے باوجود بھی طے نہیں ہوا تھا، ہر روز شیڈول مختلف ہوتا اوور ٹائم پریڈ بھی، اسی لئے وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی پھر چاہے وقت پانچ منٹ ہوتا یا ایک گھنٹے کا اس کے لئے تو ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری گزرتا تھا۔

رات گیارہ بجے کا عمل تھا، ٹھنڈ سے زیادہ خوف و ہراس نے اس کی ہڈیوں میں گودا جما دیا تھا، وہ پلنگ پر ایک ہی انداز میں بیٹھی تھک گئی تھی، سب سے بڑا عذاب شاید خوف ہی ہوتا ہے، ساڑھے گیارہ بجے اس نے تھک کر لیٹنے کا فیصلہ کرتے سوچا تھا اس کے پاس آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے وقت کہاں ہوتا تھا مگر قسمت اس پر کبھی بھی ہمیشہ مہربان نہیں رہی تھی، اسے خوشیاں ہمیشہ ہی بہت کم وقت کے لئے اور کڑے تردد کے ساتھ ملا کرتی تھیں، یادیں گرم سیال کی مانند آنکھوں کی سرزمین سے بہہ نکلی تھیں۔

کچھ یادیں ہمیشہ ہی آنکھ میں آنسو لاتی ہیں

اور اس کی تو ہر یاد ہی آنسوؤں سے عبارت تھی، کبھی جو بھی ہونٹوں نے ہنسی کا مزہ چکھا بھی تھا تو آج کل صرف آنسوؤں اور آہوں کو پیتے زندگی بسر کر رہی تھی، پونے بارہ بجے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا، اس نے اپنے حلق میں کانٹے اگتے محسوس کیے ہاتھوں میں واضح لرزش و کپکپاہٹ تھی، جانے ڈور بیل کے باوجود بھی وہ دروازہ کیوں بجاتا تھا؟ وہ کبھی اس منطق کو سمجھ نہیں پائی اس نے پلاسٹک کی چپل پیروں میں اڑسی، دوپٹے کو اچھے سے شانوں پہ پھیلایا اور دروازے کی طرف بڑھی تبھی اچانک ہی لائٹ چلی گئی تھی اس کا سانس حلق میں اٹک گیا اپنے کمرے سے گھر کے مرکزی دروازے تک کا سفر اس کے لئے پل صراط کی مانند مشکل ہوگیا۔

وہ کمرے کے بیچوں بیچ سانس روکے کھڑی رہی مگر آنے والے کو چین کہاں پڑتا تھا اس کی تو طبیعت میں پارہ بھرا رہتا تھا۔

دھڑ دھڑ دھڑ، لکڑی کا سال خوردہ دروازہ ٹوٹنے کے قریب تھا، شفا نے اپنے آنسو حلق میں انڈیلے اور خود کو باہر نکلنے پر آمادہ کیا۔

ٹھک ٹھک ٹھک، اب وہ اپنی موٹر سائیکل کی چابی دروازے پہ بجا رہا تھا یہ بھی اس کا روز کا معمول تھا پھر شفا عادی کیوں نہیں ہو پائی تھی۔

اس نے اندھیرے کو ٹٹولتے گھر کا دروازہ کھول دیا، وہ اپنے موٹر سائیکل کی بیم لائٹ چلائے کھڑا تھا شفا نے اپنے چہرے پر سنہری کرنوں کی چمک جیسی روشنی پڑتی محسوس کرتے ہی آنکھیں میچ لیں تیز روشنی نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

اس کی اس بے ساختہ اور غیر ارادی حرکت کو آنے والے نے اپنے انداز میں ہی دیکھا تھا۔

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
تیری صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

انتہائی عامیانہ انداز میں اس کی صورت دیکھتے ہی شعر پڑھا گیا شفا نے بے ساختہ جھرجھری سی لی اور سامنے سے ہٹ گئی وہ اس کے کھچ چہرے پر نگاہیں جمائے اندر بڑھ آیا، ان آنکھوں میں شفا کے لئے کیا کچھ نہیں تھا شفا کٹ کے رہ گئی تھی، عامیانہ پن کا مظاہرہ کرتیں حریص آنکھیں اس کے وجود کا ایکسرے کرنے میں مگن تھیں، وہ آہستگی سے کچن میں آگئی اور آ کے برنر چلا دیا، تین مرلے کے اس گھر میں دو کمروں کے ساتھ کچن کی اتنی سی ہی گنجائش بنتی تھی کہ چھت کو جاتی سیڑھیوں کے نیچے ہی ضرورت کا تمام سامان اور اشیائے خورد و نوش رکھ کے اسے کچن کی شکل دے دی جائے، ایک وقت میں ایک ہی بندہ کچن میں کھڑا ہوسکتا تھا دوسرے کی جگہ بنتی ہی نہ تھی اور اگر وہ زبردستی جگہ بنانے کی کوشش کرتا تو دونوں کی آپس میں کہنیاں کندھے بازو آپس میں ٹکرانے لگتے، مگر اس بات کی سمجھ شاید مشتاق احمد کو نہیں ہوتی تھی وہ جان بوجھ کر شفا کے ہوتے کچن میں گھستا، جیسے ابھی بھی وہ کھڑا تھا شفا پلٹی تو بے ساختہ اس کے کندھے سے ٹکرائی سنبھل کر خود میں سمٹتی وہ خجل سے پیچھے ہٹی مشتاق احمد دل سے مسکرایا اس کی خباثت زدہ مسکان شفا کو رلا گئی، وہ اس کا ضبط کیوں آزما رہا تھا۔

''مشتاق بھائی! آپ برآمدے میں چلئے میں کھانا گرم کر کے وہیں لا رہی ہوں۔'' اس نے اپنا تمام حوصلہ مجتمع کرتے سنجیدگی سے ڈپٹا، مگر مقابل کو اثر کہاں تھا۔

تیری صورت کو دیکھنے والے
اپنی آنکھوں سے پیار کرتے ہیں

بڑی ادا سے نہایت عاجزی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کے اپنے ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا، شفا کے چہرے پر برہمی کے تاثرات بڑے واضح طور پر ابھرے مگر اثر کس نے اور کیوں لینا تھا وہ تو شاید مجبور و بے کس لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں سے تھا۔

''مشتاق بھائی!'' شفا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی سالی صاحبہ! ہم تو ہمہ تن گوش سانس ساکن کیے آپ کی طرف متوجہ ہیں، آپ فرمائیں۔'' وہ جان بوجھ کر اسے زچ کر رہا تھا ہمیشہ ہی کیا کرتا تھا۔

''میری مانو تو دوستی کر لو مجھ سے، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا تم دیکھنا کیسے عیش کراؤں گا میں تمہیں۔'' اور وہ اسے کتنے عیش کرائے گا یہ تو اسے اچھی طرح معلوم تھا اس کی آنکھیں بے بسی کے نمکین پانی سے لبالب بھر گئیں، اسے اپنی بہن کی قسمت پر رونا آیا اگر اس کی بہن کو پتہ چل جائے کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا شوہر کیسے اس کی بہن پر بری نظر رکھتا ہے تو وہ تو اس صدمے سے ہی مر جائے گی اور بہن کی حالت کے پیش نظر تو وہ خاموش تھی ورنہ تو وہ کب کا یہ گھر چھوڑ چکی ہوتی۔

☆☆☆

اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے ہی کلثوم آپا ہانپتی ہوئی کھڑی تھی، شفا نے خاموشی سے ان کے ہاتھ سے سبزی کا تھیلا پکڑا اور اندر کچن میں لا کے رکھ دیا، کولر میں سے پانی کا ٹھنڈا گلاس لے کر اس نے آپا کو پکڑایا تھا، جو انہوں نے ایک ہی سانس میں ختم بھی کر دیا تھا۔

''اور پانی چاہیے آپا۔'' وہ ان کی اکھڑی سانس کے پیش نظر پوچھ رہی تھی۔

”نہیں بس...... کافی ہے۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنا بھیگا چہرہ صاف کرتے بولی تھیں ذرا سا چلنا ہی انہیں اتنا تھکا دیتا تھا تھوڑی دور چلنے سے پھولنے والی سانس اتنی دیر تک اکھڑی رہتی کہ شفا کو افسوس ہونے لگتا کہ انہیں باہر بھیجا ہی کیوں، نقاہت و کمزوری ان کے زرد چہرے پر صاف کھنڈی نظر آتی تھی۔

”گرمی اتنی نہیں آپا، آپ تھوڑا سا چلنے سے تھک جاتی ہیں، ذرا نکڑ تک ہی تو گئیں تھیں اور دیکھیں کیسے ہانپ رہی ہیں۔“

”ہاں وزن بھی تو زیادہ ہوگیا ہے میرا۔“ وہ اس سے پوری طرح سے متفق تھی۔

”اس کنڈیشن میں ایسا بھی ہو جاتا ہے وزن کا بڑھنا تو معمولی سی بات ہے۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی متانت سے بولی تھی یوں گویا وہ ان سے بڑی اور سمجھدار ہو۔

”چلو اللہ ساتھ خیریت کے مجھے فارغ کرے تو میں روز صبح واک پر جایا کروں گی۔“ انہوں نے پالک کی ٹوکری اس کے ہاتھ سے لیتے مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

”اور بچہ کون سنبھالے گا آپ کا، یا اسے ساتھ ہی لے جائیں گی۔“ وہ ہنستی ہوئی ان کے پاس آ بیٹھی تھی اور ساتھ ہی پالک چن کر کاٹنے لگی تھی، ویسے بھی وہ دونوں بہنیں مشتاق احمد کی غیر موجودگی میں یوں ہی مسکراتی رہتی تھیں کھلی کھلی سی رہتی تھیں، کلثوم آپا کا شوہر ان کے لئے ایک سخت مزاج شوہر تھا جو خال خال ہی ان کے وجود سے خوش ہو پاتا تھا، جبکہ شفا کے لئے اسے برداشت کرنا حد سے زیادہ مشکل تھا اس کا بے تکلفانہ انداز حریصانہ نگاہیں، عامیانہ لب و لہجہ اس کی جان پر بن آتی تھی۔

”تم سنبھالا کرو گی ناں، اکلوتی خالہ ہو گی اس کی۔“ وہ مزے سے کہتی پالک کی صاف گڈی اسے کاٹنے کے لئے پکڑاتی بولیں تو شفا نے آنکھیں نکال کر انہیں دیکھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا، میں بالکل بھی نہیں پالنے والی آپ کا بچہ، مجھے اپنے گھر واپس جانا ہے۔“ وہ تو جلد از جلد اس قید خانے سے نکلا چاہتی تھی اور آپا تو آگے تک کا سوچے ہوئے تھیں۔

”ارے یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے اپنی بہن کا گھر ہے جیسے مرضی رہو پھر مجھے بھی تمہارے وجود سے بہت آسرا رہتا ہے۔“ وہ پالک چنتی نہایت افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔

”اوہ آپا، بہن کے گھر زیادہ دن رہنا مناسب نہیں لگتا پھر مشتاق بھائی۔“

”ارے مشتاق تو خود بہت خوش ہیں تمہارے یہاں آنے سے، بلکہ مجھے تو وہ کہہ رہے تھے کہ میری وجہ سے پہلے وہ سارا دن جو پریشان رہتے تھے اب تمہاری وجہ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی وہ سکون اور آرام سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔“

”اوہ میری بھولی آپا، کاش آپ جان سکتیں۔“ شفا نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے آہستگی سے سوچا ان کے سادہ بے ریا چہرے پر عجیب قسم کا بھولپن پھیلا ہوا تھا۔

”اماں وہاں اکیلی پریشان ہوتی ہیں ناں، پھر میرا بھی دل اداس رہنے لگا ہے۔“ انہماک سے پالک کاٹتے اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا، کلثوم آپا اس کے چہرے پر پھیلے شفق کے رنگوں کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گئیں۔

”اماں کا تو بہانہ ہے شفی، اصل معاملہ کیا ہے میں جانتی ہوں اچھی طرح سے۔“ انہوں نے جان بوجھ کر اسے شفی کہہ کے پکارا جس نام

سے اسے سانول پکارا کرتا تھا سانول اس کے بچپن کا ساتھی اور منگیتر تھا، اس کے والدین نے بچپن سے ہی اس کا رشتہ اس کے تایا کے گھر طے کر دیا تھا اب دونوں کی مرضی و منشا محبت میں بدل گئی تھی، سبھی کو خبر تھی۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے سچ میں اماں کی ہی یاد آ رہی تھی۔“ اس نے اپنے چہرے کے رنگوں کو چھپائے ان کے اندازے کی نفی جی جان سے کی۔

”اماں تو اس اتوار تک آ جائیں گی تم کہو تو میں سانول کو بھی بلوا لوں۔“ وہ ابھی بھی اسے چھیڑ رہی تھیں۔

”جب اسے میری یاد نہیں آئی تو مجھے بھی نہیں آئی اور کوئی ضرورت نہیں ہے اسے بلانے کی، مجھے نہیں ملنا اس سے۔“ اس نے ناراضگی کا واضح اظہار کرتے سبزی بنا کر وہاں سے اٹھ گئی مگر کلثوم آپا کو اس کے دل کی خبر بڑی آسانی کے ساتھ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مشتاق احمد گھر آیا تو کلثوم نے اس سے فون لے کر اماں کو کال کی تھی، مشتاق احمد کو قطعاً پسند نہیں تھا کہ گھر کی عورتوں کے پاس موبائل ہو اس کے خیال میں اگر گھر کی عورت کے پاس موبائل فون ہو گا تو وہ یقیناً غیر مردوں سے رابطہ کرے گی۔

اور یہ سب اس کی غیرت کو گوارا نہیں تھا سو کلثوم اس کی محتاج تھی اور اسی محتاجی کے عوض کئی کئی دن وہ اماں سے رابطہ نہیں کر پاتی تھی، مشتاق احمد کا اگر موڈ ہوتا تو وہ اس کی بات کروا دیا کرتا ورنہ ٹال جاتا اور کئی کئی دن ٹالتا ہی رہتا۔

ویسے بھی کلثوم جب سے دوسرے جی سے ہوئی تھی اس کی طبیعت عجیب نڈھال نڈھال سی رہا کرتی تھی شام کی دوا لیتے ہی اس پر غنودگی سی طاری ہو جایا کرتی تھی اور وہ خود سے اور گھر سے نڈھال ہو جایا کرتی تھی، پھر جب وہ ایک ماہ پہلے مشتاق احمد کے ساتھ اماں سے ملنے فیصل آباد گئی تو اماں نے اس کے ساتھ شفا کو بھیج دیا۔

شفا اس سے سات سال چھوٹی تھی اور زمین و آسمان جتنا فرق تھا دونوں کی شکل و صورت سے لے کر مزاج تک، کلثوم سانولی سلونی رنگت کی پرکشش نقوش کی حامل تھی جبکہ شفا پر جوانی کو وہ نور ہیرے کی مانند چمکتے دمکتے چڑھی تھی۔

مشتاق احمد کی حریصانہ و ہوس پرست فطرت نے اسے نظروں میں تول کر ہی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کا سوچ لیا تھا، وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی کم عمری کا فائدہ اٹھا کے اسے اپنے ہاتھ کرنا چاہتا تھا مگر شاید شفا حد سے زیادہ سمجھدار تھی، وہ آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔

مگر وہ کسی نہ کسی طریقے سے بچ جایا کرتی تھی، ابھی بھی وہ کچن میں کھڑی شام کا کھانا بنا رہی تھی اور مشتاق احمد کی نظریں اس کے خوبصورت معصوم چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ کلثوم آپا فون پر اماں سے گپ شپ کرتے اچانک ہی بولیں تو شفا نے بے ساختہ چونک کے آپا کی طرف دیکھا، اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی بے چینی نظر آ رہی تھی، مشتاق احمد کے اندر آگ کا کوندا لپکا تھا۔

”اماں! سانول ہے آپ کے پاس؟ ذرا بات تو کروائیں اس سے۔“ کلثوم آپا کے لہجے میں اگر شگفتگی تھی تو ویسی ہی شگفتگی محض نام کے احساس سے ہی شفا کے چہرے پر چمکی تھی، مشتاق احمد کو بے طرح غصہ آیا، وہ اس کو اہمیت دینے کی بجائے ایک عام سے لڑکے کو کیوں نہیں دیتی تھی

مگر اس وقت یہ بات سوچتے وہ اپنا اور اس کا مقدس رشتہ ضرور بھول گیا تھا۔

''کیسے ہو سانول! آپا کی خبر لینے کی بھی فرصت نہیں کیا، کتنے ہی دن ہو گئے تم نے رابطہ ہی نہیں کیا۔'' کلثوم کے شکوے پر مشتاق احمد نے بے ساختہ پہلو بدلا، اب وہ کیا بتاتے کہ وہ تو جانے کتنے فون کر چکا ہے مگر انہوں نے خود ہی بات نہیں کروائی، کہ کہیں شفا بات نہ کرے اور واپس جانے کا ارادہ نہ باندھ لے۔

''میں نے فون کیا تھا، شاید مشتاق بھائی کو بتانا یاد نہیں رہا ہوگا۔'' حیرت سے چند لمحے سوچتے اس نے بات بنا کے کلثوم کو بتائی تھی۔

''ہاں ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، ویسے بھی مشتاق بے چارے معروف بھی تو بہت رہتے ہیں سارا دن ورکشاپ کے کاموں میں الجھ کر انہیں تو اپنا خیال رکھنا بھی یاد نہیں رہتا۔'' کلثوم کے ہاتھوں میں فون تھا اور وہ کن اکھیوں سے شفا کو دیکھ رہی تھیں۔

''وہ آپا ایک بات پوچھنی تھی؟''

''ہاں ہاں پوچھو۔'' وہ مسکراتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں کہتے جان بوجھ کے شفا کو سنا رہی تھیں مشتاق احمد کے سر سے پر ناگواری کے تاثرات بڑے واضح انداز میں دکھے۔

''شفا! شفا کب تک واپس آئے گی میرا مطلب ہے چاچی بھی اکیلی ہیں یہاں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے دل کے ہاتھوں مجبور سا پوچھ بیٹھا، کلثوم شرارت سے ہوں ہوں کرتے اسے چھیڑ رہی تھیں وہ بے چارہ شرمندہ ہی ہو گیا پوچھ کے۔

''ابھی تو وہ آئے گی نہیں، دو چار ماہ اس کے بعد دیکھیں گے، ویسے تم کہو تو تمہاری بات کروا دوں، شفا...... شفا آؤ ادھر سانول سے بات کر لو۔'' وہ اسے آوازیں دے رہی تھیں مگر اس سے پہلے ہی موبائل مشتاق احمد نے کلثوم کے ہاتھ سے چھین لیا تھا، کلثوم آپا نے حیرت سے مشتاق احمد کو دیکھا پھر برآمدے میں اپنے قدموں کو روکتے شفا کے چہرے پر پھیلے مایوسی کے رنگوں کو۔

''کتنی شرم اور بے حیائی کی بات ہے، اپنی بہن کی بات تم اس کے منگیتر سے خود کروا رہی ہو وہ ابھی غیر محرم ہے اس کے لئے۔'' انہوں نے اسے بری طرح سے ڈپٹا تھا، آپا کلثوم نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا۔

''مگر مشتاق، وہ بچپن کا دوست ہے شفا کا، ایک ساتھ مل کر کھیلے ہیں منگیتر والا رشتہ تو ان دونوں کے درمیان کبھی رہا ہی نہیں۔''

''وہ بچپن تھا ان کا، اب دونوں جوان ہیں اور شادی سے پہلے بغیر کسی شرعی رشتے کے ان دونوں کی آپس میں بات چیت ہرگز نہیں کرنی چاہیے اور کم از کم یہ بے حیائی میرے گھر میری ہی آنکھوں کے سامنے نہیں چلے گی۔'' وہ غصے سے کہتا چپل پاؤں میں اڑس کر ایک کٹیلی نگاہ شفا پر ڈالتا باہر نکل گیا تھا، ان آنکھوں میں شفا نے کیا کچھ نہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

رات کا شاید آخری پہر تھا، جب اسے اپنے چہرے پر عجیب قسم کا احساس ہوا تھا، اس کی آنکھ کسی عجیب سے احساس کے تحت کھلی تھی اور کھلی کی کھلی رہ گئی تھی، اس نے بے حد حیرت سے اپنے چہرے پر جھکے مشتاق احمد کو دیکھا اور سن پڑ گئی، وہ آنکھوں میں عجیب سی دیوانگی لئے یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''مشتاق...... بھا...... بھائی۔'' وہ خوف سے پیلی پڑتی انہیں پیچھے دھکیلتی اٹھ بیٹھی، مگر اتنا بھاری وجود تھا اس کا وہ اسے دھکیلنے کے باوجود بھی

پیچھے نہیں ہٹا سکی۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، مم...... میرے کمرے میں۔'' وہ اس کی مخمور آنکھوں میں دکھنی وارفتگی سے نظریں چرائے خوفزدہ لہجے میں ہکلاتے پوچھ رہی تھی۔

وہ رات کے آخری پہر کیوں آیا تھا شفا کے کمرے میں، اس کی نیت اور ارادے کیا تھے کیا اسے سمجھ نہیں تھی کہ وہ اس کا غیر محرم ہے وہ اس کی بہن کا شوہر ہے ان کے درمیان مقدس اور تکلف کا رشتہ ہے۔

''تم کتنی خوبصورت ہو شفی، کلثوم سے کتنی الگ۔'' وہ اس کا سوال نظر انداز کیے اپنی ہی بول رہا تھا وہ بالکل بھی ہوش میں نہیں تھا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں پلیز جائیں یہاں سے۔'' اسے اس کی دیوانگی سے یکلخت خوف محسوس ہوا۔

''تمہاری آنکھیں کتنی پیاری اور گہری ہیں بالکل سمندر کی طرح اور تمہارے ہونٹ، وہ بھی کتنے نازک ہیں بالکل گلاب کی پنکھڑی کی مانند۔'' وہ اس کے ہونٹوں کو چھونے کی خواہش میں ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا مگر شفا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، مشتاق احمد نے اس کی اس حرکت کو ناگواری سے دیکھا۔

''مشتاق احمد کے ہاتھ جھٹکنے کی غلطی نہ کر شفی، بہت محبت کرتا ہوں تجھ سے، قدر کر میری آخر میں تمہارا بہنوئی ہوں، پیارا بہنوئی۔'' وہ خباثت سے کہتا ہنسا شفا کو اس کی دماغی حالت کی خرابی کا یقین ہو گیا۔

''مشتاق بھائی! خدا کے لئے یہاں سے جائیں اگر آپا اٹھ گئیں تو، تو وہ کیا سوچیں گی کچھ تو میری عزت کا خیال کریں۔'' وہ اسے کسی طرح سے جاتے نہ دیکھ کے گڑگڑائی تھی۔

''اس کی فکر نہ کر، وہ بہت گہری نیند سو رہی ہے اتنی آسانی سے اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی، تو اپنے دل کی بات بتا، بہت قدر کروں گا تیری، دنیا جہاں کی خوشیاں تیرے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا اور میں وہ سانول ہے ناں تجھے کچھ نہیں دے پائے گا کیوں سسک سسک کر اپنی جوانی ضائع کرنا چاہتی ہے تو۔'' وہ اس کے نرم و ملائم ہاتھ پکڑتے خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا شفا نے اپنے ہاتھ چھڑانے چاہے مگر چھڑا نہیں پائی اس کی گرفت بہت مضبوط تھی، شفا کے ہاتھوں پر، اسے جتنا خوف آج محسوس ہو رہا تھا اتنا پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا، پہلے تو وہ مشتاق احمد کے انداز و اطوار اور معنی خیز جملوں سے خائف رہتی تھی مگر آج تو وہ اس کے کمرے میں ہی آ گیا تھا اور اس کی باتیں شفا کا دل دہلا دینے کو کافی تھیں۔

ستم بالائے ستم کہ وہ مشتاق احمد کی یہ باتیں کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی، کیونکہ تنہائی میں اس کا جو روپ ہوتا کلثوم کے سامنے بالکل بھی بدل جاتا اور پھر وہ اپنی بہن کو کیسے بتا پاتی کہ اس کا بظاہر شرافت مندی کا مظہر شوہر اندر سے کتنا کریہہ اور گھناؤنی سوچ کا حامل ہے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مشتاق احمد سب لوگوں کی موجودگی میں اسے شفقت سے مخاطب کرنے والا تنہائی ملتے ہی اس کے عاشق کا روپ دھار لے گا، وہ اس سے کیسے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا کیسی چاہت کی امید کر رہا تھا اس کا دماغ سن تھا، وہ اس کی بہن کا شوہر تھا اس کے لئے قابل احترام ان دونوں کے درمیان تو کبھی بھی بے تکلفی نہیں رہی تھی جیسی عام سالی بہنوئیوں کے رشتے میں دیکھی جاتی ہے، پھر بھی وہ اس مشکل میں پھنس گئی تھی، سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں وہ جلد از جلد اس

گھر سے جانا چاہتی تھی مگر آپا کلثوم اسے جانے ہی نہ دیتی تھیں۔

”تو اچھی طرح سے سوچ لے، ہم دونوں شادی کر کے کہیں اور چلے جائیں گے جہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی نہ ہو۔“ وہ مستقبل کی ساری منصوبہ بندی کیے ہوئے تھا شفا نے ایک آخری کوشش کے تحت اسے سمجھانا چاہا۔

”دنیا تھو تھو کرے گی ہم پر مشتاق بھائی، آپ میری بہن کے شوہر ہیں میں آپ کے بارے میں ایسا مر کے بھی نہیں سوچ سکتی۔“ بے بسی کے تحت اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

”یہی تو غلطی ہو گئی مجھ سے شفی، ہر روز ہر وقت میں خود کو کوستا رہتا ہوں، میں نے تم سے شادی کیوں نہ کی تم تو میرے خوابوں کی شہزادی جیسی ہو، تم سانول کا نصیب کیوں ہو میرا کیوں نہیں۔“ وہ عجیب پاگل پن سے بول رہا تھا شفی حیرت سے منجمد رہ گئی۔

”کلثوم آپا آپ سے بہت محبت کرتیں ہیں، آپ خدا کے لئے ان کا نہیں تو اپنے ہونے والے بچے کا ہی سوچ لیں۔“

”میں نے جو سوچنا تھا سوچ لیا، اب صرف عمل کرنا باقی ہے تم اچھی طرح سے سوچ لو اور ہاں انکار کی گنجائش بالکل بھی نہیں ہے ورنہ یاد رکھنا اپنی بہن کی صورت دیکھنے کو ہمیشہ کے لئے ترس جاؤ گی تم۔“ وہ انگلی اٹھا کے اسے وارن کرتا اٹھ گیا شفا نے وہ ساری رات آنکھوں میں بسر کر دی تھی، اسے اس مشکل کا سرا ہاتھ آتا نہیں دکھائی دے رہا تھا، ایک طرف اس کی عزت تھی تو دوسری طرف اس کی بہن کا سہاگ جسے اس ہر حال میں بچانا تھا اور سانول، اس کے لئے تو اس کی جان بھی حاضر تھی بچپن سے اس کے نام کے ساتھ سانس لے رہی تھی اس سے جدائی کا تصور ہی سوہان روح تھا، کیا کرے کیا نہ کرے، عجب مخمصے میں الجھی وہ بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ اٹھی تو اس کا سر درد سے بھاری سل میں بدلا ہوا تھا، رات بھر اپنی بے بسی پہ رونے کی وجہ سے آنکھوں کے پپوٹے سوج چکے تھے، وہ بے دلی سے گھر کے کام نمٹا رہی تھی، مگر اس کا دل وحشی پرندے بنا ہوا تھا دل چاہتا تھا کہ جست لگائے اور پھر کر کے اس گھر سے بھاگ جائے اور دوبارہ کبھی بھی اس گھر میں قدم نہ رکھے، آپا کلثوم خاموشی سے اسے کام کرتا دیکھ رہی تھیں اور دل میں شرمندہ بھی تھیں نجانے پچھلے کچھ دنوں سے وہ اتنی کاہل کیوں ہو گئی تھیں رات دوا لیتے ہی انہیں نیند آ جایا کرتی ساری ساری رات وہ ایک ہی کروٹ میں لیٹے رہتیں، صبح بمشکل تمام آنکھ کھولتیں مگر ذہن سویا سویا سا رہا کرتا جسم میں سکت نام کو بھی نہیں ملتی تھی، سارا دن سستی میں گزر جایا کرتا۔

”شفا، ادھر آنا میرے پاس۔“ اچانک ہی انہوں نے اسے پکار لیا، وہ جو مارے باندھے کچن کا کام نمٹا رہی تھی فوراً لپک کے آئی۔

”جی آپا!“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے گیلے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔“ آپا کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

”آج سر میں بہت درد ہو رہا ہے آپا۔“ اس نے چھپانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

”کام بھی تو بہت کرتی ہو ناں تم، میں بھی کیا کروں بالکل ہی ناکارہ ہو کے رہ گئی ہوں، عجیب سی سستی چھائی رہتی ہے دن بھر اور شام ہوتے ہی یوں غافل ہوتی ہوں اردگرد سے گویا کوئی نشے کی دوا کھا کے سوئی ہوئی۔“ وہ اپنی سادگی میں بات کرتے کرتے شفا کو چونکا گئی تھیں، اس نے چونک کر آپا کا چہرہ دیکھا جس پر زردی کھنڈی تھی آنکھوں کے اردگرد سیاہ گھیرے انہیں برسوں کا بیمار ظاہر کر رہے تھے۔

”ڈاکٹر کو دکھائیں ناں آپا، حالت تو دیکھیں اپنی دن بدن کیسی پیلی پڑتی جا رہی ہے۔“ وہ بغور ان کی طرف دیکھتی جیسے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

”مشتاق سے کہوں گی، وہ حقیقت بتا کے دوا لے آئیں گے۔“ انہوں نے گہری سانس لے کر جیسے آمادگی ظاہر کی۔

”آپ خود ڈاکٹر کے پاس جائیں آپا، اسے اپنی دوائیں چینج کرنے کو کہیں، یہ دوائیں آپ کو موافق نہیں ہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ انہیں سمجھاتے اپنی بات منوانے کی کوشش میں تھی۔

”میں خود سے کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی اکیلے جاتے تو ویسے بھی مجھے بہت خوف آتا ہے، اگر آج مشتاق جلدی گھر آ گئے تو جاؤں گی۔“

”میں چلی جاتی ہوں آپ کے ساتھ، ایک دفعہ ڈاکٹر کو دکھا تو لیں اگر طبیعت نہ سنبھلی تو پھر اماں کو بلائیں گے ویسے بھی آپ کے دن بھی اب قریب آ رہے ہیں۔“ وہ فکر مند ہوئی۔

”نہیں نہیں، تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی مشتاق بہت برا منائیں گے اگر تمہیں لے کر گئی تو، انہیں پسند نہیں کنواری بچیوں کا یوں لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا اور پھر ابھی اماں کو کیا پریشان کرنا، جب وقت آئے گا تب فون کر کے بلا لیں گے۔“

”مگر آپا! اماں کا تجربہ زیادہ ہے میرے سے زیادہ ان کی ضرورت ہے یہاں۔“ شفا کو مشکل پیش آ رہی تھی اپنی بات سمجھانے میں، جو نتیجہ وہ رات کے واقعے سے اخذ کر رہی تھی وہ بہت بھیانک تھا وہ جلد از جلد اس عقوبت خانے سے نکلنا چاہتی تھی۔

”تم تنگ آ گئی ہو یہاں رہ کے، جو بار بار یہاں سے نکلنے کا تذکرہ لے بیٹھتی ہو کسی نہ کسی بہانے سے۔“ آپا شاید برا مان گئی تھیں تبھی تو سنجیدہ سی استفسار کر رہی تھیں۔

”آپا!“ وہ ششدر رہ گئی۔

”باخدا ایسی کوئی بات نہیں میں تو بس ویسے ہی، آپ کے خیال سے۔“ وہ بات کرتے اٹک گئی ایک دفعہ تو دل میں آیا کہہ دے مگر جو کچھ وہ سب سن کے آپا کے ساتھ ہونا تھا وہ شاید ناقابل برداشت و ناقابل تلافی ہی ہوتا۔

”مت کرو میرا ایسا خیال، جس میں بار بار مجھے یہ محسوس ہو کہ تم یہاں خوش نہیں ہو۔“ وہ حقیقتاً برا مان گئی تھیں، تبھی تو نروٹھے پن سے بول رہی تھیں۔

”اوہو آپا، میں تو بس ایک بات کر رہی تھی آپ تو سنجیدہ ہو گئیں، چلیں ڈاکٹر کے ہاں چلتے ہیں میں بھی دوا لے لوں گی عجیب سی تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں کہیں بخار ہی نہ ہو جائے۔“

”مشتاق کو برابر والے گھر سے فون کر دیتی ہوں تمہیں ساتھ لے جائیں گے تم میری دوا بھی لے آنا میرا دل تو بالکل بھی نہیں چاہ رہا کہیں بھی جانے کو۔“

”نن...... نہیں پلیز آپا، مشتاق بھائی کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اب اتنی بھی بیمار نہیں، میں تو بس آپ کی طبیعت کے خیال سے کہہ رہی تھی۔“ وہ تو یوں بدکی گویا آپا کلثوم کو اگر اس نے بروقت نہ روکا تو وہ مشتاق کو زبردستی بلا کر ہی دم لیں گی اور مشتاق احمد کی سنگت میں

اس کے ساتھ کہیں جانا اب کم از کم اس کے نزدیک خطرے سے خالی نہیں تھا۔

"میری اتنی بھی فکر مت کیا کرو، میں ٹھیک ہو جاؤں گی تم ایسا کرو جا کے نکڑ کی دوکان سے دو پیناڈول لے آؤ چائے کے ساتھ لے لیتا میں اب ذرا دیر لیٹوں گی پتا نہیں کیا وجہ ہے آج تو بیٹھا ہی نہیں جا رہا۔" وہ دوپٹے کے پلو سے پیسے کھول کے اسے پکڑاتیں یوں کہہ رہی تھیں جیسے خود سے ہی مخاطب ہوں۔

"آپ کی دوا بھی لے آؤں گی اپنی پرچی مجھے دے دیں ناں۔"

"دوائیں ہیں ابھی میری، تم بس اپنے لئے لے آؤ، ہاں وہاں کمرے میں الماری کے سامنے والے میز پر میری داؤں کا شاپر رکھا ہے وہ لے آؤ اور مجھے دوا دے دو، میرے دوا لینے تک تم نکڑ والے میڈیکل اسٹور سے ہو آؤ اور ہاں جلدی آنا کہیں ایسا نہ ہو مشتاق آ جائے خوامخواہ پھر مجھ پر بگڑے گا کہ جوان جہان اکیلی لڑکی کو باہر کیوں بھیج دیا۔" آپا کلثوم اپنی ہی دھن میں بول رہی تھیں، شفا کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلی، عزت کا وہ جتنا محافظ تھا یہ بھلا شفا سے بہتر کون جان سکتا تھا، وہ خاموشی سے آپا کو دوا دے کر چادر لپٹتی باہر نکل آئی، آتے وقت وہ آپا کی دواؤں والی پرچی ساتھ لانا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

اس نے میڈیکل اسٹور والے کو پرچی دکھاتے ہی اپنے اندازے کی تصدیق کی تھی اور اس کا خدشہ بالکل درست تھا، مشتاق احمد آپا کلثوم کو ہائی پوٹینسی والی نشہ آور ادویات کا استعمال کروا رہا تھا، شفا حقیقت جان کے پتھر کا بت بن گئی، وہ ایسا کیوں کر رہا تھا، اس حالت میں ایسی ادویات کا استعمال کتنا بڑا خطرہ تھا ماں اور بچے کے لئے۔

"کہیں وہ جان بوجھ کے تو نہیں کر رہا یہ سب۔" شفا کو اچانک اس کی باتیں یاد آئیں۔

"فکر نہ کرو، وہ نہیں اٹھے گی وہ بہت گہری نیند سو رہی ہے اتنی آسانی سے نہیں جاگے گی۔" مشتاق احمد کا مذاق اڑاتا مگر پر یقین لہجہ شفا کی سماعتیں چیر گیا۔

"آپا کو مارنے کی گھناؤنی سازش یعنی سلو پوائزن۔" وہ پتھر کا بت بنی اپنے سوچ کے پرندوں کو اڑان بھرتا دیکھ رہی تھی، تصور میں اسے اپنی آپا کی سادگی شوہر پر حد درجہ یقین کی کئی مثالیں اور واقعات سب یاد آ رہے تھے، وہ کتنا اندھا اعتبار کرتی تھیں مشتاق احمد پر اور وہ شخص حقیقت میں کتنا ناقابل اعتبار تھا اس کا انہیں اندازہ تک نہیں تھا، وہ انہیں مارنے کی سازشیں کر رہا تھا اور وہ واقعی میں اس کے ہاتھوں اپنے اندھے یقین کی بنیاد پر مر رہی تھیں۔

شفا کو وفا کی اس دیوی کی بدنصیبی پر جی بھر کر رونا آیا اس کا دل چاہا وہ اس حقیقت کے آشکار ہوتے ہی چوک میں پاؤں پسار کر بیٹھ جائے اور دھاڑیں مار مار کر روئے اور روتے روتے ہی مشتاق احمد کا گھناؤنا روپ دنیا والوں کو دکھا دے، مگر وہ کس قدر بدنصیب تھی اس کا اندازہ اسے اپنی بے بسی دیکھ کر ہوا تھا۔

مگر اسے اپنی بدنصیبی و کم ہمتی کے آگے ہار نہیں ماننا تھی، اسے لڑنا تھا خود کے لئے بھی اور اپنی آپا اور ان کے بچے کی زندگی کے لئے بھی، مگر وہ ایسا کیا کرتی جو مشتاق احمد کا اصل و گھناؤنا روپ اسے دکھا پاتی اگر بات صرف اس کی عزت و آبرو کی ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح یہ مشکل دن گزار ہی جاتی مگر وہ مشتاق احمد کا بھرم ہمیشہ ہی قائم رکھتی وہ کبھی بھی جان بوجھ کر اپنی بہن کو مشتاق احمد کی اصلیت بتا کر دکھی وغیرہ نہیں کر سکتی

تھی وہ کبھی بھی اس یقین اعتماد میں دراڑ نہیں ڈال سکتی تھی جو وہ آنکھیں بند کر کے اپنے زندگی کے ساتھی پر کرتی تھی مگر اب بات صرف اس بھرم یا یقین و اعتماد کی نہیں تھی اب بات اس کی بہن کی زندگی کی تھی، جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی، شفا کو اپنی آبرو نہیں بچانی تھی اب اسے دو زندگیاں بچانی تھیں اور اس سلسلے میں صرف ایک شخص تھا جس پر وہ اعتماد کر سکتی تھی، اس نے لمحوں میں فیصلہ کر کے میڈیکل اسٹور والے سے موبائل مانگا، مگر اس کی بدقسمتی نمبر بند جا رہا تھا اس نے دو بار کال ملائی مگر نمبر ہنوز پاور آف تھا، ناچار اسے آنسو پیتے واپس آنا پڑا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے آج تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔" مشتاق احمد نے آپا کلثوم کو گھر کا دروازہ کھولتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا، وہ تو جان بوجھ کر گھر دیر سے آتا تھا تاکہ کلثوم اچھی طرح سو جائے اور وہ شفا کے ساتھ کچھ وقت تنہائی میں گزار سکے مگر آج کلثوم کو دیکھ کر اس کے ارمانوں پر اوس گر گئی تھی، آج تو اسے دوٹوک اور حتمی بات کرنا تھی شفا سے، آج تو اسے اس کا جواب چاہیے تھا، اگر وہ مان جاتی تو ٹھیک ورنہ اسے مجبوراً انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتیں اور اس بات کے لئے وہ ذہنی طور پہ تیار تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے ناں تمہاری۔" وہ خود کو سنبھالتے فکرمندی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا ہر سادہ و بے ریا بیوی کی طرح آپا کلثوم بھی شوہر کے استفسار پر نہال ہو گئی۔

"بس ٹھیک ہی ہوں، نقاہت تو ہر وقت رہتی ہی ہے۔" وہ بمشکل خود کو گھسیٹتی کچن کی طرف بڑھیں۔

"تو تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا، شفا کدھر ہے وہ کھانا دے دیتی مجھے۔" انہوں نے بظاہر سنجیدگی سے ٹوکتے اس کے متعلق پوچھا حالانکہ دل تو بری طرح سے اسے دیکھنے کو ہمک رہا تھا دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف بھی کنڈلی مارے ہوئے تھا کہ کہیں وہ چلی ہی نہ گئی ہو اور اگر ایسا ہوتا تو مشتاق احمد کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

"اس کو بخار تھا اس لئے اسے میں نے دوا دے کر سلا دیا ہے آپ کپڑے چینج کر لیں میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" مشتاق احمد بے چین و مضطرب سا کپڑے بدلنے چلا گیا، حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ فوری طور پر جا کے اس پری وش کا دیدار کرے، مگر دل کی خواہش کے سامنے دنیا داری کے تقاضے بھاری تھے، وہ منہ ہاتھ دھو کے آیا تو کلثوم کھانا گرم کر کے برآمدے میں رکھی میز پر رکھ چکی تھیں، مشتاق احمد نے بس ذرا کی ذرا دیکھا کلثوم کا بھاری بے ہنگم وجود، سانولا رنگ عام سے نقوش اس کا ذہن و آنکھیں ترازو میں بدل گئیں اس نے بے ساختہ بے واختیار ہی دونوں بہنوں کا موازنہ کیا۔

ایک گلاب کے پھولوں سے بھی زیادہ نازک تھی اور دوسری طرف کلثوم کا وجود تھا جو دن بدن اپنی کشش کھو رہا تھا مشتاق احمد کے دل پر اس نے کبھی بھی رانی بن کے حکمرانی نہیں کی تھی کیونکہ مشتاق احمد نے کبھی اپنے دل کے بند کواڑ اس کے لئے کھولے ہی نہ تھے یہ الگ بات ہے ہر عورت کی طرح آپا کلثوم، مشتاق احمد کو اپنا مجازی خدا بنائے ہوئے تھی مگر ہر وفا کسی کا نصیب نہیں ہوا کرتی کلثوم کا نصیب بھی نہیں تھی۔

مشتاق احمد کا دل کھانے سے اچاٹ ہو گیا مگر وہ بے دلی سے کھانے کی میز پر بیٹھ گیا، آپا کلثوم اس کے حسین و خوبصورت نقوش پر نگاہیں جما کے پوچھنے لگیں، وہ کس قدر خوش نصیب تھیں

کہ انہیں اتنا وجیہہ ہم سفر کا ساتھ ملا تھا، بچپن میں جب پڑوس کی خالدہ باجی کے گھر وہ ان سے ڈائجسٹ کی کہانیاں سننے جاتی تھی تو اکثر کہانیوں کے ہیرو بہت وجیہہ اور جداگانہ شخصیت کے حامل ہوتے تھے۔

کلثوم گھر آ کے کئی کئی دن ان ہیروز کے حصار میں گھری رہتی خود بخود ہی سپنے پرونے کی عمر میں ان کے ذہن میں اپنے جیون ساتھی کے لئے ایک خاص تصور بن گیا تھا، پھر جب بہت سال بعد جب وہ تخیل پختہ ہو گیا مشتاق احمد کا رشتہ ان کے لئے آیا اور آتے ہی قبول بھی کر لیا گیا تب وہ دونوں خوشبو کی مانند ہواؤں میں چکراتی رہیں، ان کا سپنا سچا ہو گیا تھا خواب پورے ہو گئے تھے اس قدر خوبصورت شخص ان کا ہمسفر تھا، شادی کے بعد مشتاق احمد کی بے اعتنائی و رکھائی کی وہ اس کی خوبصورتی و نخرہ کرنے کا حق سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی، انہیں کبھی بھی اس کا رویہ سرد نہیں لگا تھا۔

''کیا بات ہے، ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ اسے اپنی جانب محویت سے دیکھتا پا کر بے زاری سے پوچھ رہا تھا۔

''بس ایسے ہی۔'' کلثوم نے جھجک کر بس اتنا ہی کہا تھا۔

''چائے لیں گے یا دودھ گرم کر دوں۔'' وہ بات بدل گئی تھی۔

''چائے۔'' مشتاق احمد نے نگاہیں جھکا کے کھانے کی ٹرے پرے دھکیلی۔

''آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا ٹھیک سے، بس ایک ہی روٹی اور میں ایسا کرتی ہوں دودھ لے آتی ہوں، اس سے نیند اچھی آئے گی۔''

''بالکل بھی نہیں، جو میں نے کہا ہے وہی کرو مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر آنکھیں موند کے کرسی کی پشت پر ڈھیلا ہو کر لیٹ گیا، کلثوم لب بھینچتی خاموشی سے پلٹ گئی، مشتاق احمد کے حسب خواہش اس نے اسے چائے تیار کر کے دی اور پھر اس کے قریب آ بیٹھی ابھی لائٹ جانے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

''یہ چائے بنائی ہے تم نے۔'' اس نے غصے سے پیالی پرچ میں پٹخ دی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' مشتاق احمد نے اس کے استفسار پر منہ کے زاویے بگاڑ کے غصے کو پینے کی کوشش کی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے کچے پانی میں پتی ڈال کے میرے سامنے رکھ دی ہو، تمہیں تو چائے بھی نہیں بنانا آتی۔'' وہ اس پر غصہ ہوا کلثوم نے بس ایک نظر اس کے برہم چہرے کو دیکھا، غصہ تو خوبصورت نقوش کو بھی بگاڑ دیا کرتا ہے۔

''میں اور بنا دیتی ہوں۔'' وہ بغیر کچھ کہے اور بنانے کے لئے اٹھی۔

''رہنے دو اب، میں یہی زہر مار کر لوں گا زندگی عذاب بنا دی ہے میری، سکون نام کو بھی نہیں۔'' وہ چائے کی پیالی ایک ہی سانس میں ختم کرتے وہاں سے اٹھ گیا تھا کمرے میں لیٹی شفا اپنی بہن کے دکھ پر روتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

صبح کاذب کے وقت وہ اس کے کمرے میں آیا تو شفا بے خبر سو رہی تھی، اس نے دیکھا بخار کی حدت سے اس کا ماتھا تپ رہا تھا، وہ نجانے کتنی دیر اس کے بے خبر و معصوم وجود پر نگاہ جمائے کھڑا تھا اس کی طرف دیکھتے جیسے اسے اپنے فیصلے میں مزید مضبوطی دکھی تھی اس نے سوچا تھا کہ وہ شفا کو ورغلا لے گا اگر اس نے اس کا

ساتھ دیا تو وہ دونوں شادی کر کے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے مگر شفا جتنی بھولی نظر آتی تھی اتنا تھی نہیں۔

وہ تو اسے گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی مشتاق احمد کو خود پر جتنا ناز تھا شفا نے اس کے اس فخر و غرور کو خاک میں ملانے کی ٹھان لی تھی، مگر مشتاق احمد زندگی کو خود سے اتنی بڑی خوشی چھیننے کی اجازت اتنی آسانی سے نہیں دے سکتا تھا، اگر شفا نہیں مان رہی تھی تو وہ کلثوم کی موت کا انتظار کر سکتا تھا چاہے وہ جس وقت بھی ہو بچے کی پیدائش کے وقت نہ سہی اس کے چالیس روز میں پھر کسی بھی دن، کلثوم کے بچے کو اس کی سسرالی والے سوتیلی ماں سے بچانے کی خاطر تو شفا کا رشتہ بخوشی طے کریں گے ہی ناں۔

وہ کلثوم کی طبیعت کے پیش نظر وہ پہلے ہی شفا تک پہنچانا چاہتا تھا تا کہ فیصلہ اس کے حق میں ہی ہو، وہ آہستگی سے اس پر جھکا تھا۔

''مشتاق! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' اسے اپنے پیچھے کلثوم کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھا وہ اسے اتنی صبح اپنے سامنے جاگتا دیکھ کے حیران و ششدر رہ گیا تھا، وہ اتنی صبح صبح کیسے اٹھ گئی تھی۔

''تم جاگ رہی ہو؟'' اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔

''ہاں آپ کو ناشتہ بھی تو بنا کے دینا تھا، اسی لئے رات دوا نہیں لی تا کہ صبح وقت پر اٹھ سکوں، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' وہ اپنے سوال پر واپس آ گئی۔

''ہاں...... میں...... وہ...... شفا کو جگانے آیا تھا کہ ناشتہ بنا کر دے دے۔'' ان دونوں کی مکالمہ بازی نے شفا کو جگا دیا تھا مگر وہ جان بوجھ کے آنکھیں موندے پڑی رہی مبادا مشتاق احمد اسے ہی ناشتے کے لئے نہ کہہ دے۔

''اسے آپ سونے دیں بخار ہے اسے، ناشتہ میں بنا دیتی ہوں آپ کو آئیں۔'' وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کے پلٹ گئی مشتاق احمد کافی دیر شفا کو دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر پلٹ ہی گیا۔

☆☆☆

پھر قسمت بالآخر شفا پر مہربان ہو ہی گئی تھی، ایک دن یونہی اچانک بغیر بتائے سانول چلا آیا، شفا کی پیاسی آنکھیں سیراب ہو گئیں، دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے پہ فدا ہی ہو گئے، وہ سچ میں بہت خوش تھی، کلثوم نے اس روز بہت اچھا کھانا بنوانے کے لئے شفا کو ہدایت دی مگر سانول نے ٹوک دیا۔

وہ ایک دوست کے ساتھ وہاں کسی کام سے آیا تھا بس انہیں کچھ دیر ملنے کے لئے وہ وہاں آیا تھا کھانے کا تردد اسے دیر کروا سکتا تھا۔

''مگر شفا خوش تھی کہ وہ اسے جو بتانا چاہتی ہے بتا سکتی تھی مگر، آپا کلثوم تو انہیں کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔''

''تم ٹھیک ہو شفی۔'' سانول نے جاتے سے اس سے پوچھا تو آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے شفا بس سر ہلا کے رہ گئی۔

''پچھلے چند روز سے میں تمہیں خواب میں عجیب پریشان سا دیکھتا رہا، میرے تو دل کو پنکھے لگ گئے دل چاہتا تھا کہ اڑ کے پہنچ جاؤں میں تمہارے پاس۔'' وہ پریشان سا بولا تو شفا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''میں نے بھی تمہیں فون کیا تھا تمہارا نمبر بند تھا۔'' شفا نے آہستگی سے بتایا۔

''اچھا تم نے فون کیا تھا خیریت تھی ناں۔''

''بس ویسے ہی تمہاری یاد آ رہی تھی،

سانول ایک بات کہوں۔" شفا نے اپنی بہتی آنکھوں کو صاف کیا سانول نے بے اختیار اثبات میں سر ہلایا، وہ اسے کچھ الجھی الجھی و پریشان سی لگ رہی تھی۔

"کچھ نہیں، تم جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" اچانک اس نے بات بدل کے اسے جانے کو کہہ دیا تھا سانول اور بھی الجھ گیا وہ اسے وہ بات کیوں نہیں بتا رہی تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی مگر شفا اسے بتا نہیں سکی، تھا تو وہ بھی ایک مرد ہی ناں، کیا خبر وہ اس کا اعتبار نہ کرتا۔

"شفی! تم یہاں خوش نہیں ہو یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں، سچ کہوں تو میرا بھی دل نہیں لگتا وہاں، ہر روز دن گننے میں گزر جاتا ہے کہ تمہاری واپسی میں کتنے روز باقی ہیں، جلدی آنا یار۔"

"مجھے آپا کی بہت فکر رہتی ہے سانول، تم دعا کرو کے سب خیر رہے۔"

"تم بس اللہ سے دعا کرنا کہ آپا خیریت سے اپنے بچے کے ساتھ آباد رہیں اور انہیں بچی خوشیاں ملیں میں جلدی آجاؤں گی۔" وہ بے ربط سی اس کے چہرے کو آنکھوں کے رستے دل میں سموتے ہوئے بولی۔

"میں تو ہر وقت تمہارے جلدی واپس آنے کی دعائیں مانگتا ہوں یار۔" سانول بے ساختہ ہی ہنسا پھر جیب سے موبائل نکال کر اسے دیا۔

"یہ رکھ لو، کبھی بھی کسی بھی وقت کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے کال کر دینا۔"

"مگر مشتاق بھائی کو یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا وہ تو ویسے ہی غصے میں رہتے ہیں اگر انہوں نے میرے پاس فون دیکھ لیا تو بہت مشکل ہو سکتی ہے۔" اس نے فون لینے سے انکار کر دیا۔

"اچھا۔" سانول نے فون دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"پھر چلتا ہوں میں، اپنا بہت سا خیال رکھنا شفی۔"

"دعا کرنا سانول، سب خیر ہو۔" وہ اسے جاتے جاتے بھی کہنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

"آج کون آیا تھا یہاں؟" مشتاق احمد نے شفا کو دیکھتے پوچھا، جس کا چہرہ آج غیر معمولی روشنی سے چمک رہا تھا۔

"آپا کی طبیعت بہت خراب تھی اسی لئے وہ آج سر شام ہی سو گئیں تھیں۔"

"سانول!" شفا نے مڑ کے کچن میں جاتے رک کر بتایا مشتاق احمد کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کے گرا۔

"کیوں؟ وہ کیوں آیا تھا یہاں۔" شفا نے اس کی اس حرکت کو تمسخرانہ انداز سے دیکھا پھر اس کی خوش فہمی دور کرنے کا ارادہ کر کے وہ اس تک پلٹ آئی۔

"مجھ سے ملنے اور مجھے لینے کے لئے۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہتے اس کا اطمینان رخصت کیا۔

"وہ کیوں آیا تھا تم سے ملنے اور تمہیں لینے کے لئے، میری اجازت کے بغیر۔" وہ دھاڑا۔

"کیونکہ وہ مجھے لینے کے لئے آ سکتا ہے اسے یہ حق میں نے خود دے رکھا ہے اور میرے والدین نے بھی۔" وہ بھی غصے سے تپی تپی بولی تھی۔

"تم کون ہوتی ہو اس کو یہ حق دینے والی، تم صرف میری مرضی و خواہش ہو اور میں تمہیں کبھی بھی کسی اور کو اہمیت دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔" وہ اٹھ کے اس کے قریب آیا اور انگلی اٹھا کے اسے وارن کیا شفا ڈری نہیں بلکہ آج اس کھیل کو ختم کرنے کی ٹھان کے وہ بھی دوبدو جواب دینے لگی تھی۔

"آپ صرف میری بہن کے شوہر ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں، میں صرف اپنی بہن کی وجہ سے خاموش ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے جو دل میں آئے وہ بولتے رہیں آپ کو شرم آنی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔" وہ سن کر استہزائیہ ہنسا پھر بولا۔

"میں نے بہت وقت اسی شرم و حیا میں ہی ضائع کیا ہے، اب اور نہیں اپنی من پسند چیز تو میں حاصل کر ہی لیا کرتا ہوں سیدھی طرح سے نہیں تو ٹیڑھی کر کے ہی سہی۔"

"میں صبح ہی یہاں سے چلی جاؤں گی، میں اب اور یہاں نہیں رہ سکتی۔" شفا اس کی دھمکی سے نہیں ڈری تھی بلکہ وہ خود تن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں تمہیں جانے کے قابل چھوڑوں گا تو تم جاؤ گی ناں۔" وہ لپک کر اسے بالوں کی چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف لے جانے لگا خطرے کی گھنٹیاں شفا کے وجود میں بجنے لگیں وہ اسے کمرے کی طرف کیوں گھسیٹ کے لے جا رہا تھا۔

"چھوڑیں مجھے، یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہ اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جمائی چیخ اٹھی اندر بے خبر سوئی کلثوم کی آنکھ نجانے کس احساس کے تحت کھل گئی، وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی مگر اس کے پپوٹے بہت بھاری تھے اس کی آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں۔

"چھوڑ دو مجھے ذلیل انسان۔" باہر شفا مسلسل خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی جس پر آج شیطانیت بری طرح سے حاوی تھی۔

"آج میں تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا، پھر دیکھتا ہوں کیسے سانول تمہیں اپناتا ہے، تمہیں ڈر ہے ناں کہ مجھ سے شادی کرنے پر دنیا تجھ پر تھوکے گی لے اب دیکھنا آج کے بعد کیسے سب تم پہ تھوکیں گے۔" آپا کلثوم حیرت سے اپنے کمرے کی دہلیز پہ کھڑی ساری صورتحال دیکھ رہی تھیں وہ مغلظات بک رہا تھا شفا کسی نہ کسی طرح خود کو اس کے شکنجے سے آزاد کر کے کچن کی طرف بڑھی سامنے ہی سیمنٹ بجری کی بنی شیلف پر چھری رکھی تھی شفا نے لپک کر وہ چھری اٹھا لی۔

"میرے پاس مت آنا مشتاق احمد ورنہ میں اپنی جان لے لوں گی۔" وہ چھری اس کی طرف لہرائے اسے وہیں اپنے قدم جمانے کو کہہ رہی تھی۔

"شفا یہ کیا پاگل پن ہے رکھ دو چھری۔" مشتاق احمد ذرا سا گھبرایا۔

"نہیں آج اس بات کا فیصلہ ہو کے ہی رہے گا یا تو میں رہوں گی یا پھر میری بہن کا سہاگ بچے گا۔" وہ ہذیانی انداز میں چھری کی دھار دار نوک اپنی طرف کیے وحشت سے کہہ رہی تھی آپا کلثوم نے اس سارے منظر کو نا سمجھ میں آنے والی حیرت سے دیکھا یہ کیا چل رہا تھا سالی بہنوئی کے بیچ اور شفا کیا کہہ رہی تھی اور یہ صورتحال؟

"شفا! کلثوم کی حالت دیکھو، کچھ اس کا ہی خیال کر لو، میں وعدہ کرتا ہوں جو تم کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔" صورتحال بگڑتے دیکھ کر مشتاق احمد نے فوراً ہی پینترا بدلا تھا اور یہ مشتاق احمد کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا تھا۔

"شفا! یہ کیا کر رہی ہو تم۔" اچانک ہی آپا کلثوم کے استفسار نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا،

مشتاق احمد کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کی مانند کلثوم کی طرف پلٹا۔

”سمجھاؤ اپنی بہن کو، میرے لئے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ہے اور یہ بضد ہے کہ میں تمہیں طلاق دے کر اس سے شادی کرلوں۔“ مشتاق احمد تھکے تھکے نڈھال سے انداز میں کہتا کلثوم کی طرف پلٹا، شفا کی رنگت اڑگئی اس نے بے حد ششدر انداز میں اسے پینترا بدلتے دیکھا اور بس وہی ایک لمحہ جب اس کا رنگ اڑا آپا کلثوم نے اس کی طرف شکوہ کناں نظروں سے دیکھا اس ایک نظر میں کیا نہیں تھا، دکھ، حیرت، غصہ، شکوہ اور شاید نفرت بھی مگر شفا اس نظر کو اپنے اندر گڑتا نہیں دیکھ سکتی تھی وہ اسے دھوکا دے رہا ہے وہ بتانا سمجھانا چاہتی تھی وہ اپنی بہن کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی تھی۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے آپا، مجھے اماں کی قسم میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ پلٹ کر اس کی طرف بڑھی آپا کلثوم نے اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

”میں کتنے دنوں سے پریشان ہوں کلثوم، آخر میں اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں اب آج اس نے مجھے اپنے مارنے کی دھمکی دے کر مجھے ورغلانے کی پوری کوشش کی ہے۔“ اب وہ اپنے ڈرامے میں پوری طرح حقیقت کا رنگ بھرنے کو باقاعدہ رو رہا تھا۔

”آپا...... یہ جھوٹ......“ مگر بہن کی آنکھوں میں نظر آتی بے اعتباری نے شفا کو اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”اندر جاؤ شفا۔“ آپا کلثوم نامی بت میں ذرا سی دراڑ پیدا ہوئی، مگر شفا وہاں سے نہیں ہٹی تو آپا کلثوم چلا اٹھی۔

”میں نے کہا اندر جاؤ شفا۔“

”نہیں میں اندر نہیں جاؤں گی تب تک جب تک میں اس کی گھناؤنی حرکتیں آپ کو بتا نہیں دیتی۔“ وہ ہذیانی انداز میں چیخی مگر مشتاق کا بھاری ہاتھ چٹاخ کی آواز سے اس کے گال پر پڑا۔

”بے حیا، بے شرم پکڑے جانے پر بھی شرمندہ ہونے کی بجائے زبان چلاتی ہے ابھی بھی تجھے لگتا ہے کہ وہ تیرا یقین کرے گی، اپنے کانوں سے سب سن لینے کے بعد بھی۔“ وہ اس سے چھری لینے کی کوشش میں آگے بڑھا تھا مگر شفا نے اسے چھری پکڑنے نہیں دی بلکہ اسی چھری کو اپنے اندر اتار لیا تھا اس کی دلدوز چیخیں پورے گھر میں چکرا رہی تھیں، آپا کلثوم کی چیخوں نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا، مشتاق احمد نے بہت حیرت سے شفا جیسی دھان پان لڑکی کی اس جرأت مندانہ حرکت کو دیکھا تھا جو اپنی آبرو کے ساتھ اپنی بہن کا گھر بھی بچا گئی تھی۔

☆☆☆

اسے فوری طور پہ ہسپتال پہنچایا گیا تھا اس نے خود کو اس طرح چھری ماری تھی کہ وہ اس کے سیدھے دل پر جا لگی تھی، ڈاکٹرز نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی اماں اور سانول اچانک ملنے والی خبر پر بھاگے دوڑے آئے تھے، افشاں و خیزاں سے، سانول کو اپنی دنیا لٹتی محسوس ہو رہی تھی وہ بار بار ان دونوں سے پوچھ رہا تھا کہ آخر شفا نے خودکشی کیوں کی مگر اسے کوئی مناسب جواب نہیں مل سکا۔

”ہمارے گھر چور آئے تھے ان چوروں نے اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی، اپنی جان بچانے کی کوشش میں اس نے اپنی جان لے لی۔“ یہ من گھڑت کہانی آنے والوں کو مشتاق احمد نے سنائی تھی۔

"کیا یہ سچ ہے آپا۔" وہ آپا کلثوم سے تائید چاہ رہا تھا، مشتاق احمد نے پہلو بدل کے اسے دیکھا۔

"ہاں وہ چور ہی تھا جس سے شفی اپنی عزت کی حفاظت نہ کرسکی۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہہ گئی تھیں مشتاق احمد نے بے ساختہ خود کو ہلکا پھلک ہوتا محسوس کیا پولیس کو بھی یہی سب بتایا گیا مگر انہیں کاروائی سے روک دیا گیا۔

"آپ میں سے مسٹر سانول کون ہیں؟" اچانک ہی آئی سی یو کا دروازہ کھلا تو نرس نے باہرا کر سب سے سوال کیا۔

"جی...... میں ہوں جی۔" وہ بے تابی سے اندر کی طرف بڑھا۔

"آپ کی مریضہ کی حالت بہت نازک ہے وہ آپ کو پکار رہی ہیں، جلدی اندر آیئے۔" سانول ایک نظر ان دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھتے نرس کے پیچھے بڑھ گیا تھا، اماں تو جب سے آئی تھیں آنکھیں موندے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں، ضبط کی انتہا پر کھڑے ہو کے آپا کلثوم نے اس بند دروازے کی طرف دیکھا، شفا کا بچپن، اس کی شرارتیں اس کی ہنسی اس کی شوخیاں سب کسی فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی اور پھر کل کا واقعہ، شفا کے ان کے گھر میں گزارے روز و شب اور وہ آخری رات، سانول اندر آیا تو شفا اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی یوں جیسے بہت تکلیف میں ہو سانول کا دل کٹ کے گرا وہ بے ساختہ شفا پر جھکا۔

"سانول!" درد کو دباتے وہ کتنی مشکل سے بول رہی تھی سانول کو اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں لگا۔

"آ...... آپا...... سے کہنا...... میں نے...... ان...... کے ساتھ...... کوئی زیادتی نہیں کی۔"

"شفی کیا ہوا تھا مجھے بتاؤ شفی، تمہاری یہ حالت کس نے کی ہے۔" سانول اسے بولنے پر اکسا رہا تھا اور شفا پیاسی نظروں کو سیراب کرتی بس یک ٹک اسے رہی تھی۔

"بول شفی...... کچھ تو بول۔" سانول جیسا بھرپور کڑیل جوان مرد رو پڑا شفا نے اس کے ساتھ زیادتی بھی تو کی تھی اسے اپنی محبت کا اسیر کر کے خود راہ اجل کی مسافر بن گئی تھی اس کی دلدوز چیخیں سارے ہسپتال نے سنی تھیں۔

☆☆☆

سانول کمرے میں آیا تو وہ ننھی پری پالنے میں سوئی ہوئی تھی، آپا کلثوم وہیں کمرے میں ننھی مریم کے کپڑے سمیٹ رہی تھیں، شفا کی موت کے بعد سے وہ بالکل ہی بدل گئیں تھیں، بہت باتونی تو وہ پہلے بھی نہیں تھیں مگر اب تو وہ بالکل ہی خاموش تھیں، سانول بہت دنوں سے انہیں شفا کی مرنے سے پہلے کہی بات بتانا چاہتا تھا مگر وہ ان کی حالت کے پیش نظر خاموش رہا تھا اور شفا کی اچانک و ناگہانی موت نے تو خود اسے بھی اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

"ارے آؤ سانول، کیسے ہو بڑے دنوں بعد آئے۔" وہ اسے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کے بولیں تو وہ بے ساختہ ہی دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔"

"ہاں بولو۔" وہ ہنوز مصروف سے انداز میں بولیں تھیں۔

"مجھے شفا کا ایک پیغام دینا تھا آپ کو۔" اس نے آہستگی سے کہتے ان کی سماعتوں پر بم پھوڑا وہیں ساکت ہو گئیں۔

"شفا نے مرنے سے پہلے مجھے جانتی ہیں

کیا کہا، کہ آپا سے کہنا میں نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، اس نے ایسا کیوں کہا تھا آپا، میں ہر روز دن رات کو یہ بات سوچ کے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں مگر کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگتا۔" سانول بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے اس پر شک نہیں تھا سانول، مجھے تو بس اس بات کا دکھ ہے کہ میں اپنے ہی گھر اپنے ہی شوہر سے اس کی عزت کیوں نہیں بچا سکی، میں جانتی ہوں اس نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، مگر جو زیادتی میں اپنی بے خبری میں اس کے ساتھ کر چکی ہوں مجھے وہ پچھتاوا چین نہیں لینے دیتا، میں سمجھ کیوں نہیں سکی جب بارہا اس نے مجھ سے اپنے گھر واپس جانے کو کہا تھا میں یہ بھی کیوں نہیں سمجھ سکی کہ وہ مشتاق کی موجودگی میں کمرے میں ہی کیوں چھپی رہتی تھی، میں اسے شرم و حیا پہ کیوں محمول کرتی رہی اور سانول میں تو یہ بھی نہیں سمجھ سکی کہ میرا شوہر مجھے خود نشہ آور ادویات کا استعمال صرف میری بہن کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کو کروا رہا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے روتیں سانول پہ ساتوں آسمان گرا رہی تھیں۔

"تو کیا مشتاق بھائی نے......" سانول کے لہجے میں سرسراہت تھی۔

"ہاں۔" آپا کلثوم نے سر جھکا دیا۔

"اور آپ پھر بھی ان کے ساتھ رہ رہی ہیں اپنی بہن کے قاتل کے ساتھ؟" وہ غصے سے بھڑ گیا۔

"میری بہن کا قاتل میری بیٹی کا باپ بھی ہے سانول اور میری ماں جو اپنی جوان بیٹی کا غم سینے سے لگائے جی رہی ہے وہ اپنی دوسری بیٹی کی بربادی پر تو مر جائے گی اور شفا نے صرف میرے سہاگ کو بچانے کی خاطر ہی اپنی جان لی ہے، یہ دنیا بہت ظالم ہے سانول، یہ ہمیں نہیں جینے دے گی۔"

"آپ مشتاق احمد کا بھرم رکھ رہی ہیں آپ کو شفا کی موت کا کوئی غم نہیں، وہ بہن تھیں آپ کی۔" وہ غصے سے کہتا وہاں سے اٹھ آیا تھا اور آپا کلثوم سانول کو یہ نہیں سمجھا پائی تھیں کہ مشتاق احمد کا بھرم رکھنا ان کی مجبوری تھی کیونکہ ایک تو وہ ان کی بیٹی کا باپ تھا دوسرا جب لوگ مشتاق احمد پہ انگلی اٹھائے گا تو ساتھ ہی شفا پر بھی انگلی اٹھے گی، کیونکہ دنیا والے کسی کو بھی نہیں بخشا کرتے۔

اور وہ خود نا چاہتے ہوئے بھی مشتاق احمد کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھی، اپنی جان دے کر بھی اس کی بہن نے اس کا سہاگ بچانے کی کوشش کی تھی خود پر ظلم و جبر سہتے اس نے اپنی بہن کو اس تکلیف سے بچایا تھا تو کیا وہ اتنا سا بھی جبر خود پر نہیں کر سکتی تھیں اگر وہ یہ گھناؤنی اور کریہ حقیقت دنیا والوں پر آشکار کریں گی تو ہر گھر میں موجود شفا اپنے بہنوئی سے بات کرتے ہوئے ڈرے گی ہر کلثوم اپنی بہن کو اپنے گھر بلانے سے ہچکچائے گی اور یہ خوبصورت رشتہ اور اس کی پاکیزگی یوں ہی مشتبہ ٹھہرتی رہے گی انہیں صبر کے یہ گھونٹ پینے ہی تھے چاہے ہنسی خوشی چاہے درد سے، کیا عورت کبھی کھل کے بھی سانس لے پائے گی، انہوں نے تھک کے سوچا تھا۔

☆☆☆

بارھویں قسط

''شاہ بخت!'' کے ہاتھوں ہونے والا وہ ایکسیڈنٹ کسی عام راہگیر کا نہیں تھا، ''اسد عمر'' کا تھا جس نے ایس پی اسید مصطفیٰ کو اس حد تک مشتعل کیا تھا کہ وہ ہر حد بھول گیا تھا، اسد کی حالت نازک تھی اور اس کے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کے بعد مسلسل وہ اس کے پاس ہی رہا تھا، اسد کو کافی زیادہ چوٹیں آئی تھیں اور خون بہت بہا تھا اور اس بہنے والے خون کا بدلہ اس نے بہت اچھے طریقے سے لیا تھا، اس نے شاہ بخت کا حشر نشر کروا دیا تھا۔

حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بخت کا تعلق ایک اثر و رسوخ رکھنے والی فیملی سے تھا اور اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے ایس پی اسید مصطفیٰ کو اچھی خاصی مشکل میں ڈال سکتا تھا، اگرچہ اس بات کا ثبوت کہیں نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ اس فیلڈ میں ہونے کی بناء پر جانتا تھا کہ شاہ بخت کی فیملی کو

ناولٹ

ثبوتوں کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ کون سا کورٹ جانا چاہتے ہوں گے؟ مگر اس کے باوجود وہ یقیناً اسید مصطفیٰ کی جاب کو خطرے میں ڈال سکتے تھے، وہ اس حقیقت سے باخبر تھا مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا، کمان سے تیر نکل چکا تھا، اب تو جو بھی ہونا تھا وہ اس کے بے داغ سروس ریکارڈ پہ ایک ان مٹ دھبہ ہونا تھا، مگر بہت حیرت انگیز بات ہوئی، بخت نے کوئی قدم نہ اٹھایا تھا، کئی دن گزر گئے، اسے انتظار ہی رہا کہ اسے ہائی اتھارٹی سے کوئی کال آئے گی اور اس کی فرد جرم پڑھ کر سنائی جانے لگے گی۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا، اس کا انتظار، انتظار ہی رہ گیا اور اسد ٹھیک ہو کر گھر آ گیا اور یوں جب وہ پہلی بار ان کے گھر آیا تو اس نے حیا کو صاف ستھرے لباس میں نک سک سے تیار دیکھا اور اس کی بیٹی کو بھی، تو نجانے کیوں اس کے اندر

ایک سکون اترا تھا، اس نے اسید کو دیکھا جو نارمل انداز میں حبا کو کھانا لگوانے کو کہہ رہا تھا، اب اس کو یقین آ گیا تھا کہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔

اسید مصطفیٰ نے سمجھوتہ کر لیا تھا، وہ سمجھ داری کی راہ پہ چل نکلا تھا، اس کے اندر اطمینان اتر آیا تھا، انہوں نے ایک پرسکون ماحول میں کھانا کھایا تھا، شفق کو سلانے کے بعد حبا لاؤنج میں چلی آئی جہاں وہ دونوں گزرے زمانوں کی گفتگو میں مگن تھے، وہ انہیں مصروف دیکھ خاموشی سے کافی بنانے کے لئے مڑ گئی، وہ کافی لے کر آئی تو اسید کے چہرے پہ ایک مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''تھینک یو سوچ حبا، واقعی کافی پینے کا بہت دل کر رہا تھا۔'' اس نے کپ تھامتے ہوئے اس کو ساتھ بیٹھنے کا کہا تھا اور وہ بیٹھ گئی، اسد نے بھی دونوں کو ساتھ بیٹھے دیکھا تو شرارت سوجھی تھی۔

''اسید یاد ہے حبا کتنا اچھا گانا گایا کرتی تھی، حبا آج کچھ سناؤ ناں۔'' اسد نے فرمائش کی تو حبا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''گانا؟'' اس نے اسید کو دیکھا تو اس نے بھی سر ہلا کر گویا تائید کی تھی، اب تو گویا فرض ہو چکا تھا، اس نے آہستگی سے گلا صاف کیا اور بولنا شروع کیا۔

''تم کو دیکھا...... تو خیال آیا۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی تھی۔

''زندگی...... دھوپ...... زندگی...... دھوپ۔'' اس نے اٹک کر پھر سے دہرا کر بے بسی سے اسید کو دیکھا، جیسے اگلا مصرعہ بھول گئی ہو، اسید نے سیکنڈز میں اس کا مدعا سمجھا تھا، اس نے بازو اس کے گرد لپیٹ کر اسے ساتھ لگا لیا، اسد کی ہنسی بے اختیار تھی۔

''بولو ناں یار...... زندگی دھوپ تم۔'' اسید نے اسے حوصلہ دیا تھا، حبا نے اس کو دیکھتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔

''گھنا سایہ۔''

''ویری نائس۔'' اسد نے ہنس کر کہا تھا۔

''تھینک یو۔'' اسید نے مسکرا کر اسے کہتے ہوئے ذرا سا پیچھے ہٹ کر ٹیک لگائی تھی اور بالکل سامنے بیٹھے اس کے ماموں زاد ''اسد عمر'' نے ایک ہپی فیملی کا سین بڑے مطمئن دل کے ساتھ دیکھا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اسید بھی اسے یہی کچھ دکھانا چاہتا تھا۔

اور شام گھر جا کر اس نے مرینہ کو فون کر کے کہا تھا کہ ''ہاں آپ نے ٹھیک کہا تھا، اسید بدل گیا ہے وہ سمجھ دار ہو گیا ہے اور اس نے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔'' یہ سب کہتے ہوئے خوشی اس کے لہجے سے کھنک رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی میں کچھ بیماریاں روح کی ہوتی ہیں، ہر بیماری کا تعلق جسم سے ہوتا تو شاید کوئی مسئلہ اس دنیا میں جنم ہی نہ لیتا اور زندگی میں خوشی و خوشحالی کا دور دورہ ہوتا، نفسیات دان آج تک اس بات پہ حیران ہیں کہ بچپن کی تربیت ہی انسان کی شخصیت بناتی اور سنوارتی ہے اور یہی کمیاں اور خامیاں اس کی پوری زندگی کو گہنا بھی دیتی ہیں۔

بہت دفعہ تو نفسیات بھی اس بات کا پتہ نہیں لگا پاتی کہ آخر انسانی دماغ کے ایسے کون سے راز ہیں جن کی بناء پر وہ اپنی زندگی میں ایسے حیران کن قدم اٹھاتا ہے کہ عام حالات میں وہ ان کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا۔

طلال بن مصعب اور نوفل بن مصعب! دو خوبصورت چہرے، دو خوبصورت نام!

دونوں نے اپنے گھر اپنے بے تحاشا خوبصورت باپ اور نیگرو ماں کو دیکھا تھا اور ان کی

ماں اگرچہ سیاہ فام تھی مگر اس کے باوجود یہ ان کے باپ کا دبا گیا اعتماد ہی تھا کہ جب وہ میٹنگز میں، بزنس ڈیلینگز میں اور پریزنٹیشن ہال میں بولتی تھی تو بڑے بڑوں کو چپ کروا دیتی تھی۔

طلال کو اپنی ماں سے نفرت تھی، وہ اس سے خوف کھاتا تھا، وہ ہمیشہ سے گھر سے دور رہنا چاہتا تھا، اسے یہ تضاد بہت کھلتا تھا کہ وہ تینوں باپ بیٹے اس قدر خوبصورت تھے تو ان کی ماں کیوں نہیں؟

بچپن سے ہی وہ گھر سے دور ہوسٹل میں پناہ گزین ہو گیا، وہ کسی کو بھی اپنی پہچان نہیں دینا چاہتا تھا اس کو یہ خوف تھا کہ وہ اپنی ماں کی شناخت کو کس طرح فیس کرے گا، اس نے ہمیشہ اپنے دوستوں کو گھر سے دور رکھا تھا، اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ چھٹیوں میں بھی گھر نہ آئے اور باپ اور بھائی سے باہر ہی کسی طریقے سے مل لے اور بہت جلد اس چیز کا احساس صدیق احمد شاہ کو بھی ہو گیا تھا۔

اور اس احساس کی آگہی نے ان کے اندر سناٹے بھر دیئے تھے، وہ آج کل چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے تھے، کہ جب وہ ٹیبل پہ کھانا کھانے آتے تو طلال کو اچانک کوئی ضروری کام یاد آ جاتا، کبھی اس کا فون بج اٹھتا تو کبھی اس کو اچانک پتا لگتا کہ اس کی بھوک مر گئی تھی۔

وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا، نوفل تو ہمیشہ سے ان کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا، تبھی وہ ماما، پاپا کا انتظار کر رہا تھا مگر ان کے آنے سے پہلے ہی طلال آ گیا، وہ دونوں اس وقت اولیولز میں تھے، اس نے آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچا دیا تھا، بٹلر نے فوراً کھانا لگانا شروع کر دیا، اسی وقت ماما اور پاپا بھی آ گئے فریش ہو کر، نوفل کو خوشی ہوئی کہ کافی عرصے بعد آج وہ اکٹھے ہو کر کھانا کھائیں گے، جبکہ طلال کے وہی کام، اس نے جیسے ہی ان دونوں کو آتے دیکھا، کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے طلال؟ کدھر جا رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دل نہیں چاہ رہا۔''

''مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ......'' نوفل حیرت سے بولنے لگا مگر طلال کی سرد نظروں نے اسے وہیں چپ کروا دیا تھا۔

''طلال! کیا بات ہے بیٹا؟'' اس کی ماما نے نرمی سے کہا، طلال نے ان کی بات کا جواب دینا گوارہ نہیں کیا تھا۔

''کیا ایشو ہے تمہارے ساتھ؟'' پاپا نے قدرے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''کوئی ایشو نہیں ہے۔'' اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو پھر بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں بیٹھنا چاہتا میں۔'' اس نے ضدی انداز میں کہا تھا۔

''کوئی وجہ بھی تو ہو۔'' وہ جھلا کر پوچھ رہے تھے۔

''I don,t want to see her۔'' وہ نفرت بھرے انداز میں بولا تھا اور وہاں موجود باقی تینوں نفوس پہ جیسے بجلی گری تھی۔

''شٹ اپ۔'' نوفل نے سرخ رنگت کے ساتھ بلند آواز میں کہا تھا جبکہ پاپا شاکڈ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''کیا بکواس کی ہے تم نے ابھی؟'' پاپا نے بے یقینی سے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا، اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوایا تھا۔

''وہی کہا، جو آپ نے سنا۔'' وہ اب بھی اسی انداز میں اپنی بات دہرا رہا تھا، نوفل نے دیکھا اس کی ماں کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے، تمہیں احساس ہے کہ تم کس کو اس طرح کی بات کہہ رہے ہو، یہ ماں ہے تمہاری۔'' صدیق نے غصے سے پاگل ہوتے ہوئے چلا کر کہا تھا۔

''نو، شی از ناٹ مائی مدر۔'' وہ چلا کر بولا، آواز کسی طرح باپ کی آواز سے کم نہ تھی۔

''یہ میری ممی نہیں ہوسکتیں، آپ جھوٹ بولتے ہیں، شی از بلیک، شی از آ نیگرس، آئی ہیٹ بلیک، اینڈ آئی ہیٹ ہر۔'' وہ بھی پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ رہا تھا۔

صدیق کی آنکھوں میں خون اتر آیا، ان کے سترہ سال کے بیٹے نے ان کے بیس سال کے لازوال عشق کو ٹھوکر پر دیا تھا، انہوں نے بے اختیار اس کے گال پہ ایک زوردار طمانچہ مارا تھا۔

''آپ نے مجھے تھپڑ مارا؟'' طلال نے اپنے گال پہ بے یقینی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا، اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ باپ جس نے اس کے ساتھ کبھی بلند آواز میں بات نہیں کی تھی اب، آج اس پر ہاتھ اٹھایا تھا، اسے مارا تھا، وہ بھی اس عورت کے سامنے جس کی وہ شکل تک نہ دیکھنا چاہتا تھا، اس کی بے یقینی سمجھ آتی تھی، اس کا باپ اب اسے بلند آواز میں گالیاں دے رہا تھا۔

''میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔'' وہ دھاڑ رہے تھے۔

''کیوں میں کیوں جاؤں؟ میں کہیں نہیں جاؤں گا، آپ اس عورت کو دفع کریں یہاں سے، یہ اس قابل نہیں کہ اسے یہاں رکھا جائے، اس کی شکل سے نفرت ہے۔'' وہ تنفر سے کہہ رہا تھا، ان کے مارے گئے تھپڑ نے اس کا خوف بالکل ختم کر دیا تھا۔

اس کی بات نامکمل تھی جب دوسرا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور اس کی بات مکمل ہو بھی نہ سکی، اس کی زبان دانتوں تلے آ کر کٹ گئی تھی اور اس کے منہ سے خون کی دھار نکل رہی تھی، نوفل نے ہراساں ہوتے ہوئے اپنی ماں کو دیکھا، دوسروں کو خاموش کروانے والی وہ عورت جس کا دوٹوک لہجہ اور مدلل گفتگو اگلے کو بولنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی، آج اپنے ہی پیدا کیے ہوئے بیٹے کی نفرت سے ہار گئی تھی۔

اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا اور وہ بمشکل کھڑے ہو پا رہی تھی، اس کو چکر آ رہے تھے، اس نے ماں کا بازو پکڑ لیا۔

''ماما! چلیں یہاں سے۔'' وہ انہیں وہاں سے لے جانا چاہتا تھا، مگر پاپا کی آواز نے انہیں وہیں رک جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

''کوئی نہیں جائے گا کہیں۔''

''اگر گیا تو، یہ جائے گا...... تو...... طلال بن معصب، جاؤ اپنا سامان پیک کرو اور اس گھر سے اپنی منحوس صورت اور غلیظ فطرت لے کر دفع ہو جاؤ۔'' یہ صدیق احمد شاہ کا حکم تھا۔

''آپ مجھے گھر سے نکال رہے ہیں؟ صرف اور صرف اس کی وجہ سے۔'' طلال نے بے یقینی سے کہا تھا، اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

''نہیں، میں تمہیں تمہاری وجہ سے نکال رہا ہوں۔'' انہوں نے قطعیت سے کہا، طلال نے سرخ چہرے کے ساتھ قدرے نفرت سے اور ایک فیصلہ کرتے ہوئے قدم پیچھے ہٹائے اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس دنیا میں قدم قدم پر ہمیں ایسی حیرت انگیز چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے اور ایسے حیران کن واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ انسانی عقل ماننے میں متامل ہوتی ہے، مگر شاید اب

بھی معجزات اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے، مگر مسئلہ تو سارا یہ تھا کہ شاہ بخت مغل اچھا خاصا ہوشمند انسان تھا، وہ کوئی بے وقوف اور جاہل مرد نہیں تھا کہ اپنی اتنی چاہ سے لائی گئی بیوی سے کسی قسم کی باز پرس کرتا یا سوالات اٹھاتا اس کے بدلے ہوئے رویے پر، مگر بہرحال وہ ایک مرد تھا، اس کے ذہن میں علینہ کے اتنے نرم اور محبت بھرے رویے سے یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اس قابل تھا کہ کوئی بھی لڑکی جو اس کی ساتھی بنتی اسے اہمیت دینے پہ مجبور ہو جاتی اور علینہ کے جھکنے کا مطلب بھلا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس نے شاہ بخت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے، وہ دلی طور پر بے حد مطمئن تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ پہ ہاتھ چلاتے ہوئے گھڑی پہ نگاہ دوڑائی، علینہ تقریباً آدھے گھنٹے سے غائب تھی، غالباً نیچے کچن میں تھی، اس وقت گیارہ بج رہے تھے، شاہ بخت کو سردی محسوس ہو رہی تھی، اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دیئے تاکہ بستر میں جا سکے، وہ چاہتا تو لیپ ٹاپ اٹھا کر بھی بیڈ پہ جا سکتا تھا مگر اسے پتا تھا کہ علینہ کو غصہ آ جاتا، اسے بے ترتیبی پسند نہیں تھی اور ناچاہتے ہوئے بھی بخت کو اس کی بات ماننی پڑتی تھی، وہ اس سے الجھتی نہیں تھی مگر وہ اتنی معصوم صورت بنا کر اسے دیکھتی کہ بخت کو ہنسی آنے لگتی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، بخت نے گردن موڑ کر دیکھا، سیاہ لمبی قمیض کے ساتھ کھلا فلیپر پہنے اور سفید دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ اندر آ گئی، ہاتھ میں چھوٹا سا ٹرے تھا، جس میں دو گلاس دودھ کے تھے۔

''تمہارا کام ختم نہیں ہوا؟'' اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر بخت کو دیکھا۔

''بس ہو گیا۔'' اس نے کہا۔

وہ اس کے پیچھے آ گئی، بخت اس وقت ریوالونگ چیئر پہ بیٹھا تھا، علینہ نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر گال اس کے گال کے ساتھ ملا لیا تھا۔

''تم سے مل کے، ایسا لگا تم سے مل کے ارمان ہوئے پورے دل کے......!'' وہ آہستہ سے گنگنا رہی تھی، شاہ بخت کا قہقہہ بے اختیار تھا۔

''اُف اتنی خوفناک آواز۔'' وہ چلایا۔

علینہ نے جھٹکے سے اسے چھوڑا اور پیچھے ہٹ گی، اس کے تاثرات ایکدم بدل گئے تھے۔

''ہاں مجھے پتا ہے میری آواز اچھی نہیں ہے۔'' اس نے خفا خفا سے انداز میں اسے گھورا، مگر اس سے پہلے کہ بخت کچھ کہتا وہ پھر گانے لگی، انداز سے شرارت نمایاں تھی۔

''تیری میری، میری تیری اک جان ہے۔'' ساتھ ہی وہ ہنس بھی رہی تھی، بخت نے اسے چڑانے کی خاطر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں، مگر اس نے ذرا بھی برا منائے بغیر جھنجلا کر اس کے ہاتھ کانوں سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس نے بخت کا کان کھینچنا شروع کر دیا، وہ ہنستے ہوئے اپنے آپ کو چھڑوانے لگا تھا اور جب وہ اس میں کامیاب ہوا تو اس کا کان سرخ ہو گیا تھا، اس نے کان سہلاتے ہوئے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

''ظالم لڑکی۔'' اب کی بار وہ اس پر جھپٹا اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر گویا اسے چیلنج کرنے لگا کہ ''اب بولو'' علینہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پھر اپنے بازوؤں کو، پھر اس نے بے ساختہ اپنے آپ کو چھڑوانا چاہا مگر ناکام رہی، اب وہ

اسے گدگدا رہا تھا، وہ ہنسنے لگی۔

”بخت ...... نہ کرو...... چھوڑ دو۔“ وہ ہنس رہی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بخت کو جیسے ترس آ گیا، اس نے اسے چھوڑ دیا، وہ پیچھے ہٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی، اتنا زیادہ ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔

”مجھے لگتا علینہ! میں تمہارا شوہر ہونے کی بجائے دوست ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”وہ کیسے؟“ علینہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ ایسے کہ......تم مجھے ٹریٹ یوں کرتی ہو جیسے ہم دوست ہیں، آئی مین، شرارتیں، میں نے پہلے تمہیں کبھی اس طرح کھلکھلاتے نہیں دیکھا اور مجھے لگتا تھا کہ تم خاصی سنجیدہ قسم کی شخصیت ہو گی۔“ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے اب بستر پہ آ چکا تھا۔

”اوہ......یعنی تمہیں اچھا نہیں لگتا میرا یوں تمہارے ساتھ فرینکلی بات کرنا یا تمہیں تنگ کرنا۔“ وہ کسی قدر حیران مگر افسردگی سے پوچھ رہی تھی۔

”اوہ یار......علینہ تم کتنی بے وقوف ہو۔“ شاہ بخت نے اسے پیار سے کہتے ہوئے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”جی نہیں، میں بے وقوف نہیں ہوں۔“ اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

”جی نہیں، آپ ہو۔“ اس نے اپنی بات پہ زور دیا، علینہ اسے بھنویں اچکا کر چند لمحے دیکھتی رہی پھر ہنس دی۔

”ایک دن آپ یہ ماننے پہ مجبور ہو جائیں گے کہ میں قطعی طور پر بے وقوف نہیں ہوں۔“ اس نے ایک گہرے یقین کے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔

”اچھا میری جان دیکھیں گے۔“ اس نے مسکرا کر اسے ساتھ لگا لیا تھا، مگر کہیں اندر وہ بہت حیران ہوا تھا، علینہ واقعی حیرت انگیز تھی۔

☆☆☆

وہ آج بہت تھک گئی تھی، رات اسے بہت دیر بعد نیند آئی اور نیند بھی کیا صرف سونے کا دکھاوا، کروٹیں بدل بدل کر وہ نڈھال ہو گئی، آدھی رات اس کی آنکھ لگی تھی مگر کچی نیند میں ہی اسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا تھا، وہ پریشان ہوئی تھی اور جب اس نے بمشکل درد سے جلتی آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسید کو دیکھ کر وہ شاکڈ رہ گئی، رات کے اس پہر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ بلکہ کیا کرنے آیا تھا؟

اسید اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اب خاموشی سے اس کے بستر کے قریب آ گیا تھا، حبا نے نہ سمجھی سے اسے دیکھا تھا، وہ اس وقت نائٹ سوٹ میں تھا، لائننگ والے ٹراوزر میں لائٹ کریم کلر کی شرٹ پہنے ہوئے تھا حیرت انگیز طور پر اس کے پیروں میں جوتا نہیں تھا، وہ حیران ہوئی تھی، اسید کو ننگے پیر پھرنے کی عادت نہ تھی اور نہ ہی وہ اتنا لاپرواہ تھا کہ بھول جاتا، تو پھر کیا ہوا تھا؟

اس نے کمرے میں نائٹ بلب ہی آن کیا ہوا تھا سونے سے پہلے، جبھی اس وقت بلب کی ہلکی نیلی روشنی میں اس نے اسید کے چہرے کا جائزہ لیا، جو کہ اس وقت ستا ہوا تھا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی متورم تھیں اور آنکھوں کے زیریں کنارے گہری سرخی میں ڈوبے ہوئے تھے، حبا کو خوف آنے لگا؟ بھلا اسید کو کیا ہوا تھا؟

وہ اس طرح اپ سیٹ کیوں لگ رہا تھا؟ آخر کیوں؟ ایسا کیا ہو گیا تھا اس کے اندر عجیب سے احساسات اٹھ رہے تھے، اس نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اسے توڑنے والا انسان خود اتنا

ٹوٹ بھی سکتا ہے؟

اسید اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بیڈ کی دوسری طرف آ گیا حبا نے نظر دوڑائی اور اسے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا تھا، وہاں شفق سوئی تھی، کیا وہ شفق کی طرف جا رہا تھا؟ لیکن کیوں؟ اسید ذرا سا جھکا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔

حبا کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں، وہ سب کچھ بھول کر اس مخمصے میں پڑ گئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟

”کہیں وہ شفق کو مارنا تو نہیں چاہتا؟“ برق کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی، مگر تب تک اسید کے دونوں ہاتھ شفق تک پہنچ چکے تھے، اس نے حبا کو یوں اٹھتے دیکھا تو ایک دم گھبرا گیا۔

مگر پھر اس نے بے ساختہ شفق کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور پیچھے ہٹنے لگا، حبا نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ ہلکے سے بڑبڑایا، اس کی آواز میں کچھ عجیب تھا، کچھ ایسا جس کی حبا کو سمجھ نہیں آ سکی تھی۔

”اسے مجھے دے دیں۔“ حبا پلنگ سے نیچے اتر آئی۔

”نہیں۔“ اس نے سختی سے کہا اس کی آواز میں کھردراہٹ تھی۔

”لیکن یہ سو رہی ہے، یہ اٹھ جائے گی۔“ حبا کو عجیب سی گھبراہٹ نے آن گھیرا، آخر اس نے شفق کو کیوں پکڑا تھا کیوں؟ وہ آگے بڑھی تھی۔

”میں نے کہا ناں میں نہیں دوں گا۔“ وہ بلند آواز میں چلایا تھا۔

”لیکن کیوں؟ ہوا کیا ہے؟ آپ نے اسے کیوں پکڑا ہے؟“ حبا کا تو دل حلق میں آ گیا تھا۔

”لیکن کیوں، آپ اسے کیوں لے کر جا رہے ہیں، کون سی سزا دینی ہے، مجھے دے لیں، اسے مت لے کر جائیں، یہ تو بچی ہے۔“ وہ حواس باختہ ہو کر بولی جا رہی تھی، اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اس نے آگے بڑھ کر اسید کے ہاتھوں سے اسے لینے کی کوشش کی تھی، اسید نے اسے ایک ہاتھ سے سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے حبا کو پرے دھکا دیا تھا، اسی دوران میں شفق جاگ گئی تھی اور خود کو اس ناقابل فہم سچویشن میں پا کر اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

”دیکھیں نا وہ رو رہی ہے، پلیز۔“ حبا نے بے تاب ہو کر پھر اس کی طرف لپکنا چاہا۔

”کیوں کیوں کیوں؟ دوں میں اسے تمہیں؟“ وہ وحشت زدہ تھا، اس کے چہرے پہ کیا تھا؟ اس کے لہجے میں کیا تھا؟ شفق اب اور اونچی آواز میں رو رہی تھی، حبا نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ، اسے مجھے دے دیں، وہ رو رہی ہے، مجھے اسے چپ کرانے دیں۔“ اس نے کرب سے کہتے ہوئے ایک بار پھر اسید سے شفق کو لینا چاہا، مگر وہ دروازے کی طرف جانے لگا، حبا پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگی، وہ اس کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا اور حبا اس کے پیچھے پیچھے تھی، وہ اپنے کمرے کے دروازے پہ پہنچ کر رکا اور حبا کی طرف مڑا تھا۔

”میرے پیچھے مت آؤ جاؤ۔“ وہ حلق کے بل دھاڑا اور کمرے میں داخل ہو گیا، حبا نے

جلدی سے اس کے پیچھے داخل ہونے کی کوشش کی مگر اسید نے دروازہ بند کرنا چاہا تھا، حبا نے دروازے کو دھکیل کر اندر جانا چاہا، اسید کے ایک ہاتھ میں شفق تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ دروازہ بند کر رہا تھا جبھی اس کی طاقت بٹ گئی تھی، حبا نے اپنا ہاتھ دروازے کی درز میں پھنسا دیا تا کہ وہ دروازہ بند نہ کر سکے اور یہ حرکت اسے مہنگی پڑ گئی تھی، دروازہ پوری قوت سے بند کیا گیا اور حبا کا ہاتھ کچلا گیا، اس کی شہادت کی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا تھا، اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی تھی اور اس کی کراہٹ نے اسید کی گرفت ایک لمحے کے لئے کمزور کی تھی، جس کی وجہ سے وہ زور لگا کر اندر داخل ہو گئی اور اس نے جھپٹ کر اسید کے بازو میں محفوظ شفق کو اس سے لینا چاہا تھا۔

''میں نہیں دوں گا، نہیں دوں گا۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بول رہا تھا، جب اس کی نظر حبا کے خون آلود ہاتھ پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی تکلیف ابھری تھی۔

''کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں اس کے ساتھ، مارنا چاہتے ہیں اسے؟'' وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی، اسید نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''میں...... میں ماروں گا اسے، یہ اتنی چھوٹی سی بچی کو میں ماروں گا؟'' وہ اسی بے یقینی سے پوچھ رہا تھا، پھر جیسے کوئی لاوا پھٹ نکلا تھا۔

''میں انسان ہوں حبا، انسان ہوں میں، جانور نہیں ہوں، نہ ہی سانپ، جو اپنے بچے کھا جاتا ہے، یہ بیٹی ہے میری، یہ میری ہے۔'' وہ بلند آواز میں بولتا ہوا آخر میں یکدم روہانسا ہو گیا تھا اور حبا ایک بار اسید مصطفی سے ہار گئی، اس شخص نے آج اس پر ایک اور احسان کر دیا تھا، اس نے ''میری بیٹی'' تسلیم کیا تھا، اگرچہ اس کے ہاتھ میں بے حد درد ہو رہی تھی مگر اسے یہ الفاظ سن کر لگ رہا تھا اس کی حسیات مردہ ہو گئیں ہوں، وہ بے ساختہ زمین پہ گر گئی، اسید اس کے سامنے تھا، شفق رو رہی تھی، اسید رو رہا تھا، حبا رو رہی تھی اور وہ تینوں رو رہے تھے اور ان کے ساتھ کمرے کی ہر چیز رو رہی تھی۔

اسید نے شفق کو سینے سے لگایا ہوا تھا پھر اس نے حبا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ساتھ لگا لیا اب وہ دونوں کو اپنے کشادہ ظرف سینے میں سمیٹے ہوئے تھا، اس کی کریم کلر کی شرٹ پر آنسوؤں کے نشان تھے اور کمرے میں تین لوگوں کے آنسو آپس میں گھل مل رہے تھے۔

☆☆☆

اور پھر اس نے خود پر اپنے باپ کے گھر جانے کی پابندی لگا لی، اس کو ضرورت بھی کیا تھی؟ وہ سکالرشپ پر پڑھ رہا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے پاپا نے اسے ماہانہ خرچ دینا ترک نہیں کیا تھا، وہ اس کے اکاؤنٹ میں پیسے بھیج دیتے تھے، مگر اس کے ساتھ قطعی کوئی رابطہ رکھنے کو تیار نہ تھے، اسے بھلا کہاں ضرورت تھی ان کی، جبھی اس نے اس صورتحال کو بڑی تیزی سے قبول کر لیا، اس نے اپنی اک نئی دنیا تخلیق کی، خوبصورت لوگوں کی دنیا۔

جس کے سب چہرے خدا کے پیدا کیے ہوئے بہترین حسن کا شاہکار تھے، اس کے دوستوں سے لے کر نوکروں تک ہر شخص اجلے رنگ والا خوشنما اور دلکش تھا، اسے لوگوں کے دل سے کوئی واسطہ نہ تھا، اس کو خوبصورتی سے عشق تھا، وہ باطن نہیں ظاہر دیکھتا تھا۔

اپنی ڈیزائننگ کی تعلیم کرتے ہی اس نے فیشن ورلڈ میں انٹری دے دی، ابتداء میں اس کی شاندار شخصیت کو دیکھتے ہوئے اسے بھی کئی لوگوں نے ایزائے ماڈل اور ایکٹر لینا چاہا مگر وہ سہولت

سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر اس کی کامیابی حفصہ کرمانی کی شکل میں اس تک آ گئی، اس لڑکی کو سیڑھی بنا کر اس نے اس دنیا کو دیکھا جس تک جانے کے ہمیشہ بس وہ خواب دیکھتا تھا، لیکن اس خواب کی تعبیر میں اس نے ''میرب فاروق'' کو کھو دیا، میرب اس کی پہلی چاہت! اس کی سب سے اچھی دوست! اور اس کے حلقہ احباب میں سب سے خوبصورت لڑکی، جسے دیکھ کر اس نے پہلی مرتبہ شادی کے متعلق سوچا تھا اور جب وہ اسے حاصل کر لینے کی منزل سے بس دو چار قدم دور تھا، اس نے میرب کو کھو دیا اور تب وہ پہلی بار ٹوٹا تھا، جب اسے رد کیا گیا تب اسے معلوم ہوا کہ وہ ذلت کیا تھی جو اس نے گیارہ سال پہلے اپنی ماں کے چہرے پہ ملی تھی، ہاں...... تب اس خوف کا مفہوم سمجھ آیا تھا، تب اسے احساس ہوا تھا کہ اندھیرے جب ذات کے اندر اتر آئیں تب دنیا کی کوئی خوبصورتی دل کو نہیں بھاتی اور جب دل مردہ ہو جائے منزلیں خواہ کتنی بھی پرکشش کیوں نہ ہوں، اجاڑ ہی نظر آتی ہیں۔

مگر کہتے ہیں نا انسان کی عادت کبھی نہیں بدلتی ''عادت فی الموت'' یعنی عادت موت تک ساتھ دیتی ہے وہ بھی زیادہ دیر اس کا غم سینے سے لگائے نہ بیٹھ سکا، وجوہات اور ترجیحات جو تھیں۔

وجوہات، ترجیحات اور مفروضات انسان کی زندگی کے گول سیٹ کرتے ہیں، انسانی ذہن ایسی عجیب چیز ہے کہ سمجھنا مشکل، انسان کبھی بھی مرنے والے کا غم دل سے لگا کر نہیں بیٹھتا، وہ زندگی کو آگے بڑھانا جانتا ہے، اس نے بھی میرب کا غم دل سے نہیں لگایا تھا، اگر لگا کے بیٹھ جاتا تو کھاتا کہاں سے اور جو اسٹیٹس اس نے بنا لیا تھا اسے قائم رکھنا کوئی اتنا آسان تو نہیں تھا، اگر وہ گھر بند ہو کر بیٹھ جاتا تو دو دن میں سڑک پہ آ جاتا۔

جبھی اس نے درمیانی راہ اختیار کی تھی، اس نے سب کچھ پھر سے شروع کر دیا تھا، آخر کو اس کا ایک نام تھا، وہ کیسے اپنا نام اندھیروں کی نظر ہوتے ہوئے دیکھتا جس پر اس نے اتنی بے تحاشا محنت کی تھی۔

دوسری طرف اس کے گھر والوں پہ کیا بیتیا؟

وہ اس سے بے خبر نہیں تھا، نوفل نے ہمیشہ اسے اپ ڈیٹ رکھا تھا، خواہ کچھ ہو جاتا اور نوفل اس سے ملتا بھی تھا، اگرچہ وہ دونوں بھائی تھے اور جڑواں تھے اور ان میں عمروں کا فرق نہیں تھا مگر اس کے باوجود نوفل نے ہمیشہ بڑے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔

طلال اس چیز سے بے خبر نہیں رہا تھا کہ اس کے گھر چھوڑ کے آ جانے کے بعد باقیوں کا کیا بنا؟ اس کی ماں بہت بیمار پڑ گئی، اس نے اس کے باپ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا، وہ کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہی تھی، وہ اکثر روتی رہتی، بار بار صدیق سے پوچھتی کہ اگر میں ایسی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے تو اللہ نے ایسا بنایا ہے میں نے خود تو نہیں نا بنایا اپنے آپ کو اور اگر میں ایسی ہوں تو اس کا مطلب ہے مجھے میری اپنی اولاد ریجیکٹ کر دے گی، چھوڑ دے گی، نوفل پھر کیوں میرے ساتھ ہے اسے کہو وہ بھی چلا جائے۔''

اور نوفل کیسے جاتا، اس نے اپنی ماں کی بیماری میں اس کا ساتھ دیا تھا، وہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا رہتا، ان کی تیمارداری کرتا، ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا اور وہ اسے دیکھ کر پھر رونے لگ جاتیں۔

بہت دفعہ صدیق اور نوفل کے لئے انہیں سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا اور تب نوفل باپ

کے گلے لگ کر بے حد رو تا تھا۔

بعض اوقات انسان اپنے سے وابستہ رشتوں کے لئے کس قدر بے حس ہو جاتا ہے کہ اسے ان کی کوئی فکر، کوئی پرواہ نہیں رہتی، اس کو بھی بھلا کیا فکر تھی کہ وہ عورت جس نے اسے جنم دیا تھا، وہ کس قدر اذیت میں تھی، انسان کو رشتوں کی قدر شاید صرف تب ہی آتی ہے جب وہ انہیں کھو دیتا ہے۔

اس دنیا میں کوئی غم موت سے بڑا نہیں ہو سکتا، موت اس دنیا کا سب سے بڑا غم ہے اور جب کوئی مر جاتا ہے تو پھر ہم لاکھ چاہیں اسے واپس نہیں لا سکتے، ہماری شرمندگی ہمارا پچھتاوا صرف ہم تک رہ جاتا ہے اور مرا ہوا شخص دنیا کے دکھوں سے آزاد منوں مٹی تلے دب جاتا ہے۔

وہ بھی مر گئیں۔

اس دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو کر وہ بھی مٹی تلے پناہ گزین ہو گئیں، سب ختم ہو گیا، طلال بن معصب کی نفرت اور دھتکار اور رد کیے جانے کا خوف، سب کچھ ختم ہو گیا اور بس ایک گہری تاریکی چھا گئی۔

نوفل نے روتے ہوئے فون کر دیا تھا اور وہ خاموش رہا تھا، بعض فیصلے وقت کر دیتا ہے، اس کا فیصلہ بھی وقت آنے پہ ہونا تھا۔

☆☆☆

عباس شادی کے بعد بہت بدل گیا تھا، اس نے جو وقت کراچی تنہائی میں گھر والوں کی مداخلت کے بغیر گزارا تھا، اس نے دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا، سبین ایک با کمال لڑکی تھی، اسے ہمیشہ اپنے فیصلے پر فخر ہوا تھا۔

بخت اور علینہ کی شادی کے بعد اس کی نظر مسلسل ان دونوں پر ہی تھی، وہ بھی باقی لوگوں کی طرح اس مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ آخر ایسا کیا جادو کر دیا تھا بخت نے علینہ پر؟

وہ ایک دم سے بدلی ہوئی نظر آتی تھی، اس کی شوخیاں پہلے بھی عباس نے نہیں دیکھی تھیں اور نہ ہی اس نے علینہ کو اتنا بے فکر اور چنچل دیکھا تھا، وہ بہت حیران تھا، کئی بار سبین سے بھی ڈسکس کیا تھا مگر بخت سے تاحال اس نے اپنے تاثرات چھپائے ہوئے تھے، مگر وقار سے بہرحال وہ چھپا نہ سکا تھا۔

''تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ خوش ہیں۔'' انہوں نے اتنی حیرانی اور ناگواری سے پوچھا کہ عباس شرمندہ ہو گیا تھا۔

''نہیں میرا ایسا مطلب نہیں تھا؟'' اس نے گڑبڑا کر وضاحت دینا چاہی تھی۔

''بہرحال تمہارا جو بھی مطلب تھا، میرا نہیں خیال اس قسم کی ڈسکشن کی کوئی بھی ضرورت ہے۔'' ان کا لہجہ سخت تھا، عباس مزید شرمندہ ہو گیا۔

''یار تم کو سمجھنا چاہیے، وہ تمہاری بہن ہے وہ خوش ہے تمہیں صرف اسی بات سے مطلب ہونا چاہیے، اس سے زیادہ تحقیق مت کرو، یہ نہ ہو اس کا نقصان ہو جائے۔'' انہوں نے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔

عباس نے سرخ چہرے کے ساتھ ان کی بات سنی اور سر ہلا کر اٹھ گیا، مگر سبین کے سامنے وہ پھٹ پڑا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی وقار بھائی کو کیا تکلیف ہے؟ وہ تو ابھی تک شاہ بخت کے گرد حفاظتی حصار بنے بیٹھے ہیں، بس کر دینا چاہیے اب انہیں، جو وہ چاہتے تھے وہ کر تو لیا ہے۔''

''کیا ہوا؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' اس نے حیرت سے عباس کو دیکھا تھا، وہ غصے میں تھا۔

''ہاں ہوئی ہے، بہت سخت الفاظ میں ڈانٹا ہے انہوں نے، بھلا ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے یہی نا کہ آخر ایسا کیا کر دیا بخت نے علینہ کو جو وہ یوں خوش نظر آتی ہے، تو اس میں یوں غصہ کرنے کی کیا بات تھی؟ وہ تو جیسے تیار بیٹھے تھے میرے سے الجھنے کے لئے دیکھیں نا آپ، یہ تو نیچرل بات ہے نا کہ شاہ بخت اور علینہ کے شادی سے پہلے اتنے جھگڑے، وہ سارے تماشے یقیناً اتنی آسانی سے تو نہیں بھلا سکتا ہوں، پھر اب یہ ایکدم سے یوں ٹھیک ہو جانا، مجھے تو بالکل ہضم نہیں ہو رہا۔'' وہ تفصیلاً ساری بات بتانے کے بعد سانس لینے کے لئے رکا تھا۔

''اس بات نے تو مجھے بھی حیران کیا تھا عباس، مگر پھر میں نے یہی سوچا کہ لڑکی سمجھوتہ کر ہی لیتی ہے۔'' سبین نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

عباس نے چونک کر اسے دیکھا، کیا وہ اپنا اور اس کا حوالہ دے رہی تھی، اس نے سبین کے چہرے پہ کچھ کھوجا تھا مگر وہ ہمیشہ کی طرح ملائم و پر سکون تھا۔

''وہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے مگر پھر بھی سمجھوتہ کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ سب کچھ بھول جائے اور یوں ری ایکٹ کرے جیسے وہ بس اسی دن کے انتظار میں تھی۔'' وہ اب کی بار کچھ جھلا کر کہہ رہا تھا، سبین ہنس پڑی۔

''اب آپ زیادہ ہی فیل کر رہے ہیں عباس، ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ دونوں نارمل ایک ہپی کپل کی طرح رہ رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا تھا، عباس نے الجھ کر سر جھٹکا تھا وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اس نے کوئی اٹھارویں بار اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا، کندھوں سے ذرا نیچے گرتے سیدھے سیاہ بال جو کہ اسٹیپ کی شکل میں کٹے ہوئے تھے، اس وقت گردن کے اوپر ایک سیاہ بینڈ میں جکڑے گئے تھے، فرسٹ اسٹیپ چھوٹا ہونے کی وجہ سے بینڈ سے باہر نکل کر اس کے ماتھے پہ گرا ہوا تھا، اس نے اس وقت سیاہ ڈاٹس والی ایک لمبی قمیض پہنی تھی جس کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ تھا اور سفید ہی دوپٹہ تھا۔

چہرہ صاف ستھرا تھا، کسی بھی قسم کی آرائش سے مبرا تھا، اسی طرح اس کے ہاتھ اور گلے میں کوئی زیور نہیں تھا، ہاں البتہ اس کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں تھیں جو کئی سال پہلے اسے تحفے میں ملی تھیں، اس نے بالوں کی ایک لٹ کو کانوں کے پیچھے کیا اور پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا، جہاں شفق گہری نیند سوئی ہوئی تھی، پھر اس نے اپنی انگلی کو دیکھا جہاں موٹی سی بینڈ ایج لگی تھی، حیرت انگیز طور پر ناخن ٹوٹنے کے باوجود اسے اتنا درد نہیں تھا، ہاں واقعی اسے درد کم تھا۔

اس نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں بارہ بج کر اکیس منٹ ہو رہے تھے، وہ بیڈ کی طرف آ گئی، اسے نیند نہیں آ رہی تھی، اس نے ٹیک لگا لی، اسے ماما یاد آ رہی تھیں، کافی دن ہو گئے اس کی بات نہیں ہوئی تھی، مستزاد کل سے ہونے والی بارش کی وجہ سے کنکشن ڈس کنیکٹ ہو گیا تھا، جبھی وہ لینڈ لائن پر بھی ان سے بات نہ کر سکی تھی، اسید نے کمپلین کر کے PTCL والوں کو بلایا تھا، شاید کل تک فون ٹھیک ہو جاتا، وہ سر گھٹنوں پہ رکھ کر کچھ سوچنے لگی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں، اسی وقت دروازہ کھول کر اسید اندر آیا، وہ چونک کر سیدھی ہوئی، اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا، وہ اس کو آواز دیتا ہوا اندر آیا تھا۔

''حبا! ماما کا فون ہے۔'' اس نے سیل فون

حبا کی طرف بڑھایا تھا، حبا نے حیرت آمیز خوشی سے فون پکڑ لیا اور بے ساختہ گھٹنے نیچے کر کے فون کان کو لگا لیا۔

"السلام علیکم ماما! کیسی ہیں آپ؟" وہ خوشی سے پوچھ رہی تھی، اسید نے بغور اس کے کھلتے رنگ کو دیکھا تھا، پھر وہ آہستہ سے اس کے مقابل بیٹھ گیا، حبا تھوڑا سمٹ گئی اور پیر پیچھے کر لئے یوں جیسے اس کے احترام میں کوئی کمی نہ آنے دینا چاہتی ہو، اسید نے اس کا یہ انداز بھی نوٹ کیا تھا، پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا دھرا کیا ہوا، آہستہ سے سیدھا کیا، حبا کے ہاتھ میں موجود فون لرز گیا، اس نے بہت ٹھٹک کر اسید کو دیکھا اور پھر اس نے اس سے زیادہ حیران کن چیز دیکھی اسید سیدھا ہو کر لیٹا اور سر اس کے گھٹنے پہ رکھ دیا۔

حبا کو یہ بھول گیا کہ وہ کہاں تھی؟ کیا بات کر رہی تھی، ماما اس سے کچھ پوچھ رہی تھیں مگر وہ آگے سے چپ، اس کی نظریں اسید پر تھیں جس کی دلکش آنکھیں بند تھیں، دوسری طرف ماما نے سمجھا شاید لائن منقطع ہو گئی ہے انہوں نے کال بند کر دی، حبا کے بے جان ہاتھوں نے بڑی مشکل سے سیل کان سے الگ کر کے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"آپ کا فون۔" وہ بمشکل بولی تھی، اسید کی بند آنکھیں کھل گئیں، اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، یا شاید اس کی روح کو دیکھ رہا تھا، اس کے دل کو دیکھ رہا تھا۔

اور حبا کو پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھوں سے بہتا سیال پانی اسید کے ماتھے پہ گرنے لگا۔

محبت پہلے جسم کو نہیں چھوتی
محبت دل سے دل کی طرف جاتی ہے
میں تم تک ایسے ہی پہنچی تھی
آج میں تنہا ہوں
تمہاری محبت صرف میرے جسم کو چھوتی ہے
میری محبت تمہارے دل کو ٹٹولتی ہے
جو خالی ہے......!
میں تمہیں تنہا نہیں ہونے دوں گی
خالی دل سے خالی جسم جب چھوا جاتا ہے
تنہائی دور تک نظر آتی ہے......!!!

وہ بکھر گئی، مگر اس کے باوجود اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا، اس نے اپنے آنسوؤں پہ قابو پاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے گال صاف کیے اور پھر دوپٹے سے اس کی پیشانی صاف کرنے لگی، یوں جیسے وہ اپنے ہاتھوں کے لمس کو اس قابل نہ سمجھتی ہو کہ اسے چھو سکے، اسید اب بھی اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

"حبا! اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو دے سکو گی؟" وہ بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میرے پاس تو ایسا کچھ ہے ہی نہیں جو آپ مجھ سے مانگیں۔" اس نے آزردگی سے کہا تھا۔

"ہاں ہے تمہارے پاس، مجھے سکون چاہیے دے سکتی ہو، بولو دے سکتی ہو۔" وہ ہاتھ اس کے آگے پھیلا کر کہہ رہا تھا، حبا نے ناقابل یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

"جواب دو، دو گی سکون مجھے، میرے وجود کو، میرے دل کو، میری روح کو، سکون چاہیے حبا۔" اس کی آواز رندھ گئی، حبا کو لگا اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک تھی اور ایسے کیسے ہو سکتا تھا اسید حبا سے کچھ مانگتا اور وہ انکار کر دیتی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اسید کا ہاتھ تھاما، اس کا کے خوبصورت ہاتھ، جن سے اسے عشق تھا، وہ ہاتھ جو صرف قلم تھام کر اگر اپنا نام لکھتا تھا تو وہ حکم ہو جاتا تھا، اس کے قیمتی اور مضبوط ہاتھ، جن پر وہ

زندگی قربان کر سکتی تھی۔

اس نے بہت عقیدت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا، وہ بے آواز رو رہی تھی، اسید کا ہاتھ گیلا ہو رہا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا، بہت دیر تک رونے کے بعد اس نے اسید کا ہاتھ ہٹایا اور اسے دیکھا۔

"میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، جو کچھ ہے آپ کا دیا ہوا ہی تو ہے۔" وہ بھیگی اور قدرے بھاری آواز میں بولی تھی۔

"اور میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا، سوائے نفرت، تکلیف اور اذیت کے۔" وہ سفاکی سے بولا اور اٹھ کر بیٹھ گیا، حبا نے تڑپ کر اسے دیکھا، پھر بے ساختہ اس کے دونوں بازوؤں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی پشت سے لپٹ گئی، وہ ساکت ہو گیا۔

"ایسا نہیں ہے، یہ غلط ہے، ایسا مت کہیں، مت جائیں یہاں سے۔" وہ اب اس کی پشت سے گال ٹکائے رو رہی تھی، اسید کو لگا وہ پتھر کا ہو گیا ہو کبھی ہل نہ سکے گا۔

"میں دوں گی، آپ کو جو چاہیے، بس یہاں سے مت جائیں۔" اس نے اسید کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہا، وہ میکانکی انداز میں مڑ گیا، حبا نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ اس کے شانوں پہ رکھ دیئے اس کے ہونٹ بڑی والہانہ چاہت، بے تابی اور محبت سے اسید کے چہرے پہ محبت لٹانے لگے اور اس کے ناتواں بازوؤں نے اسید کا چوڑا چکلا وجود خود میں جذب کر لیا تھا۔

وہ اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھی، اسید نے اپنے ہاتھ چھڑا کر اسے خود میں سمیٹا اور سر تکیے پہ رکھ دیا۔

ہاں، وہاں محبت تھی، جو بالآخر جیت گئی، بے مثال عشق تھا، جو فتح پا گیا تھا۔

حبا تیمور آخر کار اسید مصطفیٰ کو جیت گئی تھی، اپنے بے مثال صبر، ضبط اور حوصلے سے اور اسید مصطفیٰ نے بھی آج ہر اجنبیت کی دیوار گرا کر اس کے وجود کو اپنی روح میں اتارا تھا اور باوجود اس کے کہ وہ اس کے حصار میں تھی اس کی آنکھیں بار بار آنسو بہانے لگیں، اسید اس تکلیف کا ماخذ جانتا تھا، وہ ان آنسوؤں کے پیچھے چھپی درد کی داستان سے آگاہ تھا، اسے احساس تھا کہ وہ ان اذیتوں کا دین دار تھا، جبھی اس نے پہلی قسط ادا کرتے ہوئے اس کے اشک اپنے ہونٹوں سے چن لئے تھے۔

☆☆☆

عائشہ آپی آئی ہوئی تھیں، انہوں نے ستارا کی خوب کلاس لی تھی۔

"تمہارے سسر کا فون آیا تھا ابا کو، بہت پریشان ہیں وہ، دیور تمہارا ہاسپٹل پڑا تھا اور خود تم یہاں آ کر بیٹھ گئی ہو یہ کیا طریقہ ہے، اچھی لڑکیاں اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پہ گھر چھوڑ کر نہیں آتیں۔"

"جب آپ کو یہ نہیں پتہ کہ بات کیا ہے تو پھر آپ اس کے چھوٹا یا بڑا ہونے کے بارے میں کیسے فیصلہ کر سکتی ہیں؟" اس نے غصے سے کہا۔

"تم چھوٹی ہو مجھ سے، چھوٹی ہی رہو، مجھے مت سکھاؤ، گھر بسانے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے ستارا بی بی اس طرح دوسری بار بھی باپ کے گھر آ کر بیٹھنے سے کیا ہو گا؟" وہ بے عزتی کرتے ہوئے بولیں تھیں، ستارا کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"میرے ماں باپ زندہ ہیں، آپ مجھ سے اس طرح بات کرنے والی کون ہوتی ہیں؟" وہ

چیخ کر بولی تھیں۔

''آواز دھیمی رکھ کر بات کرو۔'' عائشہ آپی نے سختی سے کہا تھا۔

''آپ بھی۔'' وہ دوبدو بولی تھی۔

''اچھی لڑکیاں اس طرح نہیں کرتیں ستارا، اگر خدا نے تم پہ کرم کیا ہے، تمہیں ایک اچھے شوہر سے نوازا ہے تو تم اس طرح ناشکری مت کرو، اگر یوں ہر بات پر تماشا بنا کر لڑکیاں گھر چھوڑ کر آنے لگیں تو بس چکے گھر، اچھی لڑکیاں اس......'' عائشہ کی بات ابھی بیچ میں تھی کہ ستارا نے ان کی بات کاٹ دی۔

''اچھی لڑکیاں...... اچھی لڑکیاں، کیا مطلب ہے آپ کا؟ بند کریں یہ اچھی لڑکیوں کی رٹ، میں نہیں ہوں اچھی لڑکی، سن لیا آپ نے۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''بکواس بند کرو، تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے، تم گھر بسانا ہی نہیں چاہتیں۔'' وہ غضب ناک ہو کر بولیں تھیں۔

''میں بس اس شخص کے گھر نہیں جانا چاہتی۔'' وہ ضدی انداز میں بولی تھی۔

''کیوں؟ ساری زندگی میرے باپ کے سینے پہ بوجھ بنی رہنا ہے تمہیں؟'' انہوں نے طنز کیا۔

''آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ میں اپنے ماں باپ کے گھر ہوں، آپ کے گھر نہیں۔'' اس نے بدتمیزی سے کہا تھا، عائشہ کے جواب دینے سے پہلے ہی اماں آ گئیں اندر۔

''کیا تماشا بنایا ہے تم دونوں نے، آواز باہر تک آ رہی ہے، کیا جھگڑا ہے؟'' وہ غصے سے پوچھنے لگیں۔

''آپ کی بیٹی کے ارادے مستقل یہیں قیام کرنے کے ہیں اماں۔'' عائشہ نے تلخی سے کہا تھا اشارہ اس کی طرف تھا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' انہوں نے ستارا کو گھورا۔

''بکواس ہی سہی، میں کہیں نہیں جاؤں گی، آپ کو بتا چکی ہوں میں۔'' ستارا نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

اماں چند لمحے اسے دیکھتی رہیں، وہ شائد ناقابل یقین دکھائی دیتی تھیں۔

''تو تم اپنے گھر نہیں جاؤ گی؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''وہ میرا گھر نہیں ہے۔'' اس نے تصحیح کی۔

''شادی کے بعد شوہر کا گھر ہی عورت کا اصل گھر ہوتا ہے۔'' انہوں نے بھی اس کی تصحیح کی تھی۔

''میں نہیں مانتی اس کے گھر کو اپنا گھر۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''اور ہم تمہیں اس گھر میں رکھیں گے نہیں۔'' اماں بھی آخر اس کی ماں تھیں، انہوں نے اسی ٹون میں جواب دیا تھا۔

ستارا کا رنگ بدلا تھا، اسے ماں سے ایسے رویے کی امید نہ تھی، اسے لگا تھا وہ اس کا ساتھ دیں گی۔

''تو ٹھیک ہے مت رکھیں آپ، میں چلی جاؤں گی یہاں سے بھی، کسی بھی جگہ چلی جاؤں گی، مگر وہاں نہیں جاؤں گی، میں سمجھوں گی میرا کوئی بھی نہیں، میرے ماں باپ مر چکے ہیں، میں کسی دارالامان میں چلی جاؤں گی اور......'' وہ زور زور سے بولتے ہوئے نفرت سے کہہ رہی تھی جب ماں کے زوردار تھپڑ نے اس کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''شرم کرو، اپنی ضد اور انا کی خاطر ماں باپ کو مارنے چلی ہو، تم اس قدر اپنے وقار سے گر گئی ہو کہ اتنا انتہائی قدم اٹھانے کا اعلان کرتے ہوئے تمہیں ایک بار بھی احساس نہیں ہوا کہ یہ ''دارالامان'' نامی تحفہ تم اپنی ماں کے سامنے پیش کر رہی ہو۔'' وہ طیش سے بول رہی تھیں۔

''عائشہ! معصب کو فون کرو، اسے آج شام آ کر لے جائے، جب دھکے ہی کھانا چاہتی ہے تو اسی در کے کھالے جس کا فیصلہ اس کے باپ نے کیا ہے اس کے لئے۔'' ان کا انداز قطعی اور غیر جذباتی تھا، وہ فیصلہ سنا کر باہر نکل گئیں، جبکہ ستارا اسی طرح ساکت سی کھڑی تھی۔

☆☆☆

''مغل ہاؤس'' میں ایک عام سا دن تھا، سہ پہر کے بعد وہ سب لوگ لاؤنج میں چائے کے لئے جمع تھے، علینہ نے بخت کو مگ پکڑاتے ہوئے سیدھا ہونا چاہا تھا جب نامعلوم کس طرح مگ چھلک گیا اور گرم چائے اس کے ہاتھ کے ساتھ اس کے بازو پر بھی گری تھی۔

علینہ کے منہ سے چیخ نکل گئی، اس کا رنگ بدل گیا تھا، اس نے جلدی جلدی دوپٹے سے بخت کا ہاتھ پونچھنا شروع کر دیا جو کہ اب سرخ ہو چکا تھا، باقی سب بھی دم بخود بیٹھے تھے، یوں جیسے حیرت سے ساکن ہوں، اگر یہی چائے علینہ کی بجائے کسی اور کے ہاتھوں گری ہوتی تو اب تک بخت اسے دو تین تھپڑ تو مار ہی چکا ہوتا، مگر وہ کسی نہیں تھی ''علینہ'' تھی۔

''کوئی بات نہیں علینہ، میں شرٹ چینج کر لیتا ہوں۔'' اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ روکا اور اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ گیا، وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

کمرے میں آ کر اس نے سب سے پہلے بخت کو شرٹ تبدیل کرنے کو دی اور جب وہ بدل کر آیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بام لگانے لگ گئی، وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''سوری زیادہ درد ہو رہا ہے؟'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے پوچھ رہی تھی، اس نے مسکرا کر اس کا گال تھپکا اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں تو، معمولی بات ہے۔'' وہ لاپرواہی سے کہہ رہا تھا، وہ سر ہلا کر ہاتھ روک کر اٹھ گئی اور ہاتھ دھونے چلی گئی۔

شاہ بخت کسی کام سے باہر جا رہا تھا، وہ رات کے کھانے کی تیاری کروانے کے لئے کچن میں آ گئی، جب شاہ بخت واپس آیا لاؤنج میں رمشہ چینل چینج کرنے میں معروف تھی، چند لمحوں بعد اس نے اپنی ایکٹویٹی موقوف کی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی، جو کہ سیل فون پہ غالباً میسجنگ میں بزی تھا۔

''ویسے ہٹ دھرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' اس نے طنز کیا تھا۔

شاہ بخت نے سیل فون سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر کسی اور کو نہ پا کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس سے ہی بات کر رہی تھی۔

''نالائق سٹوڈنٹس کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنا بند کرو، میں تم سے ہی بات کر رہی ہوں۔'' رمشہ نے چڑھائی کرتے ہوئے کہا، شاہ بخت کو نا چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

''میں کبھی بھی نالائق سٹوڈنٹ نہیں رہا رمشہ، تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔'' اس نے جوابی طنز کیا تھا۔

''نہ......نہ مجھے کچھ نہیں پتہ، مجھے تو جو پتا تھا وہ بھی بھول چکا ہے۔''

''اچھا......آ......آ......آ'' بخت نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں آ آ آ۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

"بڑا با کمال بندہ ہے حسیب نعمان۔"

"وہ کیسے؟" وہ چونکی۔

"جس نے رمشہ احمد کو سب کچھ بھول جانے پر مجبور کر دیا ہے، وہ کوئی عام انسان تو نہیں ہو گا نا۔" اس نے لطیف سی چوٹ کی، رمشہ ہنس پڑی۔

"مذاق اڑا رہے ہو؟"

"نہیں خوش ہو رہا ہوں۔" اس نے تصیح کی تھی۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے پھر طنزاً کہا۔

"وہ تم علینہ سے پوچھ لو۔" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

رمشہ نے زیر لب "علینہ" دہرایا تھا، پھر پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔

"ہاں اب تمہارے سے متعلقہ ہر بات علینہ سے ہی پوچھنا پڑے گی۔" وہ کہہ رہی تھی اور بخت صوفے کی پشت سے کمر ٹکاتا ہوا دونوں بازو پھیلا کر ہنسا اور گنگنانے لگا۔

"ٹھیک کہا تم نے، میں لاپتا......" اس کے چہرے پہ سکون اور خوشی پھیلی تھی۔

اس سے زیادہ برداشت کرنا رمشہ کے بس کی بات نہ تھی، وہ اتنی اعلیٰ ظرف نہیں تھی کہ اسے کسی دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے دیکھتی رہتی اور برداشت کرتی۔

"مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہمارا پہلا جھگڑا علینہ کی بات پر ہی ہوا تھا، تمہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ میں اسے اپنے اور تمہارے جھگڑے میں اس کو کیوں لائی ہوں، تمہیں لگتا تھا کہ میں اور میری سوچیں غلط ہیں، تمہیں لگتا تھا میں غلط سوچتی ہوں اور ہمیشہ غلط ہی بولتی ہوں، کیونکہ صحیح تو صرف شاہ بخت ہی ہو سکتا ہے۔" وہ تلخی سے اسے یاد دلاتے ہوئے جتا رہی تھی۔

"اوہ کم آن رمشہ! چھوڑو نہ پرانی باتیں۔" وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔

"اتنی آسانی سے؟" رمشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیوں کیا اتنا مشکل ہے؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا تھا۔

"اتنا آسان بھی نہیں ہے۔" وہ افسردگی سے بولی تھی۔

"یہ تو پھر اپنے اپنے ظرف کی بات ہے نا۔" شاہ بخت نے جیسے گیند اس کی کورٹ میں پھینک دی تھی۔

"ہاں یہ اچھی کہی تم نے، سب کچھ کر کے بات مرضی اور ظرف پر ڈال دو۔" وہ تلخ ہو گئی۔

"ہاں...... دیکھو نا، میں علینہ کے ساتھ بہت خوش ہوں اور یقیناً تم حسیب کے ساتھ، تو پھر آپس میں جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے، لیٹس بی فرینڈز اگین۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا، اس کے اطمینان پر رمشہ کو آگ لگ گئی تھی۔

"اچھا، کاش یہ اعلیٰ ظرفی تم نے میری منگنی پہ دکھائی ہوتی، جب انسان کا اپنا سب کچھ ٹھیک ہوتا اس کی اپنی ساری سائیڈز سیکور ہوتاں، تب وہ دوسروں کو تسلیاں بہت اعلیٰ قسم کی دے لیتا ہے، ہونہہ، مجھے سب بھول جانے کا درس یقیناً اس لئے دے رہے ہو نا کہ خود بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر بیٹھے ہو، ورنہ یہ تو یقیناً یاد ہوتا تمہیں کہ علینہ کا سابقہ رویہ کیسا تھا تمہارے ساتھ؟ ہونہہ بات کرتے ہو اعلیٰ ظرفی کی۔" اس نے تڑپ کر کہا تھا۔

کچن سے فرائز کی پلیٹ لاتے ہوئے علینہ نے بھی رمشہ کی یہ ساری بکواس بڑے اطمینان سے سنی تھی اور آگے بڑھ کر بخت کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"رمشہ آپی! اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے، شادی سے پہلے انسان کی کمنٹس کچھ اور ڈیمانڈ کرتی ہیں، شادی کے بعد کچھ اور، اب میرا اور شاہ بخت کا کیا کلیش تھا، وہ ہم دونوں کو پتا ہے، آپ کو نہیں، اس لئے آپ اس کے ساتھ غصہ مت ہوں، صلح کر لیں۔" وہ فرائز منہ میں ڈالتے ہوئے اتنے پرسکون اور ہموار لہجے میں بولی تھی کہ رمشہ کو یقین ہی نہ آیا تھا۔

وہ اتنی کمپوزڈ تھی کہ رمشہ کو اپنا آپ اس کے سامنے چغد محسوس ہو رہا تھا۔

"آہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی کہ اس سارے تماشے کی وجہ تم ہی ہو، میرے ساتھ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے، باقی رہی صلح، ہونہہ وہ گئی بھاڑ میں۔" وہ غصہ نکالتی، پیر پٹختی وہاں سے اٹھ گئی۔

"افسوس، کاش یونیورسٹی میں آپ نے کچھ مینرز بھی سیکھے ہوتے۔" اس نے تاسف سے کہہ کر گویا جلتی پہ تیل ڈالا تھا۔

"مجھے تم سے زیادہ تمیز ہے، علینہ صاحبہ، ذرا اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ لو، شاہ بخت کو تو اللہ جانے کس چیز نے تمہارے پیچھے پاگل کیا ہوا تھا، تمہیں تو اس سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں۔"

رمشہ کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"بی ہیو یور سلیف رمشہ! وہ مجھ سے جس طرح مرضی بات کرے، تمہیں کیا پرابلم ہے تمہیں گارجین بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" شاہ بخت نے طیش میں آ کر کہا۔

"مجھے تو کوئی پرابلم نہیں ہے پرابلم تو پورے "مغل ہاؤس" کو ہے۔" اس نے تپ کر کہا تھا۔

"جن کو ہے وہ سیدھے مجھ سے آ کر بات کریں، تمہیں بیچ میں آنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے گویا وارننگ دی تھی۔

"چھوڑو نا، شاہ بخت۔" علینہ نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف یوں متوجہ کیا، جیسے اس سارے معاملے کو انتہائی غیر ضروری سمجھتی ہو، رمشہ تو اس کے انداز پہ جل کر خاک ہو گئی، پیر پٹختی وہ وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

عزت نفس!

خودداری!!!

انا!!!

آن!!!

باضمیر ہونے کا خوبصورت احساس!

غیرت مند ہونے کا فخر!

ذاتی تکریم کا مان!

اور

سب سے بڑھ کر

ماں باپ کے گھر میں ہونے کا غرور!!

سب کچھ پل بھر میں راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا، فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔

عائشہ آپا نے فون کر دیا تھا، مگر رات کو اسے لینے نوفل نہیں آیا تھا، بلکہ اس کی جگہ صدیق احمد خود آئے تھے، انہوں نے ابا سے ملتے ہوئے بڑے باوقار طریقے سے معذرت کی تھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے بھائی صاحب، ہماری بیٹی پہلی بار آئی تھی، اصولی طور پر اسے لینے مصعب کو خود آنا چاہیے تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ آج صبح انتہائی ایمرجنسی میں اسلام آباد گیا ہے، بیٹی عائشہ کا فون گیا اسے تو اس نے مجھے کال کر کے خاص طور پر کہا ہے کہ پاپا آپ نے خود اسے لینے جانا ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ یہ محسوس کرے کہ اس کی اہمیت میں کوئی کمی ہو گئی ہے اور

اس کے ماما پاپا سے میری طرف سے خاص طور پر معذرت کیجئے گا اور کہیے گا کہ میں خود حاضر ہوں گا ان کے ہاں۔" وہ انتہائی اپنائیت سے کہہ رہے تھے۔

اماں ابا تو خوشی سے نہال ہو گئے تھے، کیسے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے اور ستارا کتنی پاگل تھی جو ناشکری کیے جا رہی تھی، انہوں نے مطمئن ہو کر کھانا لگوانے کا اشارہ کیا اور خود بھی اندر کی طرف چل پڑیں۔

اور یوں وہ اپنے سسر کے ساتھ گھر آ گئی، راستے میں وہ اس سے باتیں کرتے رہے جیسے اسے تنہائی کا احساس نہ دلانا چاہتے ہوں، اسے سے پوچھتے رہے کہ اس کا قیام کیسا رہا؟ وہ مختصر جوابات دیتی رہی، گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئی تھی، کچھ بھی نہیں بدلا تھا، نوفل صدیق احمد کا کلاسیکی ذوق، کمرے کی سجاوٹ سے عیاں تھا، بادشاہی طرز کا فرنیچر، دبیز اور اعلیٰ ڈیزائن کے ایرانی قالین، بھاری پردے اور منقش سنگھار میز......! اس کی شادی کی انلارجڈ فوٹو!

جس کے آگے وہ تادیر کھڑی رہی، پھر جلتی آنکھوں سمیت باتھ روم کی سمت لباس تبدیل کرنے کی غرض سے بڑھ گئی، نائٹ سوٹ پہن کر اس نے کمرے کی روشنیاں ہلکی کر دیں اور خود بیڈ پر آ گئی، ذہنی تھکن نے اسے بے حال کیا ہوا تھا، کچھ لمحوں بعد ہی وہ گہری نیند میں چلی گئی، پتہ نہیں رات کا کون سا پہر تھا، جب اس نے خود کو ایک حصار میں مقید پایا تھا۔

"میری جان! میری زندگی! میری روح!"

وہ اس کے قریب تھا، وہ بے یقین، یہ شخص تو شہر سے باہر تھا پھر اب ایک دم سے کہاں سے آ گیا تھا؟ اس نے مذاحمت کرنے کی کوشش کی تھی، وہ شاید حیران ہوا تھا۔

"میں بہت مشکل سے آ سکا ہوں۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔

"یہ غلط ہے، چھوڑو مجھے۔" وہ اس کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

"میں حق رکھتا ہوں، تم مجھے اس طرح انکار نہیں کر سکتی، میں بہت دنوں سے تم سے دور تھا جب پتہ لگا کہ تم اس گھر میں ہو، رہا ہی نہیں گیا، کیوں دور بھاگتی ہو مجھ سے تارا، تم جان ہو میری،...... جان۔" اس نے ستارا کو سینے سے لگا لیا، اس شخص کی پیش قدمی میں اتنی بے ساختگی تھی کہ وہ کسی طور مذاحمت نہ کر سکی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پہ ستارا کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، پاپا نوفل کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"تم کب آئے؟"

"لیٹ نائٹ آیا تھا پاپا، تھکا ہوا تھا، آتے ہی سو گیا، آپ کو کیا تنگ کرتا رات کے وقت، جبھی بس سوچا صبح مل لوں گا۔" اس نے چائے کے سپ لیتے ہوئے اطمینان سے بتایا تھا۔

اس کے "آتے ہی سو گیا" پر ستارا نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی، مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ ڈرامے کی روایتی ہیروئن نہیں تھی جو گھر چھوڑ کر کسی بچ بچ کے دارالامان میں چلی جاتی اور کوئی اسے پوچھنے والا بھی نہ ہوتا یا پھر ایک دم سے ہی وہ اتنی بہادر ہو جاتی کہ تنہا کسی فلیٹ میں رہنا شروع کر دیتی اور ساتھ ہی اسے جاب بھی مل جاتی اور وہ ہر وقت روتی بسورتی سوچتی کہ زندگی وہ تنہا گزارے گی اور بیک گراؤنڈ میں کوئی سیڈ سونگ چل رہا ہوتا۔

ہاں وہ واقعی کسی افسانے اور ڈرامے کی

ہیروئن نہ تھی، یہ حقیقی زندگی تھی اور بچ کی ... اور اس سے چھٹکارا اتنی آسانی سے کہاں ممکن تھا اور بہت بہادر بن کر اگر وہ غلطی سے ایسا کوئی قدم اٹھا بھی لیتی تو اماں ابا کا تو اسے پتہ نہیں تھا مگر وہ اک شخص کہ جس کا نام نوفل صدیق تھا وہ کسی صورت چھوڑنے پہ نہ آتا، وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لاتا وہ اچھی طرح آگاہ تھی اس کے رسوخ سے، اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ شخص کیا کیا کر سکتا تھا اور اس کے ہاتھ کتنے لمبے تھے؟ اور وہ تھی کیا؟ آخر کار ایک عام سی لڑکی ہی تو تھی۔

جبھی وہ عزت سے اپنی اس جگہ پہ آ گئی جو کہ اس شخص نے اس کے لئے منتخب کی ہوئی تھی۔

"آفس جاؤ گے تم؟" پاپا نے پوچھا۔

"نہیں بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں، آرام کروں گا، دوپہر میں کسی وقت آ جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے اور ہاسپٹل نہیں جانا؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"وہاں کون ہے؟" ستارا کو فوری طور پر طلال کا حادثہ یاد نہ آ سکا، اس کے سوال پر نوفل کا چہرہ سرخ ہوا تھا، اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر پٹخا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہاں وہ شخص ہے جسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، جبھی میں نے اسے گولی مار دی۔" اس نے سرد مہری سے کہا تھا، ستارا کا رنگ سفید پڑ گیا، اسے یقین نہیں آیا۔

"گولی مار دی؟" اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

"ہاں۔" اس نے کہا اور چیئر دھکیل کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہاں سے نکل گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے تھے پاپا؟ کیا یہ سچ ہے۔" اس نے بدحواسی سے صدیق کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان کے چہرے پہ دکھ اور رنج پھیلا ہوا تھا، انہوں نے بے چارگی سے سر ہلایا اور اٹھ کر چلے گئے، جیسے اس کے مزید سوالات سے بچنا چاہتے ہوں، اس نے بھی کچھ کہنے کی بجائے کرسی پیچھے کی اور اٹھ کر اندر کی طرف چلی گئی، نوفل لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیڈ پہ نیم دراز تھا، وہ سیدھی اس تک آئی۔

"یہ تم نے کہا ہے جو ابھی، وہ کیا ہے نوفل؟" اس نے پھر سے سوال اٹھایا، نوفل نے نظریں سامنے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

"ہاں، صحیح کہا ہے میں نے۔" اس کے اطمینان نے ستارا کو مزید بدحواس کیا تھا۔

"تم نے اپنے بھائی کو شوٹ کر دیا؟" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے پھر پوچھا۔

"اس شخص نے میرا گھر تباہ کر دیا، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ بچ گیا۔" اسے افسوس تھا۔

"ایسا کیا کر دیا ہے اس نے؟" وہ الجھ پڑی۔

"اس کی بکواس کی وجہ سے ہمارا جھگڑا ہوا تھا، تم شاید بھول رہی ہو۔" اس نے یاد دلایا۔

"یہ فضول بات ہے، سچ کبھی نہ کبھی تو مجھے پتا چل ہی جانا تھا۔" اس نے سرد مہری سے کہا اور باہر نکل گئی، نوفل نے پر سوچ نظروں سے اسے کی پشت کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تھی اور بہت دیر چھت پہ ٹکی رہی، پھر اس نے اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں وہ سو رہی تھی، اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر اپنے گال کے نیچے رکھے وہ اس سے مکمل طور پر بے خبر اور گہری نیند میں تھی، وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا، وہ اس کے سونے کی سب

ہیروئن نہ تھی، یہ حقیقی زندگی تھی اور بڑی تلخ تھی اور اس سے چھٹکارا اتنی آسانی سے کہاں ممکن تھا اور بہت بہادر بن کر اگر وہ غلطی سے ایسا کوئی قدم اٹھا بھی لیتی تو اماں ابا کا تو اسے پتہ نہیں تھا مگر وہ اک شخص کہ جس کا نام نوفل صدیق تھا وہ کسی صورت چھوڑنے پہ نہ آتا، وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لاتا وہ اچھی طرح آگاہ تھی اس کے رسوخ سے، اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ شخص کیا کیا کر سکتا تھا اور اس کے ہاتھ کتنے لمبے تھے؟ اور وہ تھی کیا؟ آخر کار ایک عام سی لڑکی ہی تو تھی۔

جبھی وہ عزت سے اپنی اس جگہ پہ آ گئی جو کہ اس شخص نے اس کے لئے منتخب کی ہوئی تھی۔

''آفس جاؤ گے تم؟'' پاپا نے پوچھا۔

''نہیں بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں، آرام کروں گا، دوپہر میں کسی وقت آ جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے اور ہاسپٹل نہیں جانا؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

''وہاں کون ہے؟'' ستارا کو فوری طور پر طلال کا حادثہ یاد نہ آ سکا، اس کے سوال پر نوفل کا چہرہ سرخ ہوا تھا، اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر پٹخا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہاں وہ شخص ہے جسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، جبھی میں نے اسے گولی مار دی۔'' اس نے سرد مہری سے کہا تھا، ستارا کا رنگ سفید پڑ گیا، اسے یقین نہیں آیا۔

''گولی مار دی؟'' اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور چیئر دھکیل کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہاں سے نکل گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے تھے پاپا؟ کیا یہ سچ ہے۔'' اس نے بدحواسی سے صدیق کو دیکھتے ہوئے پوچھا جن کے چہرے پر دکھ اور رنج پھیلا ہوا تھا، انہوں نے بے چارگی سے سر ہلایا اور اٹھ کر چلے گئے، جیسے اس کے مزید سوالات سے بچنا چاہتے ہوں، اس نے بھی کچھ کہنے کی بجائے کرسی پیچھے کی اور اٹھ کر اندر کی طرف چلی گئی، نوفل لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیڈ پہ نیم دراز تھا، وہ سیدھی اس تک آئی۔

''یہ تم نے کہا ہے جو ابھی ابھی، وہ کیا ہے نوفل؟'' اس نے پھر سے سوال اٹھایا، نوفل نے نظریں سامنے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ہاں، صحیح کہا ہے میں نے۔'' اس کے اطمینان نے ستارا کو مزید بدحواس کیا تھا۔

''تم نے اپنے بھائی کو شوٹ کر دیا؟'' اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے پھر پوچھا۔

''اس شخص نے میرا گھر تباہ کر دیا، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ بچ گیا۔'' اسے افسوس تھا۔

''ایسا کیا کر دیا ہے اس نے؟'' وہ الجھ پڑی۔

''اس کی بکواس کی وجہ سے ہمارا جھگڑا ہوا تھا، تم شاید بھول رہی ہو۔'' اس نے یاد دلایا۔

''یہ فضول بات ہے، سچ کبھی نہ کبھی تو مجھے پتا چل ہی جانا تھا۔'' اس نے سرد مہری سے کہا اور باہر نکل گئی، نوفل نے پر سوچ نظروں سے اسے کی پشت کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تھی اور بہت دیر چھت پہ ٹکی رہی، پھر اس نے اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں وہ سو رہی تھی، اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر اپنے گال کے نیچے رکھے وہ اس سے مکمل طور پر بے خبر اور گہری نیند میں تھی، وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا، وہ اس کے سونے کی سب

اداؤں سے واقف تھا، بہت عرصہ پہلے کبھی بچپن میں اور اوائل لڑکپن میں وہ ایسے ہی بے فکری سے سوتی تھی، پھر وہ بڑی ہو گئی، اسید نے اسے بدلتے دیکھا، پھر وہ رات گئے جاگتی تھی اور پتہ نہیں کب سوتی تھی؟ پھر ان کی شادی ہو گئی۔

پھر وہ اس کے پاس آ گئی، تب وہ بہت برا سوتی تھی، بلکہ سوتی کب تھی بس روتی رہتی تھی، رات گئے تک اس کی سسکیاں اور آنسو اسے جگائے رکھتے تھے، بہت دفعہ وہ نیند میں بھی اذیت سے روتی تھی اور ''ماما'' کو پکارتی تھی، پھر وہ تیمور کے ساتھ واپس چلی گئی اور اب ایک بار پھر اس کے ساتھ تھی، اس کے پاس تھی ہاں وہ اس کی ساری اداؤں سے واقف تھا، وہ حبا کی نبض کو جانتا تھا، اسے پتا تھا اب وہ بہت پرسکون ہو کر سوئی ہوئی تھی، اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا اس کے اعصاب مکمل طور پر پرسکون اور ریلیکسڈ تھے، اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا، جہاں کچھ فاصلے پر شفق سوئی تھی، اس کی بیٹی، اس نے بازو آگے کر کے اسے اپنے قریب کر لیا اور پھر دونوں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ اس کی تھیں، اس کی ذمہ داری تھیں، خدا کے بعد اس زمین پر وہ ان کا سہارا تھا، ان کا وارث اور جھتنار تھا، وہ اس کی ملکیت تھیں، بلکہ اس کی متاع تھیں۔

اس نے اپنے خزانے اپنی متاع حیات کو سینے سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں، وہ اس وقت ایسا سکون محسوس کر رہا تھا کہ اگر کوئی اس سے اس کی ساری دولت بھی مانگ لیتا تو وہ کبھی انکار نہ کرتا، اس سکون کے بدلے تو وہ ہر چیز دینے کو تیار تھا۔

زندگی میں ہر شخص اپنے تجربے سے خود سبق سیکھتا ہے اگر لوگ دوسروں کا حال دیکھ کر سبق سیکھ لیں تو مثالیں کہاں سے بنیں گی، اس نے بھی اپنی غلطیاں خود سدھاری تھیں اور سبق بھی سیکھا تھا، مگر اک سبق اور بھی وقت نے اس کی جھولی میں ڈالا تھا۔

''جس سے ایک بار محبت ہو جائے نا، وہ جتنا بھی درد دے، کتنا بھی رسوا کرے، خواہ آپ کے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے، اس دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس محبت کو نفرت میں بدل سکے۔''

☆☆☆

اس نے ہلکے سے دروازے پہ دستک دی اور اندر چلا آیا۔

''جی امی! آپ نے بلایا تھا۔'' وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔

نیلم اور طارق نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا، طارق نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا لیا۔

''دیکھو بیٹا! میں جو بات تم سے کہنے جا رہا ہوں، اس پر غصہ کیے بغیر کھلے دل سے غور کرنا، ہو سکتا ہے تم میری بات سے اتفاق نہ کرو، مگر پھر بھی تمہیں کوئی قدم ضرور اٹھانا پڑے گا۔'' انہوں نے تمہید باندھی۔

''ایسی کون سی بات ہے؟'' اس نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

''مجھے تم سے علینہ کے معاملے پہ بات کرنی ہے۔''

''علینہ؟ کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوا۔

''اسے لے کر گھر میں جو مسائل ہو رہے ہیں وہ کوئی اتنے خوشگوار نہیں ہیں، اس کا تمہارے ساتھ رویہ مجھے شروع سے پسند نہیں ہے، حقیقت پسندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بہر حال اسے اپنے اور تمہارے رشتے کا دھیان رکھنا چاہیے، تم اس

کے ہم عمر نہیں ہو، تم اس سے چھ سال بڑے ہو، اسے تمہارا احترام کرنا چاہیے، سب کے سامنے یہ ''بخت، بخت'' کرنا مجھے بالکل پسند نہیں ہے، کم از کم اسے تمہیں آپ تو کہنا چاہیے اور دوسری بات شادی ہو جانے کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ انسان باقی دنیا کو بھول کر صرف ایک ہی شخص کا ہو کر رہ جائے، باقی لوگ بھی اس گھر میں موجود ہیں، آپ دونوں پر ان کا بھی حق ہے اور آخری بات علینہ اس گھر میں سب سے چھوٹی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ سب کی عزت کرے، مجھے پتا چلا ہے کہ تم دونوں نے رمشہ سے الجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ تمہاری اور رمشہ کی تو تلخ کلامی بھی ہوئی ہے، مجھے یہ سب پسند نہیں آیا، میں اس حق میں قطعاً نہیں ہوں، تم دونوں مشترکہ خاندانی نظام میں رہ رہے ہو، کہیں تنہا نہیں ہو جو یوں ساری احتیاط انسان فراموش کر دے، اب تم شادی شدہ ہو، ذمہ دار اور سمجھ دار بھی ہو، اس لئے تمہیں اس صورتحال کو بدلنا ہوگا۔'' انہوں نے نرمی سے اپنی بات مکمل کی تھی البتہ لہجہ بہت دوٹوک تھا۔

شاہ بخت نے بہت تحمل سے ان کی بات سنی تھی پھر وہ ہلکے سے سیدھا ہوا اور انہیں دیکھا۔

''میں نے آپ کی ساری باتیں بہت دھیان سے سنی ہیں، اب آپ میری سنیں، پہلی بات تو یہ کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مجھے کیسے بلاتی ہے، میرے نزدیک اہم یہ ہے کہ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے، مگر پھر بھی میں آپ کی بات ویلیو کرتا ہوں، میں اسے سمجھاؤں گا، دوسری بات رمشہ نے خود میرے ساتھ بحث شروع کی تھی، مجھے اس سے الجھنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور رہی بات علینہ کی انوالومنٹ کی تو یہ قطعی طور پر غلط ہے میں یہ اس لئے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری بیوی ہے بلکہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ سب بھی اسے جانتے ہیں، وہ کس سے بحث و مباحثے میں بالکل نہیں پڑتی اور آخری بات مجھے بہت اچھی طرح سے اپنی خاندانی روایات کا پاس ہے، میں صبح ناشتے کے وقت سے پہلے تیار ہو کر کمرے سے باہر آتا ہوں اور رات جب سب سونے کے لئے جاتے ہیں تو تب ہی میں بھی جاتا ہوں، میں نے احتیاط کا دامن بالکل فراموش نہیں کیا، مجھے بھی پتا ہے کہ ہم تنہا نہیں رہتے بلکہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں، میں نے تو کبھی سب کے سامنے اس کا ہاتھ تک نہیں پکڑا، میرے خیال سے اتنا کافی ہے۔'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ اٹھا اور باہر نکل آیا۔

لاؤنج میں خاموشی تھی، سب لوگ سونے کے لئے اپنے کمروں میں جا چکے تھے وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا گیا، کوری ڈور میں اسٹینڈ پہ رکھے پی ٹی سی ایل سے علینہ کسی سے بات کر رہی تھی۔

''ہاں جیسا تم نے کہا، سب ویسا ہی ہو رہا ہے، تم کمال ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی، شاہ بخت نے بے دھیانی اس کی بات کو سنا۔

''علینہ! رات بہت ہو گئی ہے سونے کا ارادہ نہیں، کس کا فون ہے، بعد میں بات کر لینا۔'' وہ دور سے ہی بولا تھا، اسے دیکھ کر علینہ نے جلدی جلدی فون بند کیا اور آگے بڑھ آئی۔

(باقی آئندہ)

ثمر جب صبح نہا کر کنگھی کرتی تو عالی کی محبت بھری انگلیاں اس کو روک لیتیں، ثمر اب روز بروز یہ احساس گہرا ہونے لگا کہ اس کے اندر کی ساری محبتیں اور باہر کے سارے موسم عالی کے سبب سے، عالی کے لئے ہیں، ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ پیچھے سے عالی نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا، اور اوں اوں اس کے بولنے سے پہلے اس کے ہونٹوں پہ چھوٹی سی شرارت کر ڈالی، کسمسا کر اس نے خود کو چھڑانا چاہا، عالی کی گرفت مزید ٹائٹ ہوگئی، ابھی ثمر کی شادی کو کچھ ہی دن ہوئے تھے، سونے جاگنے اور جاگ کر سونے کے دن چل رہے تھے، آنکھوں میں مستی اور نیند اتری رہتی، مگر ساس کا خشک رویہ اور طنزیہ نظریں اسے صبح جلدی روم سے نکل کر کچن میں جانے پر مجبور کر دیتیں۔

نئی شادی کے اولین دنوں کی لازوال اور شدید محبت تھی، پھر تو لاتعداد مسائل شروع ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھنے کی فرصت بھی نہیں بچتی، عالی نے ثمر کو بیڈ پہ گرا لیا، اس کی نیت میں فتور آ چکا تھا اور ابھی ثمر کو اپنی آغوش میں بھرنے ہی والا تھا کہ تڑپ کے نکل گئی اور اپنا دوپٹہ اس کے ہاتھ سے چھڑاتی نیچے سیڑھیاں اتر گئی۔

اسے معلوم تھا کہ صبح ناشتہ بنانے میں دیر ہو گی تو وہ امی جان کا موڈ کچھ آف سا ہو جاتا ہے اور پھر وہ بہانے بہانے سے اپنے وقت کی باتیں سنانا شروع کر دیتیں کہ ”اب تو آسانیاں ہی بہت ہو گئیں ہیں، چند سیکنڈوں میں بلینڈر نے لسی تیار کر دی، مائیکرو سے رات کا سالن ایک منٹ میں گرم کر لیا، بس رہ گئے پراٹھے تو بیلن نے اسے بھی شارٹ کٹ کر دیا، دس منٹ میں ناشتہ تیار ہو جاتا ہے، پھر بھی مصیبت لگتی ہے آج کل کی لڑکیوں کو اور ہم اتنی بڑی فیملی کے لئے جن میں (چار دیور اور تین نندیں شامل تھیں) کے لئے چاٹی میں لسی بلویا کرتے دس بارہ پراٹھے بناتے اور کتنے گھنٹے صرف ہو جاتے، سارے ٹبر کو بھاگ بھاگ کر ناشتہ دیتے، پھر جا کر دو نوالے منہ میں ڈالنے نصیب ہوتے۔

کیونکہ ہماری ساس کا خیال تھا کہ بہو بیٹیوں کو سب سے بعد میں ناشتہ کرنا چاہیے“ اور ثمر خاموشی سے کام میں مگن رہتی، کئی باتوں کے جواب اس کے پاس موجود ہوتے مگر پلٹ کر دیکھتی بھی نہ تھی، مبادا بے ادبی کی صنف میں نہ آ جائے، ثمر کی تربیت بڑے سلیقے سے ہوئی تھی بڑوں کا احترام تو لازم تھا، رات جب وہ کچن کا کام ختم کر کے آئی تو عالی کو شرارتیں سوجھ رہی تھیں، وہ پیار کے موڈ میں ہوتے، اس موقع پر ایک نظم ثمر کے دماغ میں در آئی۔

کائنات کے خالق
دیکھ تو میرا چہرہ
آج میرے ہونٹوں پہ
آج میری آنکھوں میں
کیسی جگمگاہٹ ہے
میری مسکراہٹ میں
تجھ کو یاد کیا آیا
میری بھیگی آنکھوں میں
تجھ کو کچھ نظر آیا
اس حسین لمحے کو
تو تو جانتا ہو گا
اس سمے کی عظمت کو
تو تو مانتا ہو گا

ثمر کا جی بھی کبھی کبھی اوب جاتا اس کی شدتوں سے۔

”عالی بس کریں مجھے نیند آ رہی ہے، فجر کی

جاگی ہوتی ہوں۔“

”یار میں رات کا انتظار کرتا ہوں، کب تم فارغ ہو گی اور ہم مل کے کوئی رومینٹک سی مووی دیکھیں گے، اور تم ہو کہ بس نیند کی دیوانی ہوئی رہتی ہو۔“

”کیا کروں پھر؟“ وہ جھنجھلائی۔

”صبح پھر اٹھنا ہوتا ہے۔“

”جانم تو تم دوپہر کو تھوڑا آرام کر لیا کرو۔“ عالی نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کے سہلایا اور اس نے افسردگی سے اپنا سر اس کے شانے پہ ٹکا دیا۔

کیا بتاتی اپنے پیارے شوہر کو جو اس سے تب سے محبت کرتا تھا جب دو سال پہلے وہ ایک دوسرے سے منسوب ہوا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ابھی وہ آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں جانے کا سوچ رہی ہوتی کہ سسر فیکٹری سے آ جاتے تو پھر انہیں بھی کھانا چاہئے دے کر وہ اپنے کمرے میں آتی تو ڈھیروں کام منتظر ہوتے اور ہر شام پھر اگلی رات میں تحلیل ہو جاتی، فرصتیں سمٹتی چلی گئیں، مصروفیات نے ہوش گم کر دیے، شادی کے چار ماہ بعد پریگنینسی نے طبیعت مضمحل کر دیا، خالی پیٹ بھی صبح اس کا دل خراب ہوتا اور وہ الٹیاں کرتی، بے قرار پھرا کرتی۔

اور پھر گزرتے وقت نے اس کی گود میں جڑواں بچیاں ڈال دیں اور اسے اپنا سونا جاگنا بھی بھول گیا، سارہ عمارہ نے اور گھر کی ذمہ داریوں نے اسے بے حال کر دیا، جب وہ چار سال کی ہو گئیں تھیں تو ایک خوشگوار سی صبح وہ ان دونوں کو اسکول داخل کروا کے گھر آئی تو طبیعت ایک دم سے خراب ہو گئی، لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو نئی خوش خبری منتظر تھی، وہ عالی سے لڑ پڑی۔

”ابھی تو سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا تو......“ اور وہ ہنس پڑے۔

”میں ہوں نا تمہارے ساتھ کیوں گھبراتی ہو۔“

موسموں نے تبدیلی کا پتہ دیا، زین نے جنم لیا تو ثمر کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔

بیٹے پیدا ہوتے ہی مائیں ان کو دولہے کے روپ میں دیکھنے لگ جاتی ہیں اور خود کو بھول جاتی ہیں، بس یاد رہتی ہے تو بس ممتا کی شدت، خزاں کے بعد بہار اور سردیوں کے بعد گرمی ریس جاری رہتی، زین کی پیاری باتیں سب ٹینشن بھلائے رکھتیں، زین میٹرک کا سٹوڈنٹ تھا، سسر کو پہلا ہارٹ اٹیک ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

یونہی ایک کے بعد ایک دن گزرتا رہا۔

جونہی بی اے کا رزلٹ آیا، عالی کی کزن ثوبیہ آپی، سارہ عمارہ کو بڑی چاہت سے اپنی بہویں بنا کر اپنے بزنس مین بیٹوں کے لئے لے گئی، تو دونوں کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر ثمر اور عالی کا ڈھیروں خون بڑھ جاتا، عالی کا خیال تھا کہ تعلیم مکمل کر کے زین ان کے ساتھ ہی بزنس میں ہاتھ بٹائے گا۔

''لہٰذا اب گھر میں بہو لے آؤ، امی جان کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی، شوگر لو ہو جاتی تو نیم بے ہوشی سی طاری ہو جاتی۔'' وہ بھی پوتے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزومند تھی۔

سسر کے جانے کے بعد ان کی صحت کے ساتھ مزاج میں بھی چڑچڑا پن آ گیا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ غصہ آ جاتا۔

ایک رات جو سوئیں تو صبح دیکھنی نصیب نہ ہوئی اور وہ ابدی سفر پہ روانہ ہو گئیں، زین کی تعلیم مکمل ہوئی تو وہ اپنے پاپا کے ساتھ سیٹ ہو گیا،

ثمر کی دوست کی بیٹی سندس بہت پیاری تھی، وہ دونوں کو پسند آ گئی اور وہ فارمیلٹی پوری کر کے بہو بنا کر گھر لے آئے، دونوں ان کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے، ان دونوں کی آپس میں انڈر سٹینڈنگ بھی بہت تھی، جس سے ثمر بہت خوش تھی، صبح وہ بیڈ سے اٹھنے لگی تو عالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ثمر! ساری زندگی کام کیا ہے، یار اب آرام سے سویا کرو صبح بہو اٹھے گی تو ناشتہ بنا لے گی۔''

''ارے جناب! کچھ نہیں ہوتا، اگر بچے کسی ٹینشن کے بغیر صبح اٹھیں گے تو مجھے سکون ملے گا، کیونکہ......'' اور وہ اپنی شادی کے رو پہلے دنوں میں کھو گئی۔

جب صبح جلدی اٹھنے کی فکر ہوا کرتی، ساس کارڈ بھی لاحق ہوتا، بس وہ دن پھر لوٹ کر نہ آئے اور میں نے خود سے عہد کیا تھا، کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ناشتے تیار کر کے ٹیبل پہ بیٹھے وہ بچوں کا انتظار کر رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' سامنے کمرے سے دونوں ہنستے مسکراتے نکلے اور اپنے بڑوں کو سلام کر کے ابھی کرسیوں پہ بیٹھنے ہی والے تھے کہ سندس کا سیل فون چیخ اٹھا، وہ ایکسیوز کرتی ہوئی باہر لان کی طرف نکل گئی، کافی انتظار کے بعد ناشتہ کر لیا گیا، عالی کہنے لگے۔

''بیگم تیز پتی چائے لا دو، سر میں ہلکا سا درد محسوس ہو رہا ہے۔'' وہ کچن میں گئی تو کچن کی ایک کھڑکی لان کی طرف بھی کھلتی تھی، بہو اپنی کسی دوست سے کہہ رہی تھی۔

''کہاں یار ہم نے کیا مزے کرنے ہیں، کچن میں تو ساس کی حکومت ہے۔'' ثمر کے کانوں سے یہ بات ٹکرائی تو چائے کا کپ جو ہاتھ میں تھا وہ زمین بوس ہو گیا، اتنے عرصے کی ریاضت اور محبت مٹی میں مل گئی۔

اقتدار کی بازی جیت کہ نازک احساسات اور انسانیت کی بازی ہار جاتا ہے تو کوئی سب کچھ ہار کر انسانیت کا بازی جیت لیتا ہے۔

☆☆☆

”خالہ! خواتین کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟“ نمرہ نے مٹر کے دانے چھیلتی عفت آراء سے سوال کیا تو وہ بھڑک اٹھیں۔

”تیرا کیا مسئلہ ہے؟ پہلے تو تو مجھے بتا صبح سے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے تو نے، تو کیا مسئلہ حل کر دے گی جو بار بار پوچھ رہی ہے؟“

”میں تو خالہ! وہ کالج میں ٹیچر نے کہا ہے کہ مضمون لکھ کے لاؤ کے خواتین کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟“ اٹھارہ سالہ نازک حسین سی نمرہ نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے بتایا۔

”عجیب ٹیچر ہے تمہاری خود خاتون ہو کر خاتون کے مسائل کا علم نہیں ہے اسے، کل کی بچیوں، لڑکیوں، بالیوں سے کہہ رہی ہے خواتین کے مسئلے پہ مضمون لکھ کے لاؤ۔“ عفت آراء نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”خواتین کے مسائل پہ ایک مضمون کیا ہزاروں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔“ شاہدہ بھابھی نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا تو نمرہ مدد طلب نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”لیکن کوئی ایک اہم مسئلہ بتا دیں ناں پلیز۔“

”آج کیا پکائیں؟“ عفت آراء بولیں۔

”جی۔“ نمرہ نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔

”جو مرضی پکا لیں۔“

”اے لو، میں ان کے سوال کا جواب دے رہی ہوں، مسئلے کا حل بتا رہی ہوں، مسئلے کی نشاندہی کر رہی ہوں اور یہ کہہ رہی ہیں کے ”جو مرضی پکا لیں“ بی بی اس وقت تو تم مجھے پکار رہی ہو، عقل کی ڈلی کچھ کھلی نیں ابتک۔“ عفت آراء حسب عادت نان اسٹاپ بولتی چلی گئیں۔

شاہدہ بھابھی کو ہنسی آ گئی، نمرہ منہ بسور کے بیٹھ گئی کہ اس کا مسئلہ تو جوں کا توں تھا ابھی تک، وہ فسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی، اردو کی لیکچرار نے مضمون لکھنے کا حکم دیا تھا اور وہ اب تک ایک سطر بھی نہیں لکھ پائی تھی۔

”عفی بھابھی! گیارہ بج رہے ہیں دن کے آج کیا پکائیں؟“ شاہدہ بھابھی نے اپنی جٹھانی عفت آراء کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو بھنا کر بولیں۔

”میرا سر پکا لو۔“

”وہ تو بھیا! پکا گئے ہیں، اب آپ بھیا کے لئے کیا پکائیں گی؟“ شاہدہ بھابھی نے ہنس کر کہا۔

”خالہ! بھنڈی پکا لیں یا کریلے پکا لیں۔“ نمرہ نے مفت مشورہ دیا، عفت آراء اس کی خالہ تھیں اور شاہدہ بھابھی تو ابھی دو سال پہلے بیاہ کر خالہ کی دیورانی بن کر ”امجد ہاؤس“ میں آئی تھیں لہٰذا نمرہ انہیں بھابھی کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی، خالہ کہلوانا شاہدہ بھابھی کو پسند نہیں تھا کیونکہ ابھی وہ ستائیس کی ہوئی تھیں اور ایک بیٹے کی ماں تھیں۔

”دل تو بہت کرتا ہے گرمیوں میں ہی تو دو سبزیاں ہیں جو سب شوق سے کھا لیتے ہیں، مگر ابھی اپریل شروع ہونے کو ہے گرمی ابھی دور ہے ذرا۔“ عفت آراء بولیں۔

”ہاں مگر بے موسمی سبزیاں تو کب سے سبزی منڈی میں بک رہی ہیں۔“ شاہدہ بھابھی نے کہا۔

”قیمتیں سنی ہیں تم نے۔“ عفت آراء نے شاہدہ بھابھی کو گھورا۔

”کریلے ایک سو ستر روپے کلو اور بھنڈی ایک سو تیس سے ایک سو چالیس روپے کلو بک رہی ہے، قیمتیں سن کر ہی دماغ سن ہو جائے، اتنی مہنگی

سبزی کون خریدے؟ کون پکائے؟ کون کھائے؟“

”تو ٹینڈے پکا لیں۔“ نمرہ بولی۔

”ارے رہنے دو بی، ساری گرمی پڑی ہے ٹینڈے، کدو کھانے کو۔“ عفت آراء نے منہ بنا کر کہا۔

”تو دال پکا لیں۔“ نمرہ کھسیانی ہو کر بولی۔

”ابھی کل ہی تو چنے کی دال پکائی تھی، صبح ناشتے میں دال بھرے پراٹھے بنا لئے تھے سب نے وہی کھائے تھے، تمہارے خالو تو پیٹ میں درد اور گیس کی شکایت کر رہے تھے کہہ رہے تھے آج کچھ اچھا پکا لینا۔“

”تو بھابھی مرغی پکا لیں آج۔“ شاہدہ بھابھی نے فوراً مشورہ دیا۔

”نہ بھئی برائلر مرغی کھانے سے بہتر ہے انسان گلے سڑے پھل کھا لے۔“ عفت آراء نے آپشن بھی رد کر دیا تھا اور نمرہ بیچاری انہیں بے بسی سے دیکھ اور سن رہی تھی، ان کی اس پکانے کی گردان میں اس کا مضمون تو بیچ میں ہی رہ گیا تھا۔

”ارے بھابھی! مزہ تو مرغی کھانے کا ہی ہے نا بھلے اس میں غذائیت اور صحت نہیں رہی اب پر زبان کا ذائقہ تو ہے نا۔“

”ارے چولہے میں جائے ایسا ذائقہ جو بعد میں بیماریوں کا ذائقہ چکھا دے۔“ عفت آراء ہاتھ سے جھٹکنے والے انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تو نمرہ، شاہدہ بھابھی کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

”تو بھابھی پھر کڑی پکا لیں؟“

”کڑھی۔“ کڑھی کا نام سن کر عفت آراء کے منہ میں پانی آ گیا۔

”مشورہ تو خوب ہے مگر تمہارے بھیا رات کو کڑھی کھانے سے منع کرتے ہیں کے رات کو کڑھی کھانا مضر صحت ہے۔“

”اچھا تو وہ خود کو آپ کے پاس آنے سے منع کیوں نہیں کرتے رات کو، وہ تو پورے کے پورے مضر صحت ہیں۔“ شاہدہ بھابھی بڑبڑائیں، نمرہ ان کی بڑبڑاہٹ سن کر ہنسنے لگی۔

جبکہ عفت آراء تیوری چڑھا کر شاہدہ بھابھی کو گھورنے لگیں، گو کہ ان کے کانوں تک شاہدہ بھابھی کا جملہ نہیں پہنچا تھا مگر انہیں اندازہ ضرور تھا کہ انہوں نے ان کے متعلق ہی کچھ اول فول بکا ہے جبھی نمرہ کی ہنسی چھوٹ رہی ہے۔

”اب بتاؤ کیا پکاؤں آج؟“ عفت آراء نے نمرہ کو دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”بھیجا پکا لیں۔“ شاہدہ بھابھی نے نمرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی چٹکلا چھوڑ دیا۔

”کس کا؟“ عفت آراء نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”میاں کا تو بچا نہیں ہوگا، گائے یا بکرے کا ہی پکا لیں۔“

”مجھے پسند نہیں ہے۔“ عفت آراء نے ناک بھوں چڑھائی۔

”تو بھابھی جان! فل اینڈ فائنل یہ ہے کہ آج بینگن پکا لیں۔“ شاہدہ بھابھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بادی ہوتے ہیں تمہارے بھیا تو بینگن کا نام سنتے ہی چڑ جاتے ہیں۔“

”اب نہیں چڑیں گے آپ بھائی صاحب کو بتایئے گا کے امریکی ماہرین نے بینگن کے لاتعداد فائدے بتائے ہیں، امریکی ماہرین کی نئی تحقیق کے مطابق بینگن ذہانت میں اضافہ کرتا ہے، آدمی چست چاق و چوبند ہوتا ہے، ہاضمہ درست رہتا ہے جلد چمکدار بناتا ہے۔“

”بھابھی! یہ بینگن کے فوائد ہی ہیں ناں؟“

نمرہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔
"ہاں تو اور کیا پرسوں کے اخبار میں ہی تو پڑھا ہے میں نے۔" شاہدہ بھابھی نے یقین دلاتے ہوئے کہا تو عفت آراء گویا ہوئیں۔
"تمہارے خیال میں امریکہ جو کہے گا سچ کہے گا اور ہمارے بھلے کے لئے کہے گا؟ اور ہم مان بھی لیں گے یہ تو ہونے سے رہا، اب ہم گھر کی ہنڈیا بھی امریکہ سے پوچھ کر پکائیں گے، نہ بھئی یہ نہیں ہونے کا۔"
"تو پھر آپ ہی بتا دیں کے آج کیا پکائیں؟" شاہدہ بھابھی مسکراتے ہوئے بولیں۔
"ارے کیا بتاؤں؟" عفت آراء جھلائیں۔
"کہا بھی ہے میاں جی سے کہ ہفتے بھر کا مینیو بنا کے دے دو کے کس دن کیا پکانا ہے؟ پھر جو بھی پکے گا تمہاری مرضی کا پکے گا، ہم جو بھی پکا لیں وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، کھاتے ہوئے سو سو نخرے کرتے ہیں۔"
"تو خواتین کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟" نمرہ نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔
"آج کیا پکائیں؟" عفت آراء اور شاہدہ بھابھی یک زبان ہو کر جواب دیا تھا۔
"میں نے خواتین کا سب سے اہم مسئلہ پوچھا ہے۔"
"چندا وہی تو بتا رہی ہیں خواتین کا سب سے بڑا مسئلہ بلکہ یوں کہو کے روز کا مسئلہ ہے کہ۔"
"آج کیا پکائیں؟"
"مٹر آلو پکا لیں۔" نمرہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا مسکراتے ہوئے ان سے کہا تو وہ بھی مسکرا دیں۔
"لو بھئی مٹر آلو پکا لو۔"
"اچھا بھابھی۔" شاہدہ بھابھی نے عفت آراء کے ہاتھوں سے چھلے ہوئے مٹر کے دانوں کا ڈونگا لیا اور کچن میں چلی گئیں اتنے میں عفت آراء کے شوہر کا فون آ گیا کے آج بریانی پکا لینا اور ساتھ میں پودینے کی چٹنی کا رائتہ بھی۔
"اسی لئے کہتی ہوں میاں گھر سے نکلتے وقت بتا دیا کرو کے آج کیا پکائیں؟ اب بتا رہے ہیں جب گھنٹہ بھر جھک مارنے کے بعد آلو مٹر پکنے کو رکھے ہیں۔" نمرہ عفت آراء کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ اسے یوں اپنی جانب دیکھتا پا کر بولیں۔
"میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے؟ اپنا مضمون لکھ، کیا اب بھی تجھے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا؟"
"مم...... مل گیا...... سوال کا جواب بھی اور مضمون کا عنوان بھی۔" نمرہ نے بوکھلا کر جواب دیا۔
"کیا بھلا؟" عفت آراء نے پوچھا۔
"آج کیا پکائیں؟" نمرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"ہاں آں...... سمجھ آ ہی گئی تجھے بھی، چل شاباش تو اپنا مضمون لکھ، میں ذرا بریانی چڑھا لوں نہیں تو تیرے خالو گھر آ کے میرا رائتہ بنا ڈالیں گے۔" عفت آراء سے کہتی ہوں کچن کی طرف چلی گئی اور نمرہ کے قلم نے کاپی پر مضمون کا عنوان تحریر کیا۔
"آج کیا پکائیں؟"
اور پھر مضمون لکھنے اور مکمل کرنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوا قلم چلنا شروع ہوا تو مضمون مکمل کر کے ہی دم لیا، اتنی دیر میں بریانی کو بھی دم لگایا جا چکا تھا، نمرہ مضمون مکمل ہونے کی خوشی میں بریانی کھانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

شگفتہ شاہ

طمانچہ

وہ ایک پرائیویٹ اسکول کی بہت قابل ٹیچر تھی اور اپنی انتھک محنت سے کئی اسٹوڈنٹس کا مستقبل سنوارا تھا، اسے اپنے پیغمبرانہ پیشے سے عشق اور اپنی ایمانداری پر ناز تھا۔
ایک مرتبہ، جب وہ فائنل امتحانات کے پیپر چیک کر رہی تھی تو اس کے پاس اس کی ایک بڑی امیر و کبیر رشتہ دار خاتون کا فون آیا جس نے اپنے بیٹے کی سفارش کی تو اس نے کہا۔
"وہ تو فیل ہے، اس نے کچھ بھی تو نہیں لکھا، کچھ تھوڑی بہت گنجائش ہوتی تو میں آپ کی سفارش کے بغیر بھی اسے پاس کر دیتی مگر...... سوری! میں غلط کام نہیں کر سکتی۔"
اس پر اس خاتون نے اسے لالچ دیا تو وہ اور بھی ہتھے سے اکھڑ گئی اور صاف انکار کر دیا جواباً خاتون نے اسے پورے خاندان میں برا بھلا کہا مگر اس کا ضمیر مطمئن تھا۔
جس دن رزلٹ آؤٹ ہوا تو وہ خاتون اسے اسکول میں نظر آئی جو اسکول کی مالکہ، جو کہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس بھی تھیں، اس سے ایک کونے میں کھڑی بات کر رہی تھی، جواباً ہیڈ مسٹریس، اسکول کی مالکہ نے فوراً اس کے بیٹے کا رپورٹ کارڈ اس سے لیا اور وہیں کھڑے کھڑے اسے پاس کیا اور پھر بڑی گرم جوشی سے اس سے ہینڈ شیک کر کے رخصت کیا تو وہ اسے طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھتی ہوئی چلی گئیں اور اسے ایسا لگا کہ کسی نے بھرے مجمعے میں اسے طمانچہ مار دیا ہو۔

☆☆☆

تھوڑا خیال رکھئے گا

جب اسے بورڈ کے امتحان میں "فیکوٹم" بنایا گیا، یعنی امتحانات کے انتظام کی زمیداریاں دی گئیں تو اس کے پاس سارا سارا دن بڑے بڑے لوگوں کے سفارشی فون آنے لگے، وہ حیران ہو کر سوچتی کہ اس کا سیل نمبر اتنی جلدی اتنی لوگوں کے پاس کیسے پہنچ گیا؟
پھر...... جب صبح، ویجلیس ٹیم، کے ساتھ آنے والی آفیسر خاتون نے، جس نے بڑے بڑے پرائیویٹ اسکولوں کی لڑکیوں کے اس امتحانی سینٹر میں ان سے نرمی برتنے والی Invigilatos کی سخت توہین کی تھی، شام کو اسے کال کر کے اپنی بھتیجی اور بھانجی کے لئے نرمی برتنے بلکہ کاپی کرانے کی سفارش کی۔
پھر...... جب ایک با اصول اور نامور سوشل ورکر نے اپنی بیٹی کے لئے سفارش کرتے ہوئے اسے کہا۔
"میری بیٹی بہت ہی Intelligent ہے، اسے سب کچھ آتا ہے، بس اس کا تھوڑا سا خیال رکھئے گا۔"
سارا دن "خیال رکھنے" اور "سب کچھ آنے" والوں کے سفارشی فون اٹینڈ کرتے

کرتے وہ مسلسل یہی سوچتی رہتی کہ کاش وہ ان سے کہہ سکے۔

''اگر یہی کچھ کروانا ہوتا ہے تو پھر اتنی بھاری فیس دے کرنا مور پرائیویٹ اسکولوں میں بچوں کو پڑھاتے کیوں ہو؟''

☆☆☆

بے حسی

کتنی عجیب بات ہے کہ اکثر محض بچوں کی باتوں یا لڑائیوں میں بڑے بھی کود پڑتے ہیں اور پھر محلے، رشتہ داروں میں ٹھن جاتی ہے اور بات گالی گلوچ سے بھی نکل کر باقاعدہ لڑائی بھڑائی تک پہنچ جاتی ہیں اور لوگ کبھی ان جھگڑوں میں زخمی بھی ہو جاتے ہیں اور قتل بھی ہو جاتے ہیں اور ایسی خبریں میڈیا کے لئے موضوع بن جاتیں ہیں۔

مگر...... جب درندہ صفت لوگ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو بھی نہیں بخشتے اور درندگی کا شکار بناتے ہیں تو نہ تو پڑوسی احتجاج کرتے ہیں نہ رشتے دار، فقط میڈیا آواز اٹھاتا ہے...... آخر کیوں؟

☆☆☆

بہادری

اسٹوڈنٹ لیڈر کی جوشیلی تقریر۔

''ہم کسی سے نہیں ڈرتے، ہم بھاگنے اور بکنے والے لوگ نہیں، ہم جیلوں سے نہیں ڈرتے، ہم جان ہتھیلی پر رکھے گھومتے ہیں، ہمیں اپنے مقصد سے کوئی بھی ہٹا نہیں سکتا...... ارے...... بھاگو...... پولیس...... آرہی ہے......''

☆☆☆

انصاف یا ناانصافی

اس نے بورڈ کے پیپر میں آج اپنی ڈیوٹی Invigilator کی حیثیت سے بہت ایمانداری کے ساتھ کی اور کسی بھی لڑکی کو کاپی کرنے نہیں دی، حالانکہ کہ انہوں نے بہت کوشش کی، جب اس نے بہت سختی کی تو آخر ایک لڑکی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''میم! اس سے پہلے کے پیپرز میں اتنی سختی نہیں تھی اور دوسرے بلاکس میں اس وقت کھلے عام چیٹنگ ہو رہی ہے اس لئے ہم نے بھی کاپی کے آسرے کی وجہ سے پڑھا نہیں ہے، آپ ہمیں مت روکیں پلیز۔''

''میرا کسی اور سے کوئی واسطہ نہیں، میں اپنے کام میں ایماندار ہوں، میں کوئی غلط کام برداشت نہیں کروں گی۔''

پیپر کی ڈیوٹی کے بعد جیسے ہی وہ جانے کے لئے مین گیٹ کے قریب پہنچی تو ایک لڑکی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی، اس کے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

''آپ نے ہمارے بلاک کی لڑکیوں کے ساتھ ظلم کیا ہے، ہم فیل ہونگے تو زمیدار آپ ہونگی، جب ہر طرف کاپی کلچر کا ماحول ہے، تو آپ کچھ اسٹوڈنٹس پر سختی کر کے کون سا کارنامہ انجام دیتیں ہیں؟ اتنا ہی شوق ہے تو اس پورے سسٹم کو جا کر صحیح کریں، آپ نے ہمارا فیوچر تباہ

کر دیا، سب لڑکیاں رو رہی ہیں اور آپ کو بد دعائیں دے رہی ہیں، کیا ملا آپ کو یہ سب کچھ کر کے۔''

وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی اور اسے ایک ایسا جھٹکا دے گئی کہ گھر آنے کے بعد بھی اس کے دل پر بوجھ رہا اور اس نے سوچا۔

''کبھی کبھی انصاف کرنا بھی ناانصافی بن جاتا ہے، جہاں چاروں طرف بے اصولی چل رہی ہو وہاں فقط چند لوگوں کو اصول پر چلانا ظلم ہی ہوتا ہے، سسٹم کو وہ بدل نہیں سکتی۔''

اس نے اس کے بعد آج تک پھر کبھی بورڈ کے امتحانات میں Invigilator کی حیثیت سے ڈیوٹی نہیں دی۔

☆☆☆

سوال

جب وہ چھوٹی تھی تو اس کے بھائی نے ایک غیر ملکی لڑکی سے خط و کتابت کے وسیلے اور نیٹ پر غیر ملکی لڑکیوں سے دوستی کی اور ان میں تصویروں کے تبادلے ہوئے تو ان کے والدین اپنے رشتے

بھاگ کر لڑکی نے لڑکے سے شادی کی تھی) روز روز کی تکرار کے بعد ایک دن لڑکے نے لڑکی کو مار ڈالا۔

ان میں سے کوئی ایک خبر بھی جھوٹی نہیں کہ اخبارات میں چھپی تھیں، ہر روز ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں، چھپتی بھی ہیں، پھر بھی نہ جانے کیوں، کوئی سبق نہیں سیکھتا۔

☆☆☆

داروں اور ملنے والوں سے فخر سے ان کا ذکر کرتے اور ان کو لڑکیوں کی تصویریں دکھاتے۔

جب اس نے نیٹ پر ایک لڑکے سے دوستی کی اور تصویروں کا تبادلہ ہوا تو اس کی ماں نے اسے خوب سنائیں اور دھمکی دی کہ وہ اس کے والد کو بتائے گی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

تب ڈرتی، سہمتی بچی کے دماغ میں ہر وقت یہی سوال گونجتا رہتا تھا۔

''بھائی اگر لڑکیوں سے دوستی کرے تو فخر اور ماڈرن کلچر اور وہ اگر ایک لڑکے سے دوستی کرے تو گناہ؟ آخر کیوں؟''

آج وہ بڑی ہو چکی ہے، اب بھائی جب بھی امی اور بہنوں سے اپنی گرل فرینڈ کی باتیں کرتا ہے تو وہ صدقے واری ہو کر کہتیں ہیں۔

''کیسی ہے وہ؟''

''بھئی جلدی ملواؤ نا اس سے۔''

''رشتہ مانگنے کب جائیں؟''

تب وہ سوچتی ہے کہ اگر وہ اپنے گھر والوں کو اپنی پسند کے لڑکے کے بارے میں بتائے تو کیا اسے بھی ایسی پذیرائی ملے گی؟

☆☆☆

خبر کہانی

۱ پسند کی شادی پر والدین کی رضا مندی نہ ملنے پر لڑکے اور لڑکی نے ایک ساتھ خودکشی کر لی۔

۲ پسند کی شادی کے دو ماہ بعد میکے اور سسرال والوں کے رویوں سے دل برداشتہ ہو کر لڑکی نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔

۳ پسند کی شادی کے تین ماہ بعد (گھر سے
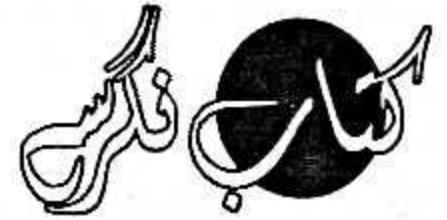
گرہ کھلنے تک

مصنف: شہزاد نیرّ

تبصرہ ـــــ سیمیں کرن

پاک فوج کے آہنی عزائم اور اس نا قابل تسخیر خاکی وردی کے نیچے اک حساس ادب پرور دل بھی دھڑکتا ہے اور اس بات کا بین ثبوت یہ ہے کہ پاک فوج نے بڑے نامور ادیبوں کو جنم دیا جن پر اردو ادب کو بجا طور پر ناز ہے کرنل محمد خان اور کرنل اشفاق حسین اور میجر ضمیر جعفری اس کی درخشندہ مثالیں ہیں۔

میجر شہزاد نیرّ نظم کے اک عمدہ نفیس اور نمایاں شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، شہزاد نیرّ کے اس سے پہلے دو شعری مجموعے آ چکے، "برِخاب" 2006ء میں نظموں کا یہ مجموعہ PEN ایوارڈ یافتہ ہے، دوسرا شعری مجموعہ "چاک سے اترے وجود" 2009ء غزلوں نظموں کا یہ مجموعہ پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ یافتہ ہے۔

شہزاد نیرّ اک مخصوص لب و لہجے کے حامل شاعر ہیں اور ان کی نظمیں آہنگ و نغمگی سے بھرپور ہونے کے باوجود ان کی سوچ و نفسیات اور علم کی بھرپور عکاس ہیں۔

شاعری بے شک اک وجدانی تجربہ ہے مگر یہ آپ کے علم اور سوچ کے مخصوص زاویے کا بھی عکاس ہوتا ہے۔

شہزاد نیرّ کی نظموں کا اصل موضوع تو انسان ہے یہ نظمیں ان تمام سماجی و مذہبی رویوں کے خلاف اعلان بغاوت ہیں جو انسان کو "Subject" کی بجائے "Object" بنا دیں، یہ بغاوت ہے ہر ظلم و جبر کے خلاف، اک تلاش، اک جستجو نظر آتی ہے ہمیں شہزاد نیرّ کے ہاں اور یہی خوبی ان کے موضوعات میں ہے، متجسس آنکھ حساس دل اور احتجاجی ولب ولہجہ، یہ شہزاد نیرّ ہیں۔

کتاب کا انتساب ہی بڑا معنی خیز ہے اور ان کے مخصوص لب و لہجے اور زاویہ نگاہ کا عکاس، اک بغاوت ہر اس روایت اور اس قتل و غارت و خونریزی جو مذہب کے نام پر انسانوں پر مسلط کر دی گئی دیکھیے۔

"زمین کے ان باسیوں کے نام جو آسماں کی خاطر قتل کر دیے گئے" کتاب کا آغاز منظور پیش لفظ "ساختیات" سے ہے پیش لفظ بھی ان کی بشر مرکز فلاسفی کا عکاس ہے اک گلہ و شکوہ بھی ہے بغاوت نہ صرف روایت سے بلکہ لفظ و حرف کی روایت پر بھی احتجاج ہے۔

"گنہ کو ننگ سے ہٹاتا
کبھی بین کو بین میں نہ لگاتا
سعادت کو عبادت بنا کر عبادت بناتا
درشتی، درتی سے کچھ دور رکھتا
خیر، خیر کرتا......"
اور پھر
خدا کو نہ خود سے جدا کر کے لکھتا
خود آ خود کو خود ہی خدا کر کے لکھتا

ان لفظوں میں انسانی عظمت کا احساس اور اپنے اختیارات کی خواہش کا وفور ہے وہ وفور جو حرفوں سے بغاوت پر مجبور کر کے ان کی شکست و ریخت کے عمل میں معنی کے بطن میں اترنے کی خواہش ہے، خدا کی ذات میں "خود آ" کی آئینہ

گری ہے، انسانی عظمت و بشریت کا کمال کہ وہ عکس ہے اس بے مثل آئینے کا، یہ احساس ہی شہزاد نیرّ کو یہ جرأت دیتا ہے کہ وہ "محو آئینہ داری" سی نظم کہہ دیں۔

"خدوخال حسن گریزپا، یہ خبر رہے
کہ جو روپ تم کو عزیز ہے
اسے دیکھنے سے دوام ہے
جو بدن پر پھولوں کے رنگ ہیں
یہ نظر کے باغ سے آئے ہیں
سو گواہ حسن کی عرض ہے
رہو محو اپنے جمال میں
مگر آئینے کو بھلا نہ دو"

شہزاد نیرّ کی نظموں میں تصوف کا رنگ بھی بڑا گہرا ہے مگر اس تصوف میں کھوج تلاش و تجسس روح کے رنگ گہرے ہیں جو جاننے کو اس قدر بے چین ہے کہ لب و لہجے میں بے باکی کی بو ہے۔

اک تلاش خاص اک جستجو اک پیاس
یہ عجب پیاس ہے جو پرانے جوابوں سے بجھتی نہیں
بحر بیچارگی، میں سوالوں کے ساحل کا موتی نہیں تھا، تجسس مجھے رولتا ہے۔

اور یہ ہی بحر بیچارگی شہزاد نیرّ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کہہ دیں۔

"آج تک میں تجسس کی میزاں پر تلتا رہا،
آب تجسس مجھے تولتا ہے"

سماجی نا انصافی و نا قدری بھی شہزاد نیرّ کا مرغوب ترین موضوع ہے پھر وہ نا قدری مذہبی روایت کا نتیجہ ہو یا سماجی یا پھر مردانہ معاشرے میں پستی استحصال زدہ عورت۔

شہزاد نیرّ کا قلم خوب روانی سے چلتا ہے۔
نظم "ٹیڑھی ترازو" میں مردانہ سماج پہ اک گہرا طنز ہے۔

تم میرے گھر میں رہتی ہو، میری ہو، میری!
تمہیں حق نہیں ہے کسی اور جانب کو پھسلو
تمہارے لئے صرف میں ہوں
یہ ہرگز نہ بھولو
کہ تم، تم ہو اور میں تو صدیوں سے "میں" ہوں

مردانہ سماج پہ گہرا طنز کرتے ہوئے وہ صنف نازک کی عظمت کا اعتراف نظم "ورکنگ وومن" میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

"دو ننھے سے کاندھوں پر تم اتنا بوجھ اٹھاتی ہو۔
صنف نازک کہلاتی ہو!

یہ شہزاد نیرّ کا حساس قلم ہے جو عورت کی نفسیات و کیفیت پوری طرح احاطہ کرتا ہے عورت کی وہ ساتویں حس جو اسے بتاتی ہے کہ کوئی اسے چاہتا ہے۔

"اگر سوچتا تو میری ساتویں حس بتاتی
میں لڑکی ہوں، سب جانتی ہوں
مجھے جب جہاں کوئی دیکھے کہ سوچے......"

یہ نظم "ادب رانجھے ورگا ناں" اک لڑکی کی محبت کی داستاں ہی نہیں اک گلا بھی ہے اور عورت کی فطرت کی عکاسی بھی کہ اسے خدا سے بھی بڑھ کر اپنے مرد کی چاہت مطلوب ہے اور یہ چاہت کی طلب کا غلبہ ہے جو اسے رب میں بھی رانجھا نہ ملنے کا شکوہ ہے مگر سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا اک عورت کے من میں رب کی طلب اپنی پوری شدت سے نہیں بیدار ہو سکتی؟ شہزاد نیرّ کی نظموں کا اک مخصوص مزاج ہے کہ نظم کا تاثر نظم کے آخری حصے میں کھلتا ہے اور نظم اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح قاری پر اخیر میں ہی عیاں ہوتی ہے مگر اپنی کچھ نظموں میں شہزاد نے اس روایت سے خود ہی انحراف بھی کیا ہے، نظم "ستراط" ایسی ہی نظموں میں سے ہے کہ نظم آغاز

سے ہی اپنی معنویت کو عیاں کر رہی ہے۔

"پتھر کاٹنے والے کو معلوم نہیں تھا
اپنا آپ ہی سب سے بھاری پتھر ہے
جسم کا پتھر کٹ جائے تو رستہ بہتر کٹ جاتا
ہے
ڈھیروں پتھر کاٹ کاٹ کے
وہ روز و شب کاٹ رہا تھا۔"

شہزاد نیرؔ کی نظموں میں ان کے شعبہ ملازمت کی جھلک "اندر کی جنگ" نظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

"زمین جسم میں دردوں کی بارودی سرنگیں
ہیں
کبھی کوئی صورت غم اترتا ہے جو سینے میں"

اسی طرح نظم میں "کفن چور" ویلنٹائن ڈے اور "چپ کی چادر" سماجی ناانصافی کے خلاف بھرپور آواز ہیں۔

چپ کی چادر بھی ان کے اسلوب کے برعکس آغاز ہی سے معنویت اختیار کر لیتی ہے۔

"جتنے اونچے ہیں اتنے ہی خاموش ہیں
کن پہاڑوں میں رہنا پڑا ہے مجھے"

نظم "کفن چور" سماجی قدروں پر اک گہرا طنز وان کے خلاف اک بغاوت ہے اک ایسے معاشرے پر طنز ہے جو مردہ بدن کو تو کفن سے ڈھانپ دیتا ہے مگر زندگی کی عریانی ڈھانپنے میں ناکام ہے، کفن چور اک ایسا عنوان ہے جو یہ سوال ضرور پیدا کرتا ہے کہ کیا سماجی قدروں کا یہ استحصال والہلام اخلاقیات کی عمارت کو ڈھانے کے مترادف نہیں خاص طور پر ایسے معاشرے میں جہاں کفن چوری اک مکروہ صنعت میں ڈھل چکی ہو؟

اسی طرح اس مجموعے میں "دست شفا" سی رومانٹک لائٹ نظم بھی ہے اور "میٹھا جھوٹ" اور "بدن کی حمات میں" سی گہری رومانوی نظمیں بھی ہیں، ان نظموں میں ہمیں اک محقق روح نظر آتی جو محبت میں بھی اپنے تجسس و تحیر کو ڈال کر نتائج اخذ کرتی ہے۔

"میٹھا جھوٹ" میں دیکھئے شہزاد نیرؔ کیا کہتے ہیں۔

"ہماری تشنگی ان کو محبت نام دیتی ہے
ضرورت سب کو ہوتی ہے۔
کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے
کی
کسی کی آنکھ سے تعریف کے دو بول پانے
کی
کسی کے ساتھ چلنے کی، کسی کو راہ دکھانے
کی
کہ تنہا کٹ نہیں پاتیں کٹھن راہیں زمانے
کی
ضرورت روپ بھرتی ہے محبت کا!"

اسی طرح "بدن کی حمایت میں" بڑی بے باکی سے اعتراف و اظہار کرتے ہیں۔

"تخیل کی بیمار صنعت سے نکلا خیالی سراپا نہیں ہے کہ جو سوچنے کو حسین ہے، چھوؤ تو نہیں ہے۔"

اور حقیقت تو یہی ہے کہ تمام خیال و عالم مثال کی عمارت کھڑی تو اسی بدن پر ہے۔

"پلاسی 1757ء" اک تاریخی واقعے کو مقید کرتی نظم مگر اس کو دیکھنے و تصویر کشی کرنے کا انداز شہزاد نیرؔ کا اپنا ہے۔

"جاننا طاقت میں بدلا
تجربہ چشم تحیر سے ملا گویا دھماکہ ہو گیا!
جب علم کی طاقت حدوں سے بڑھ گئی
تو ظلم کی صورت سمندر میں اتر آئی"

اس مجموعے میں خالد احمد اور اسلم سراج

الدین کو بھی نظموں کی صورت خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح اک اور خوبصورت نظم "تم اداسی کو دیکھ سکتے ہو" سے ملیئے یہ "اداسی صبح کی پہلی کرن کو کاتتی ہے اور پھر سفر کرتے کرتے۔

"اداسی دوپہر کی دھوپ کی قاشیں نگلتی ہے"
مگر پھر دن تمام ہوتا ہے اور
"اداسی رات کے کاجل سے دو آنکھیں
بناتی ہے"

گویا اک اداس دن کو شاعر نے تصویر کر دیا!

"وہی آخری موت تھی" نظم نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی کہانی ہے جب معیشت کے بوجھل پہیے تلے اندر کا خالص انسان مر گیا، اسی طرح "کوئی پہاڑ ہٹ گیا" شہزاد نیرؔ کے تحیر و تجسس سے ہٹ کر بالکل الگ اک خاص باطنی تجربے و کیفیت کی نظم ہے جیسے خیر و شر کے پردے شہزاد نیرؔ پر واشگاف کر دیے گئے۔

"وہ آگ تھی کہ آگہی
کہیں پر جو رکی نہیں
جو آگے آگے چل پڑی تو راستہ نکل پڑا
خدا کو پیچھے چھوڑ کر
میں خود کو لے کر چل پڑا"

"آٹھواں دن" بھی اک بے مثال نظم ہے، یہ خدائے کن فیکون کے سات دنوں کی کہانی ہے وہ خالق جو کہتا ہے کہ اس نے اس کائنات کو سات دنوں میں تخلیق کیا اور ان سات دنوں کے بعد۔

"آٹھواں دن تو تیرا دن تھا
تو نے مجھ کو پڑھنا
پڑھ کر کام مکمل کرنا تھا۔
تخلیق کار جیسے تخلیق کے پاتال میں جا
اترا۔"

"نوحہ گر" طویل اور اس کتاب کی آخری نظم ہے اور بقول سعید ابراہیم۔

"سچ کہوں تو شہزاد نے سائنس کو رومانس بنا دیا ہے اور اردو زبان کی کم مائیگی کے باوصف یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں۔

اک طویل نظم! یہ گویا اک طویل تاریخی انسانی تہذیبی ارتقائی سفر طے کرتی ہوئی نظم ہے، تخلیق کائنات کے آغاز سے انسانی تہذیبی سفر مختلف ادوار میں اس نظم نے رقم کیا ہے۔

بلاشبہ شہزاد نیرؔ کی "گرہ کھلنے تک" ادب کے سنجیدہ قاری کو اپنی جانب مبذول کرنے کی پوری قوت رکھتی ہے۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریر محمود

فرمان رسولؐ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! میری مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو روک دیتا ہے لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوشش ناکام بنائے دے رہے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں، اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔"

فرح راؤ، کینٹ

حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات

(1) حضرت خدیجہؓ:۔ یہ رسول اکرم کی سب سے پہلی بیوی ہیں، نکاح کے وقت آپ کی عمر چالیس برس جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس برس تھی۔

(2) حضرت سودہؓ:۔ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ہیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام سکران بن عمرو تھا۔

(3) حضرت عائشہؓ:۔ آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کے وقت آپ کنواری تھیں اور ازواج مطہرات میں سب سے کم عمر بھی آپ ہی تھیں۔

(4) حضرت حفصہؓ:۔ آپ حضرت عمرؓ کی بیٹی ہیں، آپ بہت سخی اور عبادت گزار خاتون تھیں۔

(5) حضرت زینب بنت خزیمہؓ:۔ آپ بہت سخی اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں، آپ غریبوں کی ماں کے نام سے بھی مشہور تھیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام عبداللہ بن جحشؓ تھا۔

(6) حضرت ام سلمہؓ:۔ آپ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی غریب محتاج کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام ابوسلیمہ تھا۔

(7) حضرت زینب بنت جحشؓ:۔ آپ بہت مالدار خاتون تھیں آپ کا پہلا نکاح حضرت زیدؓ سے ہوا تھا، پردے کا پہلے پہل حکم ان کی شادی پر ہی آیا تھا۔

(8) حضرت اُم حبیبہؓ:۔ ہجرت مدینہ میں یہ بھی شامل تھیں اور حبشہ گئی تھیں، حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے نصرانی سے مسلمان ہونے کے بعد آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پیام دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبول کرنے پر نکاح کا بندوبست بھی خود نجاشی نے کیا۔

(9) حضرت جویریہؓ:۔ یہ ایک لڑائی میں جو (بنی مصطلق کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے) میں قید ہو کر آئی تھیں، حضرت جویریہؓ کے پہلے شوہر کا نام مسافع بن صفوان تھا۔

(10) حضرت میمونہؓ:۔ ان کے پہلے شوہر کا نام خویطب تھا۔

(11) حضرت صفیہؓ:۔ یہ ایک لڑائی میں قید ہو کر آئی تھیں اور ایک صحابی کے حصے میں دی گئی تھیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مول لے کر آزاد کر دیا اور پھر نکاح فرمایا، یہ حضرت

ہارون کی اولاد میں سے ہیں، ان کے پہلے شوہر کا نام کنانہ بن ابی الحقیق تھا، یہ پہلے یہودی تھیں۔

زرین اطہر، پشاور

مسکراتی کرنیں

☆ علم کے پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو جوں جوں علم کے قطرے تمہارے جسم میں پہنچیں گے تمہارے دل و دماغ روشن ہو جائیں گے یہ ہی وہ روشنی ہو گی جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچائے گی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکی کو علم کی روشنی سے روشن کرو پاکستان کو شمع علم سے جگمگاؤ۔

☆ سب سے اچھا کام وہ ہے جو دوسروں کے لئے کیا جائے۔

☆ علم کو دوسروں تک پہنچانا بھی نیکی ہے۔

☆ جو شخص علم کو پھیلاتا ہے وہ صدقہ دیتا ہے۔

☆ جو شخص اخلاق سے محروم ہے وہ اچھا مسلمان نہیں ہے۔

نبیہ راؤ، سیالکوٹ

عظمت کی باتیں

1 احسان کرو خواہ ناشکرے پر کیونکہ وہ میزان میں شکر گزار کے احسان سے عاری ہے۔ (حضرت علیؓ)

2 نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔ (بوعلی سینا)

3 کامیابی کا زینہ ناکامیوں کی بہت سی سیڑھیوں سے بنتا ہے۔ (ارسطو)

4 اس چھوٹی سی دنیا میں نفرتوں سے بچو اس لئے کہ زندگی کم بلکہ بہت کم ہے۔ (سقراط)

5 مصیبت میں آرام کی تلاش مصیبت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ (حضرت امام جعفر صادقؒ)

سپاس گل، رحیم یار خان

باتوں سے خوشبو آئے

O زندگی میں اگر ایک دوست مل گیا تو بہت ہے دو مل گئے تو بہت زیادہ ہیں تین مل ہی نہیں سکتے۔

O سچی محبت نایاب ہے اور دوستی اس اس سے بھی نایاب ہے۔

O محبت ایک جادو ہے جو وجود کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

O محبت ایک ایسا آئینہ ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔

O محبت کا لطف محبت کرنے میں ہے۔

مہناز کوثر سومرو، رحیم یار خان

صدقہ

اپنے بھائی کو دیکھ کر تو متبسم ہوتا ہے تو یہ صدقہ ہے۔

لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

کسی بھٹکے کو سیدھا راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔

کانٹا یا پتھر وغیرہ کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

اپنے ڈول میں پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔

زرعہ امین، لاہور

اے دوست تیری دوستی

دوستی کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں دوستی وفا کا نام ہے، کچھ کا خیال ہے دوستی دھوکا، فریب، نفرت کا نام ہے اور کچھ اسے محبت کے ترازو میں تولتے ہیں۔

محبتوں کا گلدستہ اپنی تمام تر رعنائی اور خوشبو لئے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، دوستی روح کی شاعری ہے، جس کا ایک مصرعہ آپ لکھتے ہیں اور دوسرا آپ کا دوست، دوستی میں وفا کا ہونا بہت ضروری ہے، وفا کے بارے میں شاعر نے

کیا خوب کہا ہے۔

خلوص دل ہی نہیں ربط باہمی کے لئے
وفا بھی شرط ہے اے دوست دوستی کے لئے

اس دنیا کا ہر اصول ہے کہ ہر نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر دوستی جتنی پرانی ہو گی اتنی ہی پائیدار ہو گی، سچا دوست وہی ہوتا ہے جو دوسرے دوست کو اس کی برائیوں سے آگاہ کرتا ہے، دوستی ایک نازک پھول ہے جسے بداعتمادی کی ذرا سی گرمی بھی مرجھا دیتی ہے، ایسا کانچ کا برتن ہے جو ذرا سی ٹھیس سے چور ہو جاتا ہے اس لئے خلوص دوستی کی شرط اول ہے۔

آسیہ زبیر، عارف والا

چمن چمن خوشبو

☆ جس دروازے سے شک اندر آتا ہے محبت اور اعتماد اس دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

☆ بیماریوں میں بڑی بیماری دل کی ہے اور دل کی بیماریوں میں بڑی بیماری دل آزاری ہے۔

☆ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

☆ اتنا اونچا مت اڑو کہ سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پر آ گرو۔

☆ انسان اتنا غلط نہیں جتنی ان کی سوچ اور رویے غلط ہیں۔

☆ بارش چیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

☆ طنزوں کے تیر چلانے کے بعد دل جوئی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ خود کو نہ دوسروں کو۔

حنا محمد خالد، کراچی

آل عمران

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و صلاح کے لئے میدان میں لایا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اقامت دین کا یہ کام ہی تحریک اسلامی کا مقصد وجود اور فرض منصبی ہے یہی رضائے الٰہی کا ذریعہ اور حصول جنت کا ضامن ہے، اس مقصد کی تذکیر، مختلف انداز سے، جس کی تفصیل ہمارے لٹریچر میں موجود ہے ہر وقت ہوتی رہنی چاہیے۔

راشد ترین، مظفر گڑھ

قیمتی جوہر

1 ہر رات کے بعد دن ضرور طلوع ہوتا ہے اور جو رات صبر سے گزاری جائے اس کی سحر بہت حسین ہوتی ہے۔

2 انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

3 بارش چیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

4 اتنا اونچا مت اڑو کہ سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پر آ گرو۔

5 ڈیوڑھی پر چراغ اس وقت تک روشن رکھو جب تک گھر کے سارے افراد واپس نہ آ جائیں۔

6 اعتماد اس پرند کا نام ہے جو صبح کاذب میں ہی روشنی کے احساس سے چہچہانے لگتا ہے۔

7 بیماریوں میں بڑی بیماری دل کی ہے اور دل بیماریوں میں سب سے بڑی دل آزاری ہے۔

رابعہ سعید، کاموکی

☆☆☆

زرین اطہر ---- پشاور

دل کی گلیوں کے سبھی راستے ازبر ہیں ہمیں
اک ذرا نظر کی چوکھٹ سے پرے آنے دے
ہم تیرے نام پہ لکھ دیں گے زندگانی اجر
بس وہ اک لمحہ اظہار وفا آنے دے

....

ہم بھی اتریں گے تیرے دل پہ وحی کی صورت
گماں کی بستی میں عہد یقین کی صورت

....

ہم نے جن سے پیار کیا اور جن کے ناز اٹھائے
ان لوگوں نے شیشے گھر پر پتھر ہی برسائے

سباس گل ---- رحیم یار خان

جب سے اترا ہے وہ آسیب کی مانند مجھ میں
جوگی بن کر ہیں کئی خواہشیں محو رقصاں

....

بڑھے ہی آ رہے ہیں پھر کسی طوفان کی صورت
لگا کر ہی یہ دم لیں گے ٹھکانے آشیاں میرا
بہت سا گولہ و بارود بھی ہمراہ لائے ہیں
چلے ہیں پھر یاروں جلانے آشیاں میرا

....

خودی کے ساتھ زندہ ہوں ابھی تک اس لئے یارو
کسی کو بھی میرا یہ بانکپن اچھا نہیں لگتا
کریں گے موسم گل میں چمن زاروں کو ویرانے
چمن والوں کو شاید اب چمن اچھا نہیں لگتا

مہناز کوثر سومرو ---- رحیم یار خان

مجھے اس کا غم نہیں کہ بدل گیا زمانہ
میری زندگی تم سے ہے کہیں تم بدل نہ جانا

....

بڑا کٹھن ہے راستہ جو آ سکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فاصلہ مٹا سکو تو ساتھ دو
بڑے فریب کھاؤ گے بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر کا ساتھ ہے نباہ سکو تو ساتھ دو

....

ملے وہ زخم کہ کوشش سے بھی چھپا نہ سکے
کہ اب کے سال تو جبراً بھی مسکرا نہ سکے
یہاں تو لوگ عجیب نفرتوں میں زندہ ہیں
ہمیں تو پیار کے لمحے بھی راس آ نہ سکے

رابعہ اسلم ---- رحیم یار خان

درد انعام میں بخشا ہے تیری یادوں نے
ڈوبتے دل کو دیا جب بھی سہارا ہم نے

....

کچھ بات ہے تیری باتوں میں
یہ بات کہاں تک آ پہنچی
ہم دل سے گئے دل ہم سے گیا
یہ بات کہاں تک آ پہنچی

....

کبھی سائباں نہ تھا بہم کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی بے مکاں کبھی لامکاں میری آدھی عمر گزر گئی
اسے پا لیا اسے کھو دیا کبھی ہنس دیا کبھی رو دیا
بڑی مختصر ہے یہ داستاں میری آدھی عمر گزر گئی

نبیہ حیدر ---- ضلع لیہ

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

....

خامشی جرم ہے جب منہ میں زبان ہو اکبر
کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا
مصائب میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

....

خطہ ارضی کو خود جنت بنا سکتے ہیں ہم
دلولہ دل میں امنگوں کا اگر پیدا کریں
محمد سعید نوئی ---- عارف والا
شعلہ حسن سے جل جائے نہ چہرے کا نقاب
اپنے رخسار سے پردے کو ہٹائے رکھنا

....

چہرہ ہر صورت کو اپنی شکل میں ڈھال گیا ہے
شہر کے آئینوں سے باقی سارے عکس نکال گیا ہے
اب تو شاید دکھ وفا سن کر بھی میرا دل نہ دھڑکا
یاد کا جھونکا پھر اس پھول میں خوشبو ڈال گیا ہے

....

فراق یار کے لمحے گزر ہی جائیں گے
چڑھے ہوئے دریا اتر ہی جائیں گے
تو میرے حال پریشان کا کچھ خیال نہ کر
جو زخم تو نے لگائے ہیں بھر ہی جائیں گے
نعیمہ صدیقی ---- راولپنڈی
یہ دو دلوں کی میت کہانی ہے
پیشانی پہ میرا بھی نام لکھنا ہے
سجاؤں گی جب میں چوڑیاں ہاتھوں میں
مہندی میں سجناں تیرا نام لکھنا ہے

....

وہ داستان محبت کرنے کے بیاں ہنر جانتا تھا
اس لئے لوگ آج اسے بڑا کہانی کو مانتے ہیں

....

کل تو کسی سے کہہ رہا تھا
ہوا بہت خنک ہے آج دوست
تجھے کب معلوم ہوا تھا کہ
شامل اس میں میرے چند آنسو بھی ہیں
عمیرہ صدیق ---- کراچی
اوراق پریشاں کے شعلوں کے دہکنے سے
پھولوں کے مہکنے سے چڑیوں کے چہکنے سے
ذہن کے گلستاں میں یہ بات ہے آئی
شاید کہ بادصبا نے لی ہے انگڑائی

....

جو یادگار پل ہمارے سنگ گزرے ہیں
کبھی تو کسی موڑ پر ہم تمہیں یاد آئیں گے
اچھا لگتا نہیں مجھ کو ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے

....

بیٹھے سوچتے ہیں مگر کچھ یاد نہیں آتا
جانے کب سے آباد تو دل کے نگر میں ہے
کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسہ سائل کی طرح
حنا یمین ---- کراچی
جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح

....

جانے کیوں یہ گماں رہتا ہے
کہ وہ نظر آئے گا سرراہ چلتے وقت
خدا لکھ دے گا اسے میری قسمت میں
کسی قبولیت کی گھڑی میں شام ڈھلتے وقت

....

کس طرح مجھے ہوتا گماں ترک وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا لہجے میں روانی
بہت کم لوگ واقف ہیں سخن آثار لمحوں سے
جسے محسوس کرتے ہیں اسے لکھا نہیں جاتا
رضوانہ کوریجہ ---- لاہور
ہو لاکھ کوئی شور مچاتا ہوا موسم
دل چپ ہو تو باہر کی فضا کچھ نہیں کہتی

....

شعور اب تک اسی شے کی کمی ہے
وہی جو چاہیے تھا چاہیے ہے

....

جنگلوں میں شام اتری خون میں ذات قدیم
دل نے اس کے بعد انہونی کا ڈر رکھا نہیں
نجمہ زیدی ---- حافظ آباد
یہ تیرا عزم سفر یہ میرے ہونٹوں کا سکوت

اب تو دنیا نہ کہے گی شکایت کی تھی
میں سمجھ لوں گا میں نے اک انساں کے عوض
اک بے جان ستارے سے محبت کی تھی

....

میرے قلم سے لکھی گئیں
نہ میری زباں سے ادا ہوتی ہیں
جو نظر سے کہنے کی بات ہے
کسی حرف نہیں نہ سمائے گی

....

کوئی پھول چنتا ہے کس طرح
کوئی ڈھول ہوتا ہے کس طرح
تجھے تو وقت کی بات ہے
زندگی ہی بتائے گی
فرح راؤ ---- کینٹ لاہور
آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر کہتا ہے مجھے میرا چاہنے والا اکثر
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

....

حاصل زندگی عشق وہ ایک لحہ ہے
عمر بھر جو کبھی حاصل نہیں ہونے پاتا

....

نہ اعتبار خدا ہے نہ اعتماد خودی
گھلا ہوا ہے عجب زہر سا فضاؤں میں
یہ کیا ستم ہے کہ اک شہر میں رہتے ہوئے
نہ تم ملو کبھی ہم سے نہ ہم دکھائی دیں
جاوید علی ---- مردان
ریت میں پھول اگے دھوپ میں جاگی ٹھنڈک
دشت احساس میں پھیلا تیری یادوں کا گلال

....

دل داغ داغ ہے تو بہاروں کا کیا قصور
دھوکا فصیل رنگ پہ خود ہو گیا ہمیں

....

قافلہ جیسے اجالوں کا یہیں اترے گا

وقت سے پہلے چراغ اپنے بجھائے ہم نے
پلوشہ خان ---- چارسدہ
خوابوں کے جزیروں میں اتر آتے ہیں اکثر
وہ لوگ کہ اب جن سے ملاقات بھی کم ہے

....

مل کے اس شخص سے میں لاک خموشی سے چلوں
بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح

....

یہ اور بات ہے تھک ہار کے وہ سویا ہے
جو تم ملو گے تمہیں رتجگے بھی دے گا وہ
عمیر احمد ---- ساہیوال
بس ایک تیرے بچھڑنے کی دیر تھی
سمٹ کے آ گیا لمحوں میں کرب صدیوں کا

....

دکھوں کی رت کا وہ پھیلا ہے کرب سوچوں میں
کہ سکھ رتوں میں بھی یہ دل اداس رہتا ہے

....

ہے ایک عمر سے جاری یہ رتجگوں کا سفر
ہماری آنکھوں میں نیندوں کا ذائقہ نہ رہا
لائبہ رضوان ---- فیصل آباد
اے دوست میرے ظرف محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

....

بے کار چاہتوں کے تقدس میں وہ مجھے
کچھ نہ ہوا تو ہدیہ تنہائی دے گیا
بخشا ہے ٹھوکروں نے سنبھلنے کا حوصلہ
ہر حادثہ خیال کو گہرائی دے گیا

....

جانے کیا بات تھی اس روز کوئی در نہ کھلا
عمر مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانہ جا ہے
اسماء امجد ---- لاہور
اپنی چاہت میں خود کو کئی خط لکھے
ان کو کھولا پڑھا تہہ کیا رکھ دیا

☆☆☆

بلقیس بھٹی

شہر

ایک دیہاتی شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
''چلو یار شہر کی سیر کر کے آتے ہیں؟''
دوسرا شخص۔
''نہیں میں ایک بار شہر گیا تھا لیکن اب دوبارہ نہیں جاؤں گا۔''
پہلا شخص۔
''کیوں بھلا ایسی کیا بات ہوگئی؟''
دوسرا شخص۔
''شہر میں جگہ جگہ جو ہدایات لکھی ہوتی ہیں ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، پچھلی بار میں شہر گیا تو ایک جگہ تحریر تھا، ''یہاں مت تھوکئے'' مجھے مجبوراً وہاں تھوکنا پڑا، آگے بڑھا تو لکھا ہوا تھا ''ردی کاغذ اس میں ڈالئے'' میں نے سڑک سے ردی کاغذ اٹھا کر ڈال دیئے' ایک اور جگہ لکھا ہوا تھا ''رفتار چالیس میل فی گھنٹہ'' اب تم ہی بتاؤ مجھ جیسا بوڑھا آدمی اتنا تیز کیسے دوڑ سکتا ہے مرتا کیا نہ کرتا میں نے دوڑ لگا دی اور پھر شہر جانے سے توبہ کر لی۔''

رمشا حیدر، کینٹ

بہت ہے

خطا تو ہوگئی پر آپ نے بھی
ذرا سی بات پر ڈانٹا بہت ہے
کلاشنکوف سے تو مت ڈراؤ
مجھے تو ایک ہی چانٹا بہت ہے

سباس گل، رحیم یار خان

چلو اب مسکراؤ

ایک کاہل شخص کے مکان میں آگ لگ گئی، لوگ بجھانے دوڑے لیکن وہ مزے سے بیٹھا رہا، اس پر ایک شخص نے کہا۔
''تعجب ہے تمہارے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہو۔''
کاہل آدمی نے اطمینان سے کہا۔
''آرام سے کہاں بیٹھا ہوں بارش کے لئے دعا کر رہا ہوں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر۔
''آپ اچھے ہو جائیں گے لیکن مجمع میں جانے سے پرہیز کیجئے۔''
مریض۔
''لیکن میں اپنے پیشے سے مجبور ہوں۔''
ڈاکٹر۔
''پیشہ کیا ہے؟''
مریض۔
''جیب تراشی۔''

☆☆☆

استاد کلاس کو بجلی کے بارے میں پڑھا رہا تھا۔
''فرض کرو کہ میں پنکھے کا بٹن آن کروں اور پنکھا نہ چلے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟''
''یہ کہ آپ نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا۔''
شاگرد نے معصومیت سے جواب دیا۔

آسیہ زبیر، عارف والا

ہنسنا منع ہے

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا، دوسرے نے پوچھا۔
''ارے بھئی آج گدھے کو کس خوشی میں نہلا رہے ہو؟''
پہلے نے کہا۔
''آج گدھے کی شادی ہے۔''
دوسرے نے کہا۔
''ہمیں اس خوشی میں کیا کھلاؤ گے؟''
''جو دولہا کھائے گا وہی تم بھی کھا لینا۔''

راشد ترین، مظفر گڑھ

رنگ حنا

بجناں رات اندھیری ہے
سکھیاں بھی بیتری ہیں
بس کمی اک تیری ہے

....

تو اک ایسا لٹیرا ہے
میرے دل میں ٹھہرا ہے
اعتبار بھی بس تیرا ہے

آمنہ خالد، ملتان

ہنی مون

شادی کے بعد میاں بیوی ایک صحت افزا پہاڑی مقام پر ہنی مون پر گئے تو ہوٹل کے منیجر نے نام پوچھے بغیر اندراج کر لیا یہ دیکھ کر بیوی حیران رہ گئی اور کہنے لگی۔
''منیجر صاحب! آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہے؟''
منیجر بولا۔
''آپ کے شوہر ہر سال ہمارے ہوٹل میں ہنی مون مناتے ہیں۔''

مہناز کوثر سومرو، رحیم یار خان

بہت خوب

بیوی بہت تیزی سے گاڑی چلا رہی تھی، شوہر نے اس سے کہا۔
''تم تیزی سے گاڑی کو موڑتی ہو تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''
بیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے تم بھی موڑ پر میری طرح آنکھیں بند کر لیا کرو۔''

عفت علی، سرگودھا

دور اندیشی

ایک صاحب اپنے دوست کے سامنے اپنی بیگم کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔
''کبھی کبھی اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر کی منزل سے نیچے پھینک دوں، مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''
''کیوں؟''
دوست نے کہا۔
''یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔''
''نہیں۔''
ان صاحب نے چڑ کر کہا۔
''سوچتا ہوں اگر وہ بچ گئی تو میرا کیا ہو گا؟''

فرح راؤ، کینٹ

یقین

اگر آپ کے ریڈیو کی باریک سی سوئی رات کی تاریکی میں ہزاروں میل دور کی آواز آپ تک پہنچا سکتی ہے اور اگر سارنگی کے بیٹھے سر سمندروں، پہاڑوں، صحراؤں، دریاؤں اور پرشور شہروں سے پرے پہنچ سکتے ہیں تو پھر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ خدا بھی تو آپ کی دعا سن سکتا ہے۔

پلوشہ خان، چارسدہ

اجازت

پھر بھی میں
...ہا ہوں
...ے کا اک پٹ کھولے
ناول پڑھتے یوں بیٹھی ہو
جیسے گھر میں تم تنہا ہو
کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

عمیر احمد، ساہیوال

اقتباس

صبح ناشتے میں نفسیات، دوپہر کھانے میں نفسیات، اونگھنے میں نفسیات، چھینکنے میں نفسیات، اوہو کیا تمہارے ملک میں اس مضمون سے زیادہ دلچسپی لی جارہی ہے، افسانوں سے لے کر گورکنی تک نفسیات گھسی ہوئی ہے، گورکن کھودتے کھودتے سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ آخر عورتوں نے اس پیشے کو کیوں نہیں اپنایا، سمجھ میں نہیں آتا تو قبر ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی کی راہ لیتا ہے، یونیورسٹی ہاں یونیورسٹی اور وہاں سے فرائڈ فرائڈ کا نعرہ لگاتا ہوا واپس آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے گورکنی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

فرح علی، فیصل آباد

چاند

اپنی روشنی پورے آسمان پر
پھیلا دیتا ہے
لیکن
دل کے داغ
صرف
اپنے سینے تک محدود
رکھتا ہے

یہ جذبے
سرکش ہیں، باغی ہیں
توڑ دیں گے دیواریں رستے کی
کہ
دل کے جذبے ہار مانتے نہیں
اور عقل کا فلسفہ
شکستہ پیچھے کہیں رہ جاتا ہے۔

نبیلہ نعمان، گلبرگ لاہور

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں

☆ وقت کو پیچھے سے مت پکڑو، اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔

☆ وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔ (امام غزالیؒ)

☆ وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کیے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا، اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور بیکار چھوڑ دی جائے تو اس میں خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔ (افلاطون)

☆ وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ (ارسطو)

☆ وقت روئی کے گالوں کی مانند عقل و حکمت کے چرخے میں کات کر اس کے قیمتی پارچہ جات بنالو ورنہ جہالت کی آندھیاں اسے اڑا کر دور پھینک دیں گی۔ (فیثا غورث)

☆ وقت دولت کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ (فرینکلین)

☆ آپ مسرور ہوں یا مغموم تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔ (نپولین بونا پارٹ)

مہناز فاطمہ، خوشاب

☆☆☆

عائشہ شمس: کی ڈائری سے ایک غزل

محبت اک ادھورا سا خواب ہے
جو نہ دکھا تو نصیب ہے جو دکھ گیا تو کمال ہے
محبت اک انوکھا سا کھیل ہے
گر پا لیا تو فتح ہوئی جو نہ پاسکے تو زوال ہے
محبت اک ادھوری سی بات ہے
جو نہ کہہ سکے تو ادب میں صرف گر جو کہہ دیا تو مجال ہے
محبت اک ادھوری برسات ہے
جو جھڑی لگی تو لگی رہی جو رک گئی تو مثال ہے
محبت اک انوکھا سا طلسم ہے
جو طاری ہوا تو یوں ہوا مزار یار پہ دھمال ہے

ایپھا حیدر: کی ڈائری سے ایک نظم

تمہیں جاناں اجازت ہے
کہ ان تاریک راہوں پر
تھکن سی خود میں پاؤ تو
اندھیروں نے کبھی دل ڈوب جائے تو
میرے جلتے ہوئے لمحوں
میرے کنگال ہاتھوں سے چھڑا کے اپنے ہاتھوں کو
فضا کی نغمگی سے تم نئے گیتوں کو چن لینا
حسیں پلکوں کی نوکروں پر نئے کچھ خواب بن لینا
کوئی گر پوچھ لے میرا تو اس سے ذکر مت کرنا
میرے جیون کی جلتی دوپہر سے بے غرض ہو کر
تم اپنی چاندنی راتوں میں جگنو پالتے رہنا
میری تنہائیوں کی وحشتوں کی فکر مت کرنا
تمہیں یہ بھی اجازت ہے
میری ہر یاد کو دل سے کھرچنا اور مٹا دینا
کہ جب چاہو بھلا دینا
مگر اتنی گزارش ہے
اگر ایسا نہ ہو جاناں
تو اچھا ہے

فرواز بیر: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

اگر ہو ممکن
کبھی جو آؤ
تو میرے کمرے
کی سب کتابیں
الٹ پلٹ کر تلاش کرنا
مری پرانی سی ڈائری میں
ورق ورق پہ لکھا ہے
وہ نام تیرا!!
اگر ہو ممکن
تو اس حقیقت کی آگہی پہ
یقین رکھنا کہ خواہشوں کو
جو میں نے حرفوں میں ڈھال رکھا
محبتوں میں کمال رکھا
تمہیں اجازت ہے
مرے حرفوں کے سب صحیفے
وہ ہجر لمحوں کے نقش سارے
جو لکھ چکا ہوں
جلا کے رکھ دو، یا پھاڑ ڈالو
تمہیں یہ حق ہے
میں آخری حرف وقت آخر
جو لکھ رہا ہوں
مری نگاہوں کے زرد آنسو
گواہی دیں گے
کہ میں نے کتنی اذیتوں سے
یہ دن گزارے
مگر حقیقت تو یہ ہے جاناں
کہ میری چاہت کو تم بھی بالکل سمجھ نہ پائی

یہی کہوں گا
مری صداقت اسی میں ہے
کہ
مجھے محبت تمہی سے ہے
نومیہ وقاص: کی ڈائری سے ایک غزل
چھوڑ کر تجھ کو گیا وہ بھی کہ جس پر مان تھا
کیوں مکیں کہتے ہو اس کو وہ تو اک مہمان تھا
وہ تو شہرت کے حوالے سے تھا حاتم طائی سا
لوٹنا اس آدمی کو کس قدر آسان تھا
کہتے ہیں کہ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں
جس نے مسلی ہیں یہ کلیاں وہ ایک شیطان تھا
کس لئے پھرتی ہے صحراؤں میں بل کھاتی ہوئی
دھوپ جو دے کر گیا تجھ کو وہ سائبان تھا
دل سے کچے گھر کو وہ اشکوں کی بارش دے گیا
جو میرا دل تھا میری آنکھیں تھا میری جان تھا
لے گیا جذبوں کی پونجی اور دعا دے کر گیا
روتی ہے اس کے لئے کیوں وہ تو اک نادان تھا
روح میں خانم سکوں کا اک خزانہ آ گیا
سایہ ہے جس کا تیرے دل پر وہ اک قرآن تھا
فرح ظفر: کی ڈائری سے خوبصورت غزل
نئے رستوں پہ چلنا چاہتا ہوں
ہوا کا رخ بدلنا چاہتا ہوں
نہ کرو مجھ پر اندھیروں کو مسلط
میں سورج ہوں نکلنا چاہتا ہوں
کسی کے تجربوں کا کیا بھروسہ
میں خود کو تو بدل سکتا نہیں ہوں
میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتا ہوں
پہن رکھا ہے کانٹوں کا لبادہ
مگر پھولوں پہ چلنا چاہتا ہوں
میں ہوں فیضان لفظوں کا سمندر
خزانوں کو اگلنا چاہتا ہوں
فریحہ تبسم: کی ڈائری سے ایک نظم
"کونج"

پرے دل کی ڈوری تھام کہ
میں چلی پل صراط پر
مرے آس پاس اندھیرا ہے
ہر جانب سایہ تیرا ہے
مجھے خبر نہ ارد گرد کی
آنکھوں میں بیٹھی تتلیاں درد کی
میری سانج سونی شام دے
آ تو بھی دل کی دوری تھام لے
تو بدل دے رنگ جدائیوں کے
آ ملن کے لمحے
سنگ میرے گزار دے
شحرش خان: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
"اعتبار"
اک اداس کمرے میں
رات کے اندھیرے میں
سوچ کے دریچوں میں
یاد کے جھروکوں میں
اک دیا سا جلتا ہے
سوچتا ہوں کس طرح
اس نے زندگانی کو
دکھ بھری کہانی کو
معتبر بنایا ہے
مختصر بنایا ہے
پھر تمام سوچوں کی
کرچیاں سمٹ گئیں
فاصلوں میں بٹ گئیں
اس لئے تو کہتا ہوں
پیار سے جدائی میں
فنا کا شوق ہے تو پھر
مے کشی ضروری ہے
خودکشی ضروری ہے
قضا سے خوف ہے تو پھر
کبھی کسی کی چاہت پہ
اعتبار مت کرنا

اور
پیار مت کرنا
رابعہ اسلم: کی ڈائری سے ایک نظم
اذیتوں کے تمام نشتر
میری رگوں میں
اتار کر
وہ بڑی محبت سے پوچھتا ہے
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟
عائشہ عباس: کی ڈائری سے ایک نظم
میں زندگی کی اداس وسعتوں میں الجھ گیا ہوں
میں لمحہ لمحہ بکھر گیا ہوں
میرے لہو میں سمٹے جانے کی اک خواہش
سی اک رہی ہے
ہر ایک تمنا سلگ رہی ہے
تمہیں شریک سفر بنا لوں
لیکن میں دنیا کو جانتا ہوں
کہ میری سوچیں حقیقتوں کے
لہو سمندر میں نہا چکی ہے
میں سوچتا ہوں
تیرے سارے
خواب ریشمی ہیں
تو میرا کھدرر فاقتوں کا
بھرم کہیں بھی نہ رکھ سکے گا
مہناز کوثر: کی ڈائری سے ایک نظم
"تمہی تو ہو"
تنہائی میں جس کی خاطر روئے
وہ حسین یاد تم ہی تو ہو
محفل میں ہنسے جس کی خاطر
وہ خوبصورت بات تم ہی تو ہو
جس کے پیچھے بھاگے عمر بھر
وہ حسین خواب تمہی ہی تو ہو
جس خواہش کے لئے بھٹکے در بدر
وہ دلفریب تعبیر تم ہی تو ہو
کیا کہوں تم میرے لئے کیا ہو

میری زندگی، میری ہر خوشی تم ہی تو ہو
سپاس گل: کی ڈائری سے ایک غزل
محبتیں بے حساب دینا
کبھی تو خط کا جواب دینا
پہلے قربتوں سے نہال کرنا
پھر دوریوں کے عذاب دینا
وہ بے وفائی میں باوفا ہے
کوئی تو اس کو خطاب دینا
وہ لاکھ دشمن جاں بنے
تم نہ دشمنوں سا جواب دینا
وہ سنگ ہاتھوں میں لے کے آئے
تم تب بھی اس کو گلاب دینا
جو نفرتوں کے امین ٹھہرے
انہیں چاہتوں کے سراب دینا
اتنا آساں نہیں ہے گل
بے خواب آنکھوں کو خواب دینا
فریحہ اقبال: کی ڈائری سے ایک غزل
تیری یادیں سنبھال رکھتے ہیں
تم تو یہ بھی کمال رکھتے ہیں
تم بھی اپنے عروج پر رہنا
خود کو ہم لازوال رکھتے ہیں
ان کے بارے میں یہ سنا ہے کہ وہ
مورنی جیسی چال رکھتے ہیں
سال میں چاہے چار دن ہی سہی
ربط ان سے بحال رکھتے ہیں
آزماؤ تم اپنی نفرت کو
ہم محبت کی ڈھال رکھتے ہیں
آج ملنے وہ آئیں گے فرحان
موت کو کل پہ ٹال رکھتے ہیں

☆☆☆

حنا کی محفل

عین غین

انشاں اشرف ------ عارف والا
س: عین غین بھیا دل کا دروازہ کس طرف ہوتا ہے؟
ج: آنکھوں کی طرف۔
س: عین غین بھیا سر پر کتنے بال ہوتے ہیں؟ اگر آپ کے ہیں تو گن کر بتائیں؟
ج: جتنے آسمان پر ستارے نظر آتے ہیں اگر آپ کی آنکھیں ہیں تو گن لیں۔
س: عین غین بھیا سنا ہے آپ اپریل میں اپنی سوویں سال گرہ منا رہے ہیں؟ کیا واقعی؟
ج: یہ آپ کو خواب آیا ہے۔
س: عین غین یکم اپریل کو "ان" سے کیا شرارت کروں؟
ج: "ان" کے سامنے آجانا وہ ڈر جائیں گے۔

آصفہ انبساط نائیک ------ حافظ آباد شی
س: "مدت ہوئی ہے آپ کو پریشان کئے ہوئے" اگلا مصرع لکھیں تو جانیں؟
ج: اس لیے پھر تنگ کرنے آگئے ہیں ہم۔
س: الو غنو جی کل آپ کو انگلیوں پہ کون نچا رہا تھا؟
ج: وہی جو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر آپ کو نچا رہا تھا۔
س: میرے بی۔اے کے پیپرز سر پر ہیں کوئی جلدی سے ایسا وظیفہ بتائیں پیپرز بھی دے دوں اور فیل بھی نہ ہوں؟
ج: محنت کا وظیفہ کرو۔
س: اصول اور فضول میں کیا بنیادی فرق ہے؟
ج: اگر اصول آپ کو اچھا انسان بناتا ہے تو اصول ہے ورگرنہ فضول ہے۔

ڈاکٹر واجد ------ ملیر کالونی
س: عقلمندی اور بیوقوفی میں کتنا فاصلہ ہے؟
ج: بہت کم۔
س: کبھی کی دن بڑے کبھی کی راتیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
ج: نیک خیال ہے۔

رابعہ اسلم ------ رحیم یار خان
س: مائیکل جیکسن کی روح یہ بتا کل تو لنڈے بازار کی طرف کیوں جا رہا تھا؟
ج: مائیکل جیکسن مر گیا۔۔۔۔؟ اچھا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔
س: ہائے ٹونی ناراض تو مت ہو بلت سنو نجانے کیوں تم بڑے اپنے اپنے سے لگتے ہو؟
ج: لگتا ہے کہ ٹونی کا خط تم نے غلطی سے مجھے بھیج دیا ہے ویسے یہ ٹونی تمہیں اپنا کیوں لگتا ہے کہیں تم بھی تو۔۔۔۔؟
س: اپنی ایک تصویر لفافے میں رکھ کر بھجوا دو؟
ج: تصویر کا کیا کرنا ہے؟
س: سن وے بلوری اکھ والیا۔۔۔ بھلا کیا؟
ج: آگے پورا گانا سن لو۔
س: میرا شعور بہلتا نہیں ہے لفظوں سے؟
ج: رحیم یار خان بہت دور ہے کیا کروں۔

سمیرا انور ------ رحیم یار خان
س: صرف ایک بات پوچھنا تھی اگر محبت پر ٹیکس لگ جائے تو؟
ج: گرلز کالجوں کے دروازے سے رش ختم ہو جائے گا۔

ساجد عباس اعوان ------ حافظ آباد شی
س: مسٹر عبداللہ ایک مدت بعد اس محفل میں حاضر ہوں کیا ساچار ہیں کیسے رہے اتنا عرصہ کیا کبھی ہماری یاد آئی؟
ج: دوبارہ خوش آمدید۔ ساچار سننے ہیں تو ٹی وی لگالو۔
س: تمہاری سوال پہ سوال کرنے کی عادت نہ گئی پچھلی بار آمنہ کاظمی نے پوچھا دنیا تمہیں اس موڑ پہ لے آئے گی تمہارا جواب تھا کس موڑ پر۔ جواب دیا کرو سوال نہ کیا کرو؟
ج: بہتر تم آمنہ کاظمی کی طرف سے کیوں پوچھ رہے ہو کہیں۔۔۔۔؟
س: میری روح کی دھرتی پر ہی دکھوں کی فصل کیوں لگتی ہے؟
ج: دھرتی پر جس کا بیج بوؤ گے وہی فصل اگے گی۔
س: اجاڑنے والے بھی کیوں اکثر بھول جاتے ہیں؟
ج: اگر بھولیں نہ تو ان کا جینا حرام ہو جائے۔

محمد سعید نوئی ------ عارف والا
س: ہیلو مسٹر عین غین تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے کیوں نہیں؟
ج: ایک ہاتھ سے بھی بج سکتی ہے ذرا ہاتھ زور سے اپنے منہ پر تو مارو۔
س: اے مسٹر عورت یہ کب کہتی ہے "لگیاں دے دکھ وکھرے"؟
ج: جب کوئی تم جیسا ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی کوشش کرتا ہے۔
س: ارے دل دے جانی ناراض ہو گئے ہوں تینوں لگن تے فیر میں پوچھاں؟
ج: میں نے ناراض کیوں ہونا ہے تالی تو تم نے بجائی ہے۔

رانا محمد بہزاد ------ عارف والا
س: عین غین جی قربانی کے جانور کو تو اس لیے سجایا جاتا ہے کہ اس کا آخری وقت قریب ہوتا ہے مگر دلہن کو اس طرح سجانا کیا ظاہر کرتا ہے؟
ج: کہ دولہے کا وقت قریب ہے۔
س: عین غین جی میری ساس مجھے اس واسطے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں کیونکہ پھر میں ان کی بیٹی کا بھائی لگوں گا پلیز اس کا کوئی حل بتایئے؟
ج: تم بھی اپنی ساس کو ماں نہ سمجھنا ورگرنہ ان کی بیٹی تمہاری بہن لگے گی۔
س: لگتا ہے بڑھاپے نے آپ کے جواب دینے کی سکت پر قبضہ جمالیا ہے اگر ایسا ہے تو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم مر گئے ہیں کیا؟
ج: اسی کی تو فکر ہے۔
س: کہتے ہیں کہ کسی کو ذلیل کرنا ہو تو اسے الیکشن میں کھڑا کر دیں یا پھر پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا دیں۔ ان دونوں میں سے آپ کون سی سیٹ لینا پسند کریں گے؟ (صرف اپنی بات کرنی ہے)
ج: میں تو کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا پسند کروں گا کیونکہ الیکشن میں کھڑے ہو کر جو تمہارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تو میری توبہ۔

مہتاز کوثر سومرو ------ رحیم یار خاں
س: عین غین جی آداب محبت؟
ج: تسلیم۔
س: محبت میں دل ہی کی چلتی ہے دماغ کیوں نہیں؟
ج: اگر دماغ کی چلتی ہوتی تو تم ایسے سوال نہ کرتے۔
س: وہ نہ ڈاکٹر ہو' نہ انجینئر ہو' نہ وکیل ہو وہ تو بس۔۔۔۔؟
ج: انسان ہو۔
س: میں جب بھی باتیں کرتی ہوں وہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں بتائیں کیوں؟
ج: تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو کہ۔

☆ ☆ ☆

آؤ دسترخوان

افراح طارق

پیچ ٹوپڈ پنیر سلاد

اشیاء

آڑو	دو عدد گول
ایپل جام	ایک کھانے کا چمچہ
مکس ڈرائی فروٹ	نصف کپ
کریم	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	پانچ کھانے کے چمچ
پنیر	ڈیڑھ کپ

ترکیب

آڑو کے چار پیس کرلیں، ایک دیگچی لیں اس میں چار چمچے چینی اور چار چمچے پانی ڈال کر چولہے پر رکھ کر ایک ابال دلائیں، اس کے بعد اس میں آڑو ڈال کر پکالیں، احتیاط سے کہ آڑو ٹوٹنے نہ پائیں، جب چینی کا پانی خشک ہو جائے تو دیگچی چولہے سے نیچے اتارلیں۔

ایک پیالی لیں اس میں کریم ایک چمچہ چینی، پنیر اور جام ڈال کر ساتھ ہی ڈرائی فروٹ بھی ڈال دیں پھر ان سب کو آپس میں مکس کرلیں، آڑو ٹھنڈے ہو جائیں تو انہیں ایک باؤل میں رکھ کر اس میں کریم اور پنیر کا آمیزہ اس طرح بھریں کہ وہ چوٹی کی طرح ہو جائے، لذیز پیچ ٹوپڈ پنیر تیار ہے۔

مزے دار سلاد

اشیاء

کاہو (سلاد کا پودا)	ایک پھول
شملہ مرچ	ایک عدد
ٹماٹر	تین عدد
پنیر	آدھا پاؤ
گوشت کے ٹکڑے	ایک پاؤ
تیل	تین کھانے کے چمچے
سیب کا جوس	تین کھانے کے چمچے
نمک	نصف کھانے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

کاہو کے پھول سے پتوں کو علیحدہ کر کے ان کو اچھی طرح صاف کر کے ایک طرف رکھ لیں، ان پتوں کو ایسے برتن میں ڈال کر رکھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں تا کہ ان پر لگا ہوا پانی بھی نیچے گر جائے اور پتیاں بالکل خشک ہو جائیں۔

شملہ مرچ کا تمام گودا اور بیج اس میں سے نکال لیں اور اس طرح باقی صرف خول رہ جائے گا، پھر اس خول کے لمبائی کے رخ ٹکڑے کرلیں اور اس طرح کہ ایک ٹماٹر کے آٹھ ٹکڑے بن جائیں، پنیر اور ابلے ہوئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں اور سلاد کے پتے کاٹ لیں پھر سلاد کے پتے، ٹماٹر، پنیر، گوشت، ہری مرچ کے ٹکڑے ایک بڑے پیالے میں ڈالی لیں، اس کے بعد ان چیزوں میں تیل، سیب کا جوس، نمک، کالی مرچ، چینی ڈال دیں ان تمام کو اچھی طرح ملا دیں، سلاد تیار ہے، یہ سلاد چار افراد کے لئے کافی ہے۔

دہی و سبزیوں کا سلاد

اشیاء

دہی	آدھ کلو
آلو ابلے ہوئے	تین عدد
پیاز باریک کتری کٹی ہوئی	ایک پیالی
کھیرا	دو عدد
نمک کالی مرچ پسی ہوئی	حسب ذائقہ
مرغی ابلی ہوئی	چند ٹکڑے

ترکیب

مرغی کے باریک ٹکڑے کرلیں، ابلے ہوئے آلو کش کرلیں، ایک عدد کھیرا، کش کرلیں، دوسرے کھیرے کے پتلے ٹکڑے کرلیں، ایک کھلے منہ کے پیالے میں دہی ڈال کر پھینٹ لیں، دہی میں آلو اور کٹی ہوئی پیاز ڈال کر پھینٹیں، ساتھ نمک اور کالی مرچ شامل کردیں، دہی میں مرغی کے ٹکڑے اور کش کیا ہوا کھیرا ڈال کر یکجا کر لیں، ڈش میں دہی کا آمیزہ ڈالیں، دہی کے آمیزے پر کٹا ہوا کھیرا رکھ دیں، عمدہ ترین اور لذت سے بھرپور سلاد تیار ہے، تناول فرمائیں۔

پوٹیٹو سلاد جرمن

اشیاء

آلو	چھ عدد
ٹماٹر سلائس کیا ہوا	ایک عدد
آٹا	چار بڑے چمچے
پانی	ایک چوتھائی کپ
پنیر	ایک پاؤ
سرکہ	آدھا کپ
تازہ دھنیا کے پتے	ایک بڑا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کھیرا سلائس کیا ہوا	ایک عدد
پیاز سلائس کیا ہوا	ایک عدد
لیموں و پودینہ کے پتے	سجاوٹ کے لئے
شکر	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب

سب سے پہلے آلوؤں کو ابال لیں اور ٹھنڈا ہونے لگے تو انہیں چھیل لیں، اس کے بعد انہیں باریک سلائس کی شکل میں کاٹ کر ایک بڑے پیالے میں ڈال دیں اور پھر اس میں شکر اور آٹا شامل کرلیں، اس کے بعد اس میں نمک اور سیاہ مرچ بھی ڈال دیں اور پھر بتدریج اس میں سرکہ اور پانی بھی ڈالتے جائیں اور چمچہ چلاتے جائیں، جب گاڑھا ہو جائے تو اس مکسچر کو آلو والے پیالے میں انڈیل دیں، کھیرا، ٹماٹر، لیموں اور پودینہ کے پتے سے سجا کر پیش کریں، بہت ہی عمدہ اور ذائقے سے بھرپور صحت بخش سلاد ہے۔

بارلے ود چکن سلاد

اشیاء

بارلے (جو)	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
چکن ٹکڑے	آدھا کلوگرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
سلاد کے پتے	چند عدد
پانی	حسب ضرورت
ادرک پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
سیسم آئل	سات ملی لیٹر

ترکیب

مرغ کے ٹکڑے اور بارلے (جو) پانی میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکالیا جائے اور جب تھوڑا سا پانی باقی رہ جائے تو اسے چھان لیں اور گوشت کے ٹکڑے نکال کر پلیٹ میں رکھ لیں، اس کے بعد اسے اس پانی میں پکالیں جو پھینک دیں اور پھر اس میں ادرک اور پیاز ڈال کر چکنے کے لئے

رکھ دیں، کچھ دیر بعد اسے اتار لیں اور گوشت کے ٹکڑوں کو پلیٹ میں ڈال کر پسی ہوئی سیاہ مرچ اور نمک چھڑک دیں، پھر اس کے اوپر سرکہ ڈال دیں، اس کے بعد اس پر سیسم آئل چھڑک دیں اور خوب اچھی طرح سے ہلائیں اور پھر اس پر سلاد کے پتے ڈال کر نان کے ساتھ تناول فرمائیں، بہت ہی مزے دار اور پر لطف سلاد ہے۔

ریڈ بین سلاد

اشیاء

ریڈ بین فلنگ کے لئے	پندرہ گرام
ریڈ بین سرخ پھلیاں	پانچ گرام
پیاز لچھے دار کاٹیں	چند عدد
سوڈا واٹر	تین سو ملی لیٹر
سلاد کے پتے	چند عدد
وائٹ گرینولیٹڈ شوگر	چھ گرام
ادرک کٹا ہوا	دس گرام
مونگ پھلی کا تیل	ڈیڑھ لیٹر
سرکہ	چالیس لیٹر
سیسم آئل	دس ملی لیٹر
چینی	بیس گرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے ریڈ بینز یعنی سرخ پھلیوں کو دھو کر صاف کر لیں اور پھر ان کو ایک گہرے برتن میں ڈال دیں، پھر اس قدر پانی ڈالیں کہ اس سے پھلیاں اچھی طرح سے ڈھک جائیں، ہلکی آنچ پر ابال لیں اور صرف اس قدر ابالیں کہ پھلیاں نرم ہو جانی چاہئیں، سوڈا ڈالنے سے پھلیاں جلد اور کافی نرم ہو جاتی ہیں، اس کے بعد پھلیوں کو کچومر نکال کر ان کا پیسٹ بنا لیں اور پھر اس پیسٹ کو کپڑے کی تھیلی میں ڈال دیں، پھر اسے بند کر کے زور سے دبائیں اور اس میں موجود تمام مواد نکال دیں۔

پھر مونگ پھلی کے تیل کو ایک ساس پین میں گرم کر لیں اور جب تیل اچھی طرح سے گرم ہو جائے تو پھر اس میں بین پیسٹ ڈال کر فرائی کر لیں، یہاں تک کہ پیسٹ خشک ہو جائے اور لیس دار بھی ہو جائے، اس کے بعد تیز چھری سے اس کے ٹکڑے کر لیں اور اس پر سلاد کے پتے ڈال دیں، اس کے بعد سرکہ اور چینی ایک پیالے میں ڈال کر اسے اچھی طرح سے مکس کر کے چینی سی بنالی جائے اور پھر لچھے دار کٹا ہوا پیاز پیسٹ کے ٹکڑوں پر پھیلا دیا جائے، اس کے بعد اس پر سرکے والی چینی ڈال دی جائے اور اس پر کٹا ہوا ادرک اور سیسم آئل ڈال دیں، اس کے بعد نان اور روسٹ گوشت کے ساتھ پیش کریں، سلاد کی عمدہ ترین اور لذت سے بھرپور ڈش تناول فرمائیں۔

کبابی مٹن

اشیاء

مٹن	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پسی ہوئی پیاز	نصف کپ
پسی ادرک	ایک چائے کا چمچ
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

تیل کے علاوہ تمام اشیاء کو مٹن میں ملا کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ چھوڑیں پھر اسے ابال لیں، جب گوشت گل جائے تو گرم تیل میں مٹن تل لیں، جب سنہری ہو جائے تو نان کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆☆

السلام علیکم!

جون کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

کسی بھی کام کی کامیابی میں صلاحیت، محنت، یقین، اعتماد اور مہارت کے ساتھ ساتھ مثبت سوچ اور تعمیری جذبہ بھی بے حد کارفرما ہوتا ہے، اچھی سوچ اچھے عمل کی بنیاد ہے، صحیح راستوں کا تعین اور ان پر اس پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ سفر حقیقی کامیابی کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے، کامیابی کے لئے ایک اور بات جو بے حد اہمیت رکھتی ہے وہ ہے ہمارے آس پاس رہنے والے ہمیں محبتوں سے نوازنے والے کی طرف حوصلہ افزائی اور تعریف و تحسین جو کہ ہمیں مزید کامیابیوں کی طرف بڑھنے کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے۔

حنا آج مقبولیت اور پسندیدگی کی جس شاہراہ پر گامزن ہے، اس میں ہماری شب و روز کی محنت کے ساتھ ساتھ آپ سب کی حوصلہ افزائی کا بھی بڑا حصہ ہے، بہنیں جب کہتی ہے کہ ''حنا'' سے ہمیں قدم قدم پر راہنمائی ملتی ہے تو یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہوتی ہے۔

''حنا'' کی تیاری کے دوران ہم اپنے قارئین کو اپنے ساتھ پاتے ہیں، آپ ہمیں اپنے قیمتی مشوروں کے ساتھ ساتھ اپنی رائے سے ضرور نوازا کریں، آپ کی تعریف و تنقید دونوں ہمارے لئے بے حد اہم ہے، آپ دوستوں کی رائے کی روشنی میں ہم حنا کو سجاتے سنوارتے ہیں۔

خوش رہیے اور ان کو بھی خوش رکھیں جو آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا اور اپنا بہت سا خیال رکھیے گا، اس عہد کے ساتھ کہ۔

درود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کو ہم نے اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنانا ہے اسی میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

آیئے آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں، یہ پہلا خط ہمیں واہ کینٹ سے رعنا حیدر کا ملا ہے وہ لکھتی ہیں۔

مئی کا شمارہ ہمسایہ ممالک کی ماڈل سے سجا دیکھ کر انتہائی ناگوار لگا، (معذرت) پسند اپنی اپنی۔

آگے بڑھے اور سردار صاحب کو پولیو کے حوالے سے محو گفتگو پایا، بڑے اچھے انداز میں انہوں نے مسئلہ کو اجاگر کیا، حمد و نعت اور پیارے نبیؐ کی پیاری محفل میں قلب و روح کو سکون ملا، ''ایک دن حنا کے ساتھ'' میں ثمینہ بٹ صاحبہ سے ملاقات ہوئی، اچھا لگا، سلسلے وار ناول ''آخری جزیرہ'' کی قسط اس بار کچھ خاص نہیں تھی وہی معاذ اور پرنیاں کی غلط فہمیاں زینب کی ہٹ دھرمی، اُم مریم پلیز کہانی کو کچھ آگے بڑھایئے اب، یہ سدرہ جی کیوں غائب ہیں اس ماہ ''اک جہاں اور ہے'' کے سفر پر بریک کیوں؟ مکمل ناول تین عدد تھے، ''میرے ہم سفر میرے مہربان'' رمشا

[illegible]
آپ کی اس طرح کی تحریریں لکھتی رہیں اور ہمیں پڑھنے کے لئے دیتی رہیے، سباس گل ایک عرصے کے بعد اپنی کسی طویل تحریر کے ساتھ آئی، اچھا لکھا ہمیشہ کی طرح رومان سے بھرپور سباس گل کی تحریر ہو اور اس میں محبتوں کی چاشنی نہ ہو کیسے ہو سکتا ہے؟ فرحت عمران کے ناول کا عنوان ''تم دل میں بستے'' زیادہ پسند آیا تحریر کی نسبت، بہرحال اچھی کوشش تھی فرحت کی طویل تحریر لکھنے کی۔

ناولٹ ''کاسہ دل'' میں اب سندس جبیں صاحبہ نیا پن نہیں لا رہی، ایک ماہ کے وقفے سے آئی ہیں تحریر میں کوئی دلچسپی والی چیز نہیں، سندس جبیں جی اپنے اندر سے اصل والی سندس کو جگائیے اور پلیز اب اپنے ناول کو مزید طویل مت کریں۔

تحسین اختر کا ''اک سمندر میرے اندر'' بے حد پسند آیا تحسین جی کہاں غائب رہتی ہیں، آپ کی تحریروں میں اب لمبے لمبے وقفے آنے لگے ہیں، افسانے سبھی اچھے تھے، عزہ خالد، کنول ریاض، حمیرا خان کی تحریروں میں پختگی نظر آئی جبکہ حیا بخاری، حنا اصغر اور عمارہ امداد نے بے حد اچھا لکھا۔

سیمیں کرن صاحبہ کا طاہر نقوی کی کتاب پر تبصرہ بے حد پسند آیا بڑے اچھے انداز میں انہوں نے پوری کتاب کا احاطہ تین صفحات میں کیا، شگفتہ شاہ کا سلسلہ ''چٹکیاں'' بھی بے حد اچھا ہے، بڑی خوبصورتی سے وہ بڑے بڑے مسائل کو چند لائنوں میں رقم کرتی ہے اور بڑے خوبصورت انداز میں۔

مستقل سلسلے تمام پسند آئے، خصوصاً کس قیامت کے یہ نامے والا سلسلہ تو مجھے بڑا پسند ہے

ان کی پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں اس امید پر کے آپ کی محبتوں پر ہمارا بھی حق ہے۔

رعنا حیدر اس محفل میں خوش آمدید، مئی کا شمارہ آپ کے ذوق پر پورا اترا یہ بات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے، آپ کی پسندیدگی تمام مصنفین کو پہنچا دی ہے شکریہ قبول کریں، اپنی رائے اور محبتوں سے نوازتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

ثمینہ بٹ: لاہور سے لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے سرورق تو وہ مجھے پسند نہیں آیا، معذرت کے ساتھ۔

سردار سر کی باتیں ہمیشہ کی طرح بے مثال اور سیدھی دل میں اترتی ہوئی تھیں اور بالکل حسب حال بھی۔

جناب ریاض محمود صاحب گو کہ آج ہم میں نہیں لیکن ان سمیت ان کے تمام ساتھیوں (چاند پبلی کیشنز) کے ہاتھوں لگائے گئے ان حسین گلدستوں (حنا، شعاع، کرن، خواتین وغیرہ) کی خوشبو سے ادبی دنیا کے ایوان آج تک مہک رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ اللہ پاک محمود ریاض صاحب کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت بریں کے اعلیٰ ترین مقامات عطا فرمائے آمین۔

منیر نیازی اور ناصر کاظمی کی حمد باری تعالیٰ اور ہدیہ نعت رسول مقبولؐ ماشا اللہ بے حد اچھی اور دل پذیر تھیں، پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں میں سید اختر ناز صاحب نے حقوق العباد کے حوالے سے بے حد اچھی اور خوبصورت احادیث بتائیں، بہت شکریہ سید اختر ناز صاحب، جزاک اللہ۔

اور کچھ اِدھر اُدھر سے ابن انشاء اپنے خوبصورت، دلنشین انداز بیاں کے ساتھ کچھ ایسے

آئے کہ بس چھا گئے، بہت خوبصورت تحریر اور جناب افسانے اس بار چھ تھے، اور کیا خوب تھے۔

میں سب سے پہلے بات کرنا چاہوں گی ''عمارہ امداد'' کی چھوٹی سی بات کی، ویلڈن عمارہ آپ نے بہت اچھا لکھا۔

''حمیرا خان'' کی پہلی اور آخری قسط بھی خوب تھی، بات پھر وہ ہی آجاتی کہ نئے گھر، نئی جگہ سسرال میں اپنی جگہ بنانے کے لئے عموماً لڑکی کو ہی جدوجہد اور محنت کرنا پڑتی ہے۔

بہت خوب حمیرا آپ نے اچھی کوشش کی اور اس کے لئے آپ یقیناً مبارکباد کی مستحق ہیں، ''مانگتے پھرو گے غرور اپنا'' عزہ خالد، فیوڈل لارڈز کے ظلم کی کہانی جو وہ خود کو خدا سمجھتے ہوئے اپنے سے کم حیثیت کے لوگوں پہ ظلم ڈھاتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔

''اعتبار'' کنول ریاض کی اچھی تحریر تھی، واقعی ایک بار اگر اعتبار کھو جائے تو پھر اسے بحال کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، باقی کے دونوں افسانے بھی ٹھیک ہی تھے، حنا اصغر کے ''روشن راستے'' کافی اندھیری اور تعفن زدہ گلیوں میں سے ہو کر نکلے۔

''حیا بخاری'' کا ''احساس زیاں'' بھی عجیب سے احساس میں مبتلا کر گیا، ایک ماں ہونے کے ناطے، اتنا تو میں بھی وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اپنی ساری اولاد میں سے کسی ایک کو بہت زیادہ اہمیت دینا ممتا کی کھلی نفی اور توہین ہے، بہرحال ایک بہت حساس مسئلہ جس پر حیا نے بڑی روانی سے خوبصورتی سے قلم اٹھایا۔

ناولٹ اس بار دو ہی تھے، ''کاسہ دل'' سندس جبیں نے اس قسط میں بھی کچھ اسرار کھولے، کچھ ان کھلے رہنے دیئے، یہ قسط بھی اچھی تھی، اب اگلی قسط کا انتظار ہے اور پلیز ''سندس'' غائب مت ہو جایا کیجئے اور کہانی کی رفتار بھی ذرا بڑھا دیں تاکہ کہانی کے خدوخال پوری طرح واضح ہو سکیں اور دوسرا ناولٹ ''اک سمندر میرے اندر'' تحسین اختر کی بہت اچھی کاوش رہی، ''شارٹ کٹ'' کی تلاش اور وقت سے پہلے اور مقدر سے زیادہ کی چاہ انسان کو کس قدر تیزی سے اور کس قدر گہرائی میں لے جاتی ہے، ابرار کا حال دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو گیا۔

تحسین اختر کی بہت اچھی تحریر اور اس میں شامل شاعری بھی بہت اعلیٰ اور دل کو چھو لینے والی تھی۔

ناولز میں فرحت عمران کا ''تم دل میں بستے ہو'' باقی دونوں ناولز پر بازی لے گیا، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے قسمت ہمارے لئے بہترین اور خوبصورت راستہ چنتی ہے مگر ہم اپنی عاقبت نا اندیشی کی بدولت اسے پہچان نہیں پاتے، ویری ویلڈن فرحت، ایک اچھے موضوع پر اچھے انداز میں ناول لکھنے پر میری طرف سے بہت بہت مبارکباد قبول کیجئے۔

رمشا احمد کا ''میرے ہم سفر میرے مہربان'' اور سباس گل کا ''محبت مان دیتی ہے'' اپنی اپنی جگہ پر اچھی کاوش تھیں۔

''ذی فائیو'' کی شرارتیں بھی مزہ دے گئیں اور ان کی دوستی بھی اچھی لگی۔

سباس گل کی ''محبت مان دیتی ہے'' حسب روایات محبتوں کے رنگوں میں ڈوبی ہوئی تحریر، سباس گل بہت اچھی لکھتی ہیں، ان کی تحریر کا ایک خوبصورت اور مخصوص انداز ہوتا ہے اور رومانس تو شاید ختم ہے سباس گل پر، اپنے نام کی طرح خوبصورت اور دلنشین خوشبو بکھیرتی ہوئی تحریریں

ہوئی ہیں ان کی اور یہ بھی ان میں سے ایک تھی، مبارکباد۔

"اُم مریم" اپنے ناول کو خوبصورتی سے اختتام کی طرف لے جارہی ہیں، زینب کو اپنے غلط فیصلے اور غلطی کی بہت کڑی قیمت چکانی پڑی، مگر معاذ بھی وہ ہی غلطی دہرانے چلا ہے، بہت غلط ہے، بہت ہی غلط، خیر دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے، ام مریم نے یقیناً پرنیاں کے لئے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا، چلیں اگلی بار سہی۔

باقی تمام سلسلے بھی حسب روایت شاندار رہے، شگفتہ بھٹی کی "چٹکیاں" ذہن اور شعور پر پڑے پردے ہٹانے میں کامیاب رہیں اور سیمیں کرن کا اس بار ایک اور خوبصورت کتاب "کوؤں کی بستی میں اک آدمی" پر بے حد خوبصورت اور جامع تبصرہ بے حد پسند آیا، بہت خوب سیمیں اتنی اچھی کتاب پر اتنا بہترین تعارف ورتبصرہ پیش کرنے پر شکریہ۔

اس کے علاوہ باقی کے تمام سلسلے اور ان میں ...مل تمام تحریریں بھی بے مثال تھیں، خاص طور ...ے "میری ڈائری" کے لئے صائمہ محمود نے جو ...لام چنا، وہ اعلیٰ ترین تھا اور آخر میں جناب کس ...مت کے یہ نامے جی جناب یہ تو واقعی بے حد ...ردست اور خوبصورت ہوتے ہیں، حنا سے آپ ...ے پورے حنا کے پیارے پیارے اسٹاف سے ...ا بے لوث محبت اور پیار کا اظہار لئے یہ حسین ...دلنشین نامے واقعی بے مثال ہوتے ہیں۔

ثمینہ بٹ صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ حنا کو پسند ...نے کا شکریہ آپ نے رمشا احمد کی تحریر کا اپنی ...ی زندگی سے موازنہ کیا، آپ خود مصنفہ ہے ...چھی طرح جانتی ہیں افسانے اور حقیقت میں ...ایاں فرق ہوتا ہے طویل ناولٹ کے سلسلے ...ہم یہی کہیں گے کہ آپ اطمینان کے ساتھ اسے لکھیں پھر ہمیں مکمل بھجوائیں، باری آنے پر شائع کریں گے، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ۔

زویا حسن: کی ای میل سرگودھا سے موصول ہوئی وہ لکھتی ہیں۔

مئی کا ٹائٹل پسند آیا، سردار صاحب کی باتیں بڑی اچھی ہوتی ہیں، حمد ونعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں کو پڑھ کر دل ودماغ کو روحانی سکون ملا، ایک دن میں ثمینہ بٹ سے ملاقات اچھی لگی، سلسلے وار ناول "تم آخری جزیرہ ہو" کی یہ قسط بھی دلچسپ رہی، سدرہ جی غائب کیوں؟ سندس جبیں کا ناولٹ بھی بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے، بس مصنفہ کا ہر دو ماہ بعد غائب ہونا اچھا نہیں لگتا، مکمل ناول اس مرتبہ تینوں ہی بہترین تھے، خاص طور پر رمشا احمد کا، دوستوں اور کزن کی نوک جھونک مزہ دے گئی، ایک عرصے بعد کوئی ایسی مزے کی تحریر پڑھنے کو ملی، فرحت عمران اور سباس گل نے بھی تحریر کے ساتھ انصاف کیا۔

افسانوں میں کنول ریاض اور عمارہ امداد بہترین رہی، مستقل سلسلے بھی بہت خوب تھے، فوزیہ آپی پلیز ایک دن حنا کے ساتھ میں رمشا احمد، فرحت عمران، سباس گل، کنول ریاض سے ملوایئے۔

زویا اس محفل میں خوش آمدید مئی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے انشاء اللہ جلد پورا کریں گے شکریہ۔